ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۴ شمارہ: ۷

خصوصی شمارہ

اکیسویں صدی میں اردو ادب

شعبۂ اردو
ڈھاکہ یونیورسٹی ■ بنگلہ دیش

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۴ شمارہ: ۷

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

مدیر معاون

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربّانی

شعبۂ اردو

ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۴

شمارہ: ۷

سال اشاعت : ستمبر ۲۰۲۰

ناشر : رجسٹرار، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰، بنگلہ دیش

پریس : بیساکھی کریئشن، ۸۶ پرانہ پلٹن، ڈھاکہ

قیمت : ۱۰۰ ٹاکا (ایک ڈالر)

خط و کتابت کا پتہ : ایڈیٹر، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، ڈھاکہ، ۱۰۰۰

بنگلہ دیش

ای میل : du.urdujournal@gmail.com

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو

سال: ۲۰۱۴ شمارہ: ۷

سال اشاعت: ستمبر ۲۰۲۰

مدیر

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

مدیر معاون

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی

مجلس ادارت

پروفیسر ڈاکٹر ابو محمد دلاور حسین

ڈین، فیکلٹی آف آرٹس، ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالرشید

پروفیسر شمیم بانو

فہرست

۱۔ اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ

آسیہ یاسمین 07

۲۔اکیسویں صدی میں بنگلہ دیش کے اردو ادباء

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل 25

۳۔ نیا عالمی اُردو افسانہ

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری 35

۴۔ اکیسوی صدی میں بنگلہ دیش کے چند اردو شعراء

حسین البناء 59

۵۔ اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں موضوعاتی تنوع: ایک مطالعہ

تبسم حسن 71

۶۔اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی نئی فصلیں

ڈاکٹر تسلیم عارف 81

۷۔ ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب کی موجودہ صورت حال (اردو شاعری کے خصوصی حوالے سے)

توصیف احمد ڈار 89

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول: حیات اور کارنامے

ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں 108

۹۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب کے خدمت گزار: جلال عظیم آبادی
حفصہ اختر 118
۱۰۔ شاہ حکیم محمد اختر ؒ اور ان کی اصلاحی شاعری
ڈاکٹر رشید احمد 133
۱۱۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی اردو خدمات
ڈاکٹر محمد رضاء الکریم 146
۱۲۔ اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت: ایک تجزیاتی مطالعہ
سارہ بتول 155
۱۳۔ جرمنی میں اردو
سرور غزالی 170
۱۴۔ سید پور میں اردو ادب کی سرگرمیاں اور چند قلمکار
ڈاکٹر محمد سمیع الاسلام 179
۱۵۔ اردو زبان و ادب کے فروغ میں بالی وڈ کا کردار (فلمی نغمہ نگاروں کے خصوصی حوالے سے)
پروفیسر شمیم بانو 203
۱۶۔ اکیسویں صدی میں ہندستان کے اردو ناول۔ ایک تنقیدی مطالعہ
شہاب ظفر اعظمی 225
۱۷۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ کے حالات زندگی اور ادبی (اردو) کارناموں کا ایک مختصر جائزہ
پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید الاسلام 248
۱۸۔ نئی اردو تنقید کے موضوعات و مسائل
صفدر امام قادری 260

شمارہ : ۷

۱۹۔ اکیسویں صدی میں مغربی بنگال کا اردو افسانہ اور عصری مسائل

صوفیہ شیریں 271

۲۰۔ بنگلہ دیش میں اردو (ماضی اور حال کے آئینے میں)

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد 282

۲۱۔ ارمان شمسی اور ان کی افسانہ نگاری

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی 290

۲۲۔ اردو اور فارسی سے بنگلہ ترجمہ نگاری میں جاوید حسین کی خدمات

محمد غلام مولا 314

۲۳۔ عالم اسلام میں اردو کی بازگشت

پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد 325

۲۴۔ ڈھاکا اردو کا ایک مرکز

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام 343

۲۵۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب کے ایک شیدائی: لطیف احمد

پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیر الدین 349

☆ مقالات کو مصنفین کے نام کے حروف تہجی کی ترتیب سے مندرج کیا گیا ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین ناول نگاروں کے ناولوں کا تنقیدی تجزیہ

آسیہ یاسمین*

ادبی دنیا میں خواتین ناول نگاروں کی بات کی جائے تو اس میں انھیں ثانوی درجہ حاصل ہے۔اردو میں خواتین نے مردوں کے بعد لکھنا شروع کیا،لیکن ابتدائی صدی سے ہی اپنی موجودگی درج کرائی۔اولیت کا سہرا تو مرد حضرات کے ہی سر ہے،لیکن ہم ابتداء سے ہی دیکھتے ہیں کہ صنف ناول کو فروغ دینے اور مستحکم بنانے میں خواتین کا بھی کافی اہم رول رہا ہے۔اردو کے ابتدائی دور میں ہی خواتین نے ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا اور اس صنف پر طبع آزمائی کرتی رہیں۔قصہ گوئی کا عمل خواتین میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔قصے کہانیاں سنانا ان کا مشغلہ بھی ہے۔غالباً اسی وجہ سے انھیں ''ام القصص'' بھی کہا جاتا ہے۔شاید ان ہی خصوصیات کے نمایاں ہونے سے کہانی لکھنے کی طرف وہ راغب ہوئیں۔اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ''رشیدۃ النساء'' نے 1881ء میں ناول ''اصلاح النساء'' تحریر فرمایا،جو شائع ہو کر مقبول و عام ہو چکا ہے۔یعنی خواتین ناول نگار انیسویں صدی کی آخری دہائی میں نظر آنے لگی تھیں لیکن باقاعدہ طور پر بیسویں صدی کے آغاز سے وہ پوری طرح سے سرگرم ہوئیں اور اپنی سبک رفتاری سے ناول نگاری کے میدان میں مرد ناول نگاروں کے دوش بدوش کارہائے نمایاں انجام دینے لگیں۔

آج اکیسویں صدی میں بھی خواتین کا قلم زندہ و تابندہ ہیں۔کافی تعداد میں سرگرداں بھی ہیں۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ خانگی مسائل کو موضوع بنا رہی ہیں،جو زندگی کے شب و روز میں نمایاں ہیں۔ان میں زیادہ تر مسائل نسواں پر ہی مبنی ہیں۔جن کا اظہار وہ اپنی تحریروں میں کھل کر کرتی ہیں۔آج اکیسویں صدی میں جن ناول نگاروں نے تسلسل کے ساتھ قلم کو رواں رکھا ہے ان کی تعداد تو کافی ہے،لیکن

* مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،گچی باؤلی،حیدرآباد،بھارت

ان میں سے شہناز فاطمی، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، شائستہ فاخری، ثروت خان، افسانہ خاتون اور آشا پربھات کا ذکر درج ذیل ہے۔

(۱) شہناز فاطمی کا نام دنیائے فکشن میں محتاج تعارف نہیں۔ فکشن کی دنیا کا بے حد معتبر نام ہے۔ وہ گذشتہ تین دہائیوں سے فکشن کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ شہناز فاطمی اردو کے عظیم المرتبت شاعر شاد عظیم آبادی کے خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ ایک جہاں دیدہ فکشن نگار ہیں۔ انھوں نے خاص طور پر سماج میں خواتین کے حالات کا جائزہ بہت باریک بینی سے لیا ہے۔ ان کے تمام ناولوں کا موضوع سماج میں عورت کا استحصال ہے، لیکن ایک اہم خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس استحصال کو مختلف رنگوں میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ انہی میں سے ایک اہم ناول ''لمحوں کی کسک'' ہے۔

لمحوں کی کسک، ایک سماجی و معاشرتی ناول ہے۔ اس میں مصنفہ نے سماج و معاشرے کی ایک ایسی کمزوری کی طرف نشاندہی کی ہے، جس کے سبب کئی خاندان تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور تا حیات اس خاندان پہ یہ دھبہ قائم رہ جاتا ہے۔ جس کے سبب اس کی عزت و وقار میں بھی گہن لگ جاتا ہے۔

یہ ناول ایک خاندان کے دو گھروں پر مبنی ہے۔ پہلا حصہ اذیتوں و اضطرابیت سے مملو ہے، تو دوسرا حصہ رومانی خیز ہے، لیکن ناول کا انجام و اختتام کافی دردناک و کربناک ہے۔ مصنفہ نے دونوں حصوں کو اتنی چابکدستی اور ہنرمندی کے ساتھ مربوط کیا ہے، کہ قاری کی دلچسپی و تجسس بھی برقرار رہتی ہے۔ اس کا پلاٹ بھی کافی عمدہ ہے۔

یہ ناول دو سگی بہنوں ''چاند'' اور ''تارا'' کی زندگی پر مبنی ہے، کہ کس طرح ایک بہن نے بہن ہی کے گھر کو اجاڑ دیا۔ اس کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیا۔ رونقیں چھین لیں۔ اس کے گھر کو بے نور کر دیا۔ بہن کے گھر کو اجاڑ کر اپنے گھر کو بسالیا۔ یہ ناول خانگی مسائل پر مبنی ہے۔ اس کے علاوہ تعلیمی اہمیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کے مرکزی کردار چاند اور تارا ہیں جن کے اردگرد پورے ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ اس کے کردار فطری معلوم ہوتے ہیں۔ سبھی کردار کہانی کی مناسبت سے سامنے آتے ہیں، ہر کردار کی اپنی منفرد شناخت ہے۔ زبان و بیان و مکالمہ بھی کردار کی مناسبت سے ڈھالا گیا ہے، جو کہ کہانی اور موضوع کے عین

مطابق ہے۔ ناول تقریباً تمام فنی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ کہانی فطری انداز میں ارتقائی مراحل طئے کرتے ہوئے انجام تک پہنچ جاتی ہے اور قاری کے سر کا بوجھ نہیں بنتی۔

اس ناول میں مصنفہ نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ آج کی عوام یا سماج کے باشندے مذہب اور شریعت سے کتنے دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ جس کی سزا انھیں بھگتنی پڑتی ہے۔ اس میں جب چاند کی بہن تارا اپنے بہنوئی سے نکاح کر لیتی ہے تو بہن کا گھر اور زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہاں پہ سب سے بڑی غلطی چاند کے والدین کی ہے کہ وہ تارا کو اس طرح پیش آنے کیوں دیتے تھے؟ جس کی شریعت و مذہب میں سخت ممانعت ہے۔ جس کا اپنا ایک دائرہ ہے۔ وہیں دوسری طرف ساجد اور ترنم کی خوشحال زندگی میں بھی دراڑ آجاتی ہے۔ حالانکہ ترنم بے قصور ہوتی ہے، لیکن اسے اپنی ماں کے کیے غلطی کی سزا اسے بھگتنی پڑتی ہے، جس کی طرف روشنی ڈالنا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ کتنے خاندان تباہی و بربادی کے سمندر میں غرق ہو سکتے ہیں۔

شہناز فاطمی کا یہ ایک سماجی ناول ہے۔ جس کا موضوع انھوں نے سماج سے ہی اخذ کیا ہے۔ اس ناول کے ذریعہ انھوں نے عوام تک ایک پیغام پہنچانا چاہا۔ جس میں وہ حتی الامکان کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ عبدالصمد لکھتے ہیں کہ:

> ''ناول کی ایک بڑی خصوصیت اسے قاری سے پڑھوا لینے کی صلاحیت ہے جس کا آج بے حد فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کی دنیا بہت وسیع ہوتے ہوئے بھی چند ہی ناول ایسے ہیں جن پر نگاہیں پڑ جاتی ہیں۔ فاطمی کا ناول بھی ان چند ناولوں میں شامل ہے'' 1

(۲) ترنم ریاض عصر حاضر کے اردو فکشن میں ایک معروف اور معتبر نام ہے۔ ترنم ریاض ادبی دنیا میں افسانہ نگار، ناول نگار، شاعرہ، مترجم اور محقق کی حیثیت سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہیں۔

''مورتی'' ان کا پہلا ناول ہے، جس کی سن اشاعت ۲۰۰۴ء ہے۔ یہ ایک مختصر سا ناول ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے ایک عورت کے درد، کسک اور گھٹن کو دکھانے کی کوشش کی ہے، کہ وہ اپنی زندگی کس طرح

گھٹ گھٹ کے جیتی اور اس کے فن کی ناقدری کی وجہ سے اس میں ایک کسک پیدا ہو جاتی ہے۔ مورتی جو اس ناول کا عنوان ہے جو آخر میں ٹوٹ جاتی ہے۔ دراصل اسے زندگی کا استعارہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔

ترنم ریاض نے ناول مورتی میں نسائی اور تانیثیت کو ملحوظ خاطر رکھ کر لکھا ہے۔ پورا ناول تانیثیت کی فکری اساس کے اردگرد ہی گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ مرد اساس سماج و معاشرے میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ دکھایا ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات میں بیوی کی خواہشات کا نہ خیال کرنا اور ان کے ذریعے کیے گئے کاموں کو حقیر نظر سے دیکھنا مرد اساس سماج و معاشرے کے لیے ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ جس کو اس ناول کا موضوع بھی بنایا گیا ہے۔

ناول میں بیانیہ اور فلیش بیک کی تکنیک کو اپنایا گیا ہے۔ کردار بھی موضوع کی مناسبت سے ہی ڈھالے گئے ہیں۔ زبان و بیان سادہ، سہل، عام بول چال اور کردار کی مناسبت سے ہیں جو کہ بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار ملیحہ ہے، جس کے اردگرد پورا ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے اور ضمنی کردار بھی ہیں جو کہانی کے ارتقاء کے ساتھ وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ ناول ایک ایسی عورت کی درد بھری داستان ہے۔ جس کو اپنی زندگی آزادی کے ساتھ جینے کا حق نہیں ملتا ہے۔ ملیحہ ایک بہت اچھی فنکارہ ہوتی ہے۔ ماہر سنگ تراش رہتی ہے۔ اس فن میں اسے خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے جذبات و احساسات اور ذہنی صلاحیتوں کا اظہار مجسمہ سازی سے کرتی ہے لیکن صد! افسوس کہ اس کی شادی ایک ایسے مرد (اکبر علی) سے ہو جاتی ہے جو اس کے فن کی ناقدری کرتا ہے۔ اس ناقدری کے پیچھے بھی کوئی وجہ ہوتی ہے جس کے تحت وہ مجبور ہوتا ہے۔ اکبر علی ایک تاجر رہتا ہے لیکن نہایت ہی بے حس قسم کا انسان ہوتا ہے۔ اس کو اس بات کا خدشہ لگا ہوتا ہے کہ کہیں وہ ترقی کر کے مجھ سے آگے نہ بڑھ جائے۔ اکبر علی کو یہ خدشہ ملیحہ کی ترقی کا نہیں بلکہ سماج کی ہیبت طاری رہتی ہے کہ سماج اسے کیا کہے گا۔ اس پر کیا لعنت بھیجے گا۔ اسے کن نظروں سے دیکھے گا۔ ملیحہ کی کامیابی اکبر علی کی عزت و وقار کو ٹھیس پہنچائے گی۔ یہاں پہ دراصل اکبر علی ذاتی طور پہ اس کے فن کا ناقد نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ وہ سماج و معاشرہ کے خوف سے ملیحہ کی مجسمہ سازی کی ناقدری کرتا ہے۔ چاہتا ہے۔

ملیحہ پھر بھی خوشگوار زندگی گزارتی ہے۔صرف اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے فن کی قدر کی جائے لیکن اس کی خواہش کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔اسی آرزو میں پاگل ہو جاتی ہے۔آخر میں فیصل نام کا ایک کردار سامنے آتا ہے۔فیصل ایک فن شناس شخص رہتا ہے۔وہ ملیحہ کے شاہکار فن پارے کا قدر دان ہوتا ہے۔وہ اسے بہت آگے بڑھانا چاہتا ہے۔ملیحہ کی زندگی سے جڑی جو بھی خواہش ہوتی ہے، وہ اس کا عکس اپنے فن میں ڈھالتی ہے۔فاختہ کے پر کا ٹوٹنا، ایک بچے کا ماں کی گود سے الگ ہوتا ہوا مجسمہ، جو اسکی زندگی کا آخری فن پارہ تھا اور اس کی زندگی کا آخری مقصد بھی۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آدھے ٹوٹے پنکھ والی فاختہ کا مجسمہ....بچے کا مجسمہ جو ماں کے پہلو سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔وہ اسے ماں کے مجسمہ سے لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔پتھروں کی طرح زمین پر پھینکے جانے سے کئی مجسمے کہیں کہیں سے ٹوٹ گئے تھے بچے کا مڑا ہوا گھٹنا بھی، جس کے سہارے بچے کا توازن برقرار رہتا تھا، ٹوٹ گیا تھا۔
>
> ''یہ...یہ...دیکھو..فیصل..فیصل...'' وہ ہانپتے ہوئے بولی..سب مر گئے اس نے ہاتھ سے ماں اور بچے کے مجسے کی طرف اشارہ کیا۔
>
> یہ..دیکھو..یہ..یہ ماں کے پاس بیٹھتا ہی نہیں..اس نے بچے کے سر پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔
>
> اس کا گھٹنا ٹوٹ گیا۔اس نے فیصل کے چہرے کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں جانے کب کے آنسو امڈ آئے۔
>
> ''اب..کیا..کیا..ہوگا..اس نے دونوں ہاتھ فیصل کے شانوں پر رکھ دیا اور بلک بلک کر رو پڑی۔
>
> اب کچھ نہیں ہو سکتا..فیصل..سب مر چکے..اس نے ہچکیاں لے کر کہا اور بے ہوش ہو گئی۔[۲]

اس میں مصنفہ نے ایک پرٹوٹی ہوئی فاختہ کا مجسمہ یا ایک عورت اور بچہ کا الگ ہوتا ہوا مجسمہ کو زندگی کا استعارہ بنایا ہے۔ جس کے بغیر دونوں کا وجود ہی نہیں۔ ناول کے اختتام پہ ملیحہ اپنے فن کی ناقابل برداشت ناقدری کی وجہ سے ذہنی توازن کھو دیتی ہے۔ فیصل جب اسکو پاگل خانے لے جانے کی باتیں سنتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ مجسموں کی نمائش سے ٹھیک ہوسکتی ہے لیکن اکبر علی قبول نہیں کرتا ہے۔ اکبر علی کا ملیحہ کے ساتھ اس طرح کا سلوک اور برتاؤ کرنے کی وجہ سماج و معاشرہ کے طنز سے نجات پانا ہے۔ اپنی عزت و وقار کو قائم رکھنا ہے۔

یہ ناول زندگی نما پتھر کے درمیان پستے ہوئے کردار کی ایسی کہانی ہے۔ جو عملی زندگی کے نشیب و فراز کے درد سے لبریز داستان بن گئی۔ یہ ناول عورت کے اجتماعی لاشعور سے گہرا رشتہ قائم کرتا ہے۔ ایک عورت کی زندگی میں پیش آنے والے درد، کسک اور گھٹن کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور حقیقی دنیا میں پیش آنے والے واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے سماج کی اس طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کی بھی ایک اہمیت اور معنویت ہے۔

(۳) خواتین ناول نگاروں میں ایک اہم نام صادقہ نواب سحر کا بھی ہے۔ جس سے اردو دنیا ناواقف نہیں۔ وہ ایک ہمہ اصناف فنکارہ ہیں۔ صادقہ نواب سحر نے جب سے تخلیقی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ تب سے ان کا نام چرچے کا باعث رہا ہے۔ ان کی تحریروں میں عصری مسائل اور رجحانات دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ بہ یک وقت تمام اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتی ہیں۔ ان کی متعدد تصانیف عوام النظر ہو چکی ہیں۔ ان ہی میں سے ایک ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' بھی ہے۔

کہانی کوئی سناؤ متاشا، یہ ان کا پہلا ناول ہے۔ ان کا یہ ناول سن ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا اور فکشن کی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ یہ ایک سوانحی تکنیک میں لکھا گیا ناول ہے۔ یہ ناول ایک عورت کی داستان حیات ہے۔ جس کا نام متاشا ہے اور یہی اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے۔ جس کی ساری زندگی عبرتناک واقعات سے لبریز ہے۔ وہ تاعمر کسی نہ کسی کی ہوس کی شکار رہتی ہے۔

ناول چھوٹے چھوٹے عناوین کے تحت کئی حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں وقت اور حالات کی

مناسبت سے فطری کردار کو پیش کیا گیا ہے جو کہانی اور موضوع پر کھرا اترتا ہے۔ زبان و بیان و اسلوب بالکل سادہ و سلیس ہے۔ عام فہم زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ جو قاری کی روانی اور تجسس کو برقرار رکھ سکے۔ ایک کامیاب ناول کی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ قاری کو پیچیدگی اور اکتاہٹ میں مبتلا نہ ہونے دے۔

ناول کوئی اچھوت اور منفرد موضوع پر مبنی تو نہیں ہے لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ انداز تحریر و پیش کش نے نادر و نایاب بنا دیا ہے۔ اتنی تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ وہ قاری کے ذہن پر تا دیر قائم رہتا اور ایک اثر چھوڑ جاتا ہے۔

متاشا اس ناول کی مرکزی کردار ہے۔ جس کے ارد گرد کہانی بنتی گئی ہے۔ دراصل یہ ناول متاشا کی داستان حیات ہے۔ جس میں اس کے بچپن سے لے کر طویل عمر تک کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ متاشا کے بکھرے خوابوں کی کہانی ہے۔ متاشا کی زندگی کا ہر حصہ کبھی نہ بھولنے والی ایک دردناک کہانی بن جاتا ہے۔ یہ صرف متاشا ہی نہیں بلکہ ہر اس لڑکی کی کہانی ہے جو اس طرح کے مسائل سے دو چار ہو رہی ہے۔ متاشا پیدائش کے دن سے ہی ناپسند کی جاتی ہے۔ اس کا باپ اس سے اتنی نفرت کرتا ہے کہ پیدائش کے تین مہینہ بعد اس کی شکل دیکھتا ہے۔ گھر کے سبھی افراد اس کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ اس کو کسی سے پیار نہیں ملتا ہے۔ پھر وہ جھوٹ کا سہارا لینا شروع کر دیتی ہے۔ جس سے اس کی جان بچتی ہے۔ اس کی زندگی میں کتنے افراد کی شمولیت ہوئی لیکن سب نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ اس کے والد کا دوست موریشور کاکا اور اس کے چاچا نے بھی زیادتی کی لیکن وہ خاموش رہ گئی۔ معاشرے کے ڈر سے وہ اس کا اظہار نہیں کر پاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ جب اس کے گھر والے ہی قبول نہیں کرتے تو سماج و معاشرہ اس کی آواز کو کیسے قبول کر لیتے۔

متاشا کے توسط سے بہت سارے ضمنی کردار بھی سامنے آتا ہے۔ جو کہانی کو طول دینے اور مکمل کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک گوتم بھی ہے۔ گوتم جس سے وہ ممبئی جا کر شادی کر لیتی ہے گوتم پانچ بچوں کا باپ ہوتا ہے۔ چار تو متاشا کو ماں کا درجہ دیتے ہیں لیکن سب سے بڑا بیٹا انکت ہمیشہ اسے بری نظر سے گھورتا ہے۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا ہے کہ وہ اس کی ماں ہے۔ وہ بھی اس کے

ساتھ بدسلوکی کرنا چاہتا ہے۔اس کردار کے تحت مصنفہ نے سماجی ونفسیاتی مسائل سے عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

اس بات سے ہم اچھی طرح واقف ہیں کہ سماج ومعاشرے میں عورت کو ہمیشہ حاشیہ پر رکھا گیا ہے اور اس کے ساتھ عدل وانصاف سے کام لینے کے بجائے ہمیشہ نا انصافی اور ظلم کا ہی رویہ اختیار کیا گیا۔شرم آتی ہے سماج کے ایسے افراد پر کہ جس کو خدا نے اعلی مقام عطا کیا وہ انہیں پستی کی طرف ڈھکیلنے کی تگ ودو میں لگے رہتے ہیں۔

اس کے علاوہ تخلیق کار نے بہت ساری ایسی برائیوں کی طرف بھی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے، جو آج پوری تیز رفتاری کے ساتھ سماج ومعاشرے میں پنپ رہی ہیں۔جس میں سماج کے کئی طبقے اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔یعنی شادی سے قبل حاملہ ہونا، اسقاط حمل کرانا، یہ دور حاضر میں ایک عام سی بات ہوگئی ہے اس ناول میں ایک ہندوستانی عورت کی جدوجہد کی کہانی بیان کی گئی ہے۔آج بھی کس طرح ایک متوسط عورت کو ہندوستانی سماج میں ظلم وجبر کا سامنا کر کے جینا پڑتا ہے۔مصنفہ اس ناول کے ذریعہ یہ پیغام دینا چاہتی ہے کہ عورت کو اپنے حق کے لئے آواز اٹھانی چاہیے اور برے وقت وحالات میں لڑنے کے بجائے اس سے مقابلہ کر کے زندگی گزارنی چاہیے۔ورنہ اس کی زندگی بھی متاشا کی طرح ٹوٹ کر بکھر سکتی ہے۔اپنے حق کے لیے دب کر سمٹ جانا سب سے بڑی حماقت ہے۔اس سلسلے میں محمود ایوبی لکھتے ہیں کہ:

> ''زندگی سے باہر یا ذات کے اندر کی بات کو نہیں بلکہ عام لوگوں خاص کر درمیانہ طبقہ کے لوگوں کی زندگی کے نشیب وفراز کو بڑی سادگی اور ہمدردی سے بیان کیا گیا ہے۔مرکزی کردار متاشا کے اندر نسوانی دردمندی بھی ہے اور سختیوں سے الجھنے کا حوصلہ بھی ہے۔اس لئے بچپن سے لے کر زندگی کے آخری مرحلہ تک وہ اپنے پرایوں سے حسن سلوک سے پیش آتی ہے مگر بدلے میں اسے بدسلوکیاں جھیلنی پڑتی ہیں۔مگر پھر بھی اپنے مزاج کے خلاف کچھ کرتی ہے اور نہ حوصلہ ہارتی ہے'' 3

جن کو قدرت نے ایک عظیم ہستی کا درجہ دیا ہے، قدموں کے نیچے جنت کی بشارت دی ہے، یہ صدیوں سے چلا آرہا ہے کہ سماج و معاشرے کے اکثر و بیشتر باشندے اس لڑکی کی پیدائش پر خوشی منانے کے بجائے ماتم منانے لگتے ہیں۔ جیسا کے اس ناول میں متاشا کی پیدائش کے وقت بھی ہوتا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول کے ذریعہ سماج کو ایک سبق دینا چاہا ہے۔ اس کا مقصد سماج کے اس ناسور حرکت کی طرف توجہ مبذول کرانا ہے۔

(۴) شائستہ فاخری عصر حاضر کی ایک معروف اور معتبر فکشن نگار ہیں جنہوں نے اپنی تحریر کو ادب کی ہر صنف پر نقش کیا ہے۔ شائستہ فاخری کا افسانوی ادب میں ایک شاہکار ناول 'نادیدہ بہاروں کے نشاں' ہے۔ ناول کی سن اشاعت ۲۰۱۳ء ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں حلالہ کو موضوع بنایا ہے۔ ان کی بیشتر توجہ اور اشارہ حلالہ کی طرف تھا لیکن اس ناول کو پڑھتے ہوئے ذہن بہت سارے ایسے مسائل کی طرف بھی گامزن ہوتا ہے جو آئے دن سماج اور معاشرہ میں رونما ہو رہے ہیں۔

''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' ایک ایسا ناول ہے جس میں علیزہ نام کے کردار کو پیش کر کے نہ صرف علیزہ کی بے بسی، مظلومی، زیادتیاں اور استحصال کو دکھایا گیا ہے بلکہ عورت ذات کی بے بسی اور اس پر جابرانہ ظلم و زیادتی کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس میں مرد کی انانیت، حماقت اور خود غرضی کی بھینٹ چڑھتی ہوئی عورت کی تصویر کشی کی ہے۔ علیزہ کے شوہر فرحان مرزا کی حماقت اور جلد بازی میں لیے گئے فیصلہ کا پچھتاوا بھی دکھایا گیا ہے۔ بلکہ مذہبیت اور وقت کی تیز رفتار تبدیلی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ احساس اور احساس جرم کی نہایت عمدہ عکاسی بھی کی گئی۔ جیسا کہ فرحان مرزا جب اپنے والد کی وفات کے بعد اپنی ماں کے یہاں سے اپنے گھر لکھنو واپس جاتا ہے تو وہاں اس کا بھائی اعیان مرزا (جس کو وہ تاحیات غیر مسلم کا خون کہتا ہے) کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ اس کی بیوی علیزہ اس کی خدمت کرتی رہتی ہے۔ اچانک سے فرحان مرزا گھر پہنچتا ہے تو وہ علیزہ کو اعیان کے پاس کھڑا دیکھ کر چراغ پا ہو جاتا ہے۔ پھر شک اور وہم کی دنیا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہاں سے اس پر مسرت زندگی میں تلخیاں اور دراڑ آنی شروع ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ علیزہ یا اعیان میں کوئی ایسی بات نہیں تھی دونوں ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے

تھے۔فرحان مرزا کی چھوٹی سی تشکیک نے اس کی زندگی کو جہنم بنادیا، وہیں علیزہ کی زندگی داؤ پر لگی تھی فرحان جب طلاق دے دیتا ہے تو اسے جلد بازی میں لیے گئے اپنے فیصلہ پر بہت پچھتاوا ہوتا ہے۔فرحان کو اپنے احساس اور علیزہ کو دوبارہ سے پانے کے لئے اور اپنے مذہب اور مرزا گھرانے کی عزت کو بچانے کے لئے اپنے بھائی اعیان سے زبردستی نکاح کرواتا ہے۔صرف اس لیے کہ دوبارہ اس سے نکاح کر سکے۔یہ مرد بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں مرد کیا مرد اساس سماج و معاشرہ ہی اس طرح کی گھٹیا اور گھناونی حرکتوں میں ملوث ہے، جس میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

جب اس طرح کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔تو صرف اور صرف انہیں اپنی عزت اپنا خاندان ہی دکھائی دیتا ہے۔وہ ایک عورت کو صرف ایک کھلونا بنادیتے ہیں۔جس کی زندگی بے وجہ کے جرم میں تباہ و برباد ہوجاتی ہے۔اسے صرف کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مت بھولو اعیان کہ ہم لوگوں نے اپنے والدین کو بھی اندھیرے میں رکھا ہے صرف ایک مقصد کے تحت۔جو کچھ ہوا وہ تو شرم ناک ہے ہی مگر عزت کی خاطر پردہ ضروری تھی۔میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ہمارا جو منصوبہ ہے وہ جلد سے جلد تکمیل پاسکے۔کمرے میں جاؤ، مزید وقت ضائع مت کرو'' 4

درج بالا اقتباس کو پڑھ کر ہی لگنے لگتا ہے کہ انسان لیکن یہاں پہ انسان نہ بول کر مرد بولنا زیادہ درست ہے، کہ کس طرح فرحان مرزا نے ایک باعزت بیوی کی عزت کی پرواہ کیے بغیر اپنے بھائی کے ساتھ زبردستی کرواتا ہے اسے اکساتا ہے۔یہاں پہ صرف اور صرف اسے مرزا گھرانے کی عزت کی فکر ہوتی ہے۔ناول میں ڈاکٹر تانیہ کا بھی ایک اہم کردار ہے۔جس نے عورت کی اہمیت برقرار رکھنے میں اور عورت کو آزادانہ زندگی گزارنے اور مردوں کے وہم کہ عورت کی زندگی مرد کے بغیر ادھوری ہے اس خوش فہمی کو دور کیا ہے۔جیسا کہ اس ناول کے اختتام پر علیزہ ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ ایک پیاری سی بیٹی علینا کو جنم دیتی ہے اور اس کے اندر ایک مکمل عورت ہونے کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔عورت اپنے وجود سے ایک وجود گڑھنے کے بعد ہی ایک مکمل عورت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔جو کہ علیزہ کو حاصل ہوجاتا ہے۔وہ ایک آزادانہ اور پر

لطف زندگی گزارنے لگتی ہے۔فرحان مرزا ایک عورت کی زندگی کو جہنم بناتا ہے لیکن اختتام میں اس کی زندگی ہی نامکمل ہو جاتی ہے۔اس کی زندگی میں اندیکھی باتوں پر کیے گئے فیصلے کا نشان تاحیات باقی رہ جاتا ہے جیسا کہ مصنفہ نے اس ناول کا عنوان ہی نادیدہ بہاروں کے نشاں رکھا ہے۔یہ ناول نہ صرف عورت کی مظلومی اور بے بسی پر مشتمل ہے بلکہ ترقیاتی دور کو ملحوظ خاطر رکھ کر دیکھا جائے تو ایسا لگتا ہے کہ عورتوں کی ہی نہیں بلکہ مردوں کی بے بسی ہے۔جس کا ذمہ دار وہ خود ہی ہے۔

(۵) عصر حاضر کی ایک معروف ناول نگار ثروت خان بھی ہے۔جن کا تعلق راجستھان سے ہے جن کی شہرت ناول ''اندھیرا پگ'' کی وجہ سے خاص وعام میں قائم ہو چکی ہے۔اس قدر کامیاب ناول ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیت کا لوہا منوا چکا ہے۔یہ ناول ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔اس کا موضوع ایک بیوہ عورت کی زندگی پر مبنی ہے۔جس میں راجستھانی ثقافت کے تناظر میں ایک بیوہ کی المناک داستان ظاہر ہوتی ہے۔ہندوستانی سماج میں بیوہ کے ساتھ ہونے والے ظلم وستم کی دردناک داستان کو مصنفہ نے بیان کیا ہے۔ناول کا مرکزی کردار روپی بچپن سے ہی تیز طرار اور ذہین لڑکی ہوتی ہے۔اس کی شادی اس وقت کر دی جاتی ہے جب اس کے لڑکپن کے ایام ہوتے ہیں۔پڑھائی کی خواہش ادھوری رہ جاتی ہے۔ابھی وہ شادی کی خوشیوں کو پوری طرح سے گزار بھی نہیں پاتی ہے کہ اس کا شوہر ابدی نیند کے آغوش میں چلا جاتا ہے۔روپی صرف ۱۷۔۱۶ سال کی عمر میں بیوہ ہو جاتی ہے۔ناول میں کوئی نیا موضوع تو نہیں برتا گیا لیکن مصنفہ نے کسی خاص علاقہ کی تہذیب وثقافت کو سامنے رکھ کر کہانی کو تحریر کیا ہے۔مصنفہ نے اماوس کی رات کو ایک بیوہ عورت کے تعلق سے کی جانے والی رسم ورواج کو مرکز بنایا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ وہاں کی تہذیب وتمدن، رسم ورواج اور اصول وقواعد کی بھی فن کاری اور ہنرمندی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے۔جس کی وجہ سے ہمیں وہاں کی تہذیب، کلچر اور نظام دیکھنے کو ملتا ہے۔وہ نظام اور کلچر اس ناول کو معتبر اور منفرد بناتا ہے۔اس ناول میں راجستھانی پروہتوں اور پنڈتوں کی معاشرت، سماجی زندگی، رسم ورواج اور مذہب کے آڑ میں رونما ہو رہے عورتوں کے استحصال کو دکھایا گیا ہے۔کہ کس طرح ایک کمسن لڑکی کے شوہر کی وفات کے بعد اس کی زندگی کو موت سے زیادہ دردناک اور ہیبت ناک بنا دیتے ہیں۔

اندھیرا پگ میں راجستھان کے ایک ہندو ٹھاکر خاندان کی روایتی زندگی سامنے آتی ہے لیکن مصنفہ نے موضوع کی مناسبت سے ایک پورا تہذیبی معاشرہ خلق کر کے کچھ منفرد اور اچھوتا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول گاؤں دیہات کی عورتوں کے متعلق رسم و رواج بنانے والے مردوں کی تنگ نظری کا بیان ہے۔ دوسری طرف عورت کے جبر و ظلم سے نجات کی راہ تلاش کرنے کی کوشش بھی ہے۔ روپی کو بھری جوانی سے ہی بیوگی کے زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ سماج کے بنائے ہوئے بے جا رسوم کے مطابق اسے مصیبتوں میں ڈالا جاتا ہے جن کو وہ برداشت کرتی ہے اور تھوڑی دھیمی آواز میں کبھی کبھی مخالفت بھی کرتی ہے۔ لیکن جب سسرال والوں کے ساتھ میکے والے بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں تو اس کا دل پوری طرح سے ٹوٹ جاتا ہے۔ یہاں پہ سسرال اور میکے کی بات نہیں ہے بلکہ سماج کے اصول وضوابط کی ہے۔ روپی کے گھر والے سماج میں بنائے گئے اصولوں سے ڈرتے ہیں کہ اگر وہ ان کے اصولوں کی پیروی نہیں کرینگے تو سماج سے خارج کر دیے جائے گے۔

روپی اس طرح کے رسم و رواج سے آزاد ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ آدھی رات میں ہی گھر سے نکل جاتی ہے اور لوگوں کے روکنے پر کہتی ہے کہ نہیں چاہیے مجھے کسی کا بھی ساتھ۔ آپ سب اندھیروں کے واسی ہو اور وہ پورنیما کے چمکتے چاند کی روشنی میں گھر سے نکل جاتی ہے۔ اس ناول کے اختتام کے بعد ایسا لگتا ہے کہ روپی اتنا اپنے شوہر کی وفات سے نہیں گھٹتی ہے جتنا کہ قدیم رسم و رواج سے۔ وہ اسے ترک کرنا چاہتی ہے اور کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔ اس کا نام میڈیکل کے رزلٹ میں پانچویں نمبر پر آتا ہے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ناول میں بیوہ کا درد تانیثی بغاوت میں بدل جاتا ہے۔ اس ناول میں تانیثی فکر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ناول میں بیوہ کے مسائل کو پیش کر کے قدیم و جدید لوگوں کے افکار و خیالات کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اندھیرا پگ مجموعی اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے۔ زبان و بیان، کردار نگاری، پلاٹ وغیرہ عمدگی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ کہانی میں کہیں بھی بے ربطگی کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ قاری کے ذہن میں ایک تجسس قائم رہتا ہے جو اسے کہانی کے اختتام تک جوڑے رکھتا ہے۔ یہی ایک کامیاب اور مقبول ناول کی شناخت بھی ہے۔

(۶) ''دھند میں کھوئی روشنی'' کی تخلیق کار اردو کے معروف ناول نگار عبدالصمد کی اہلیہ افسانہ خاتون ہیں ۔دھند میں کھوئی روشنی، ان کا پہلا ناول ہے۔جس کی سن اشاعت ۲۰۰۹ء ہے۔اس میں مصنفہ نے عام سے سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔کسی بھی ناول کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے لیکن اس ایک موضوع کے تحت کئی سارے موضوعات اور مسائل سامنے آتے ہیں جیسا کہ اس ناول میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

ناول کی کہانی تو یہ ہے کہ شالینی جو اس ناول کا مرکزی کردار بھی ہے۔اس کے والد اسے جلد از جلد رشتہ ازدواج سے منسلک کر دینا چاہتے ہیں۔اور ایک بہت بڑے بزنس مین (سنتوش) سے شادی کر دیتے ہیں ۔بس یہی کہانی کا خلاصہ ہے لیکن اس مختصر سی کہانی میں کئی سارے مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔جس کو مصنفہ نے پوری دانشمندی اور ہنرمندی کے ساتھ فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے جس کے سبب ایک کامیاب ناول کی فہرست میں اپنا مقام بنالیتا ہے۔ایک ناول کی کامیابی تخلیق کار کی بھی کامیابی ہوتی ہے۔

شالینی بلا کی ذہین ہوتی ہے وہ اعلی تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے والد (امرناتھ) اس کو اعلی تعلیم نہیں دلانا چاہتے ہیں۔وہ صرف اس لیے اعلی تعلیم کے خلاف رہتے ہیں کہ سماج اسے برا بھلا کہے گا۔ان کے من میں کہیں نہ کہیں یہ خوف بھی پوشیدہ رہتا ہے کہ بیٹیوں کو اعلی تعلیم دلانے کے بعد اس کے رشتے نہیں آتے ہیں۔لوگ تعلیم کی بنیاد پر لڑکیوں کی عمر کا اندازہ لگاتے ہیں۔جس وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لڑکیاں اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی تمام عمر اپنے باپ کے گھروں میں ہی گزار دیتی ہیں۔جو کہ والدین کے لئے بہت ہی مشکل ہوتا ہے اور انھیں ذہنی اذیتوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔مصنفہ نے اس طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز میں تبدیلی رونما ہو رہی ہے لیکن آج بھی سماج و معاشرہ کے لوگوں کی سوچ وفکر پست ،تنگ و تاریک دنیا تک ہی محدود ہے۔آج بھی ان کی سوچ وفکر میں وہی جمود طاری ہے جو کہ کم علمی کے دور میں ہوا کرتا تھا۔آج سماج کو اس سوچ اور فکر سے نکلنے کی سخت ضرورت ہے۔دوسری طرف انسانی محبت کی اہمیت اور مفہوم کی طرف توجہ دی ہے۔

شالینی جب تعلیم حاصل کرتی رہتی ہے تو اپنے بھائی کے دوست سمیر سے ٹیوشن پڑھتی ہے۔ دونوں کی آپس میں بہت اچھی دوستی اور محبت ہوتی ہے۔ شالینی ہر فیصلہ سمیر کے تحت لینا چاہتی ہے۔ شالینی کے رشتے کی بات جب سنتوش سے ہوتی ہے تو وہ اس وقت بھی اس کا فیصلہ لینا چاہتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ سمیر شالینی سے بے انتہا محبت کرتا ہے اس پہ شاعری کرتا نظمیں لکھتا لیکن اظہار کی صلاحیت اس میں موجود نہیں تھی۔ اس کی محبت میں اپنی زندگی کو ویران کر دیتا ہے۔ ادھر شالینی بھی سنتوش کی بیوی ہونے کے باوجود ہر وقت اسی کی یاد میں کھوئی رہتی ہے سنتوش کی محبت سے محروم رہتی ہے۔ سنتوش حد درجہ اپنے بزنس میں مصروف رہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''سنتوش کے علاوہ اس نے کسی اور مرد کو اس قدر نزدیک سے نہیں دیکھا تھا۔ سمیر کو کچھ کچھ دیکھا تھا لیکن وہ اس سے یوں بچ بچ کے نکل جاتا کہ اسے دیکھنے کا حوصلہ ہی اس کے اندر دم توڑ دیتا۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ سنتوش میں اسے ایک نامعلوم سی کمی محسوس ہوتی اور کمی کے سبب جو جگہ خالی ہوتی وہاں سمیر نظر آتا سنتوش کی اس کمی کو وہ طرح طرح کے معنی پہناتی۔
>
> سنتوش کی تاجرانہ مصروفیت
>
> سنتوش کی ذاتی مصروفیت
>
> اس کے دن، اس کے رات
>
> اس کا اپنا انداز '' 5

شالینی ایک محبت بھری زندگی گزارنا چاہتی ہے جو حاصل نہیں ہوتی ہے۔ دنیا میں دولت سے زیادہ خلوص اور محبت کی اہمیت وضرورت ہے لیکن آج لوگ دولت کے مجنوں بنے ہیں۔ سمیر شالینی کی محبت میں سادھوؤں کی زندگی اختیار کر لیتا ہے اور ایک خاموش پیغام شالینی تک پہنچا دیتا ہے۔ سمیر اسے سمجھاتا ہے کہ ہر محبت کا ایک مقام ہوتا ہے لیکن شالینی اسے ایک مقام دینا چاہتی ہے جو کسی اور کو دے چکی ہوتی ہے۔

(۷) معاصر فکشن نگاروں میں ایک اہم نام آشا پربھات کا بھی ہے۔ آشا پربھات اردو اور

ہندی دونوں زبانوں میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرتی ہے۔ان کی متعدد تصانیف دونوں زبانوں میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ان میں سے ایک ناول ''جانے کتنے موڑ'' بھی ہے۔اس ناول کے حوالے سے کوثر مظہری لکھتے ہیں کہ:

''اس ناول میں ایک جینوئن احتجاج ہے جو اس بات کا اشاریہ ہے کہ عورت بھی آخر خدا کی مخلوق ہے اور اسے بھی اپنی طرح جینے کا حق حاصل ہے'' 6

جانے کتنے موڑ آشا پربھات کا ایک ایسا ناول ہے جس میں سماج کے اشراف طبقہ کے خود ساختہ اصولوں کی چکی میں پس رہی ایک غریب عورت کی کہانی ہے۔اس کا مرکزی کردار لتا ہے۔آشا پربھات غیر مسلم ہے اس لئے ان کی کہانیوں میں کرداروں کے نام بھی غیر مسلم ہی ہوتے ہیں۔لتا کے ارد گرد پورے ناول کا تانا بانا بنا گیا ہے۔لتا اپنے والدین کی سب سے پہلی اولاد ہوتی ہے۔مصنفہ نے اس ناول کا عنوان 'جانے کتنے موڑ' رکھا ہے جس کے تحت سماج کے پیش نظر ایک لڑکی کی زندگی کے کتنے موڑ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

لتا کی پیدائش کے وقت سے ہی اس کی دادی بہو کو طرح طرح سے کوستی ہے۔لتا کی اور تین بہنیں رہتی ہیں۔پوتا کی خواہش میں پوتیوں کو بری نظر سے دیکھتی ہے۔لتا کا گھرانہ مالی طور پر کمزور تھا۔اس ناول میں ادیبہ نے سماج کے ایک ایسے مسائل کو موضوع بنایا ہے جس میں ایک لڑکی کی کوئی وقعت واہمیت ہی نہیں ہے۔اس کی زندگی بس دوسروں کو خوش کرنے اور خوش دیکھنے تک ہی محدود ہے۔لتا کا گھرانہ مالی اعتبار سے کمزور ہوتا ہے۔لتا کے والد اونچی حویلی اور پانچ بیگھہ زمین کے عوض اپنی بیٹی کی شادی ایک اپاہج سے کر دیتے ہیں۔اس بناء پر کہ میری بیٹی ایک خوشحال زندگی گزارے گی اور اونچی حویلی والے اس لئے شادی کرتے ہیں کہ ان کی حویلی کی شان وشوکت، عزت وحشمت اور جاہ وجلال باقی رہے۔اس حویلی کے چراغ روشن رکھنے کے لئے لتا کے ساتھ اتنی گھٹیا اور گھناؤنی حرکت کرواتے ہیں جس کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔اس وقت سماج ومعاشرہ نادیدہ ہوجاتا ہے اور اس پر پردہ پوشی کرتا ہے۔کیونکہ اس وقت حویلی اور اعلی گھرانے کی بات ہوتی ہے۔اس وقت نہ انہیں تہذیب ومعاشرہ نہ رسم ورواج اور نہ ہی اصول وضوابط دکھائی دیتے

ہیں۔ بلکہ صرف اپنے وقار اور عزت کی فکر ہوتی ہیں۔لتا کی زندگی میں ہر ہر لمحہ ایک موڑ آتا ہے جس کو وہ خود کی نفس کشی کر کے دوسروں کی عزت اور خوشی کی خاطر گزار دیتی ہے۔

ناول میں نہ صرف عورت کی پستی، بے دردی اور کمزوری کو دکھایا گیا ہے بلکہ وہی عورت سماج کو برہنہ بھی کر دیتی ہے۔جب اس کا خود کا خون (روپیش) اپنے پھوپھا کے کہنے پر آواز اٹھاتا ہے کہ وہ سدھا کر کا ساتھ چھوڑ دے۔پورا سماج ہم پر لعنت بھیج رہا ہے۔آج اسی مرد کو سماج کی فکر ہونے لگی کہ سماج اس کے اور سدھا کر کے رشتہ پر انگلی اٹھا رہے ہیں۔یہاں پہ ایک سوال قائم ہوتا ہے کہ کیا سماج کو اس وقت فکر نہیں ہو رہی تھی جس وقت سماج ایک مکمل لڑکی کو ایک اپاہج کے ساتھ بغیر پھیروں کے اس کے ساتھ شادی کر دی گئی؟ کیا سماج اور مذہب میں ایک اپاہج کو ایک مکمل انسان سے شادی کے لائق قرار دیا جاتا ہے؟ یہ مرد اساس سماج و معاشرہ کی نگاہیں بھی کیا خوب ہیں۔ان کی نگاہیں اس وقت نہیں کھلتی جب بات مردوں کی ہوں بلکہ اس وقت بیدار ہوتی ہیں۔جب کوئی مجبور، بے بس، بے سہارا عورت کی بات ہوتی ہے۔اسے مجبور کیا جاتا ہے۔مطلب پرست، خود غرض سماج افادیت سے پر لطف ہو کر اسے حقیر اور ذلیل کرتے ہیں اور خود کو پاکدامن اور باعزت سمجھ بیٹھتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''اسے نندوئی اور اس کے سماج کے دماغی دیوالیہ پن پر ہنسی آرہی ہے۔ایک اپاہج کے بچے کو تو عزت ملتی ہے اس سماج میں لیکن اس کی ماں کو لعنت ملتی ہے اگر روپیش جائز ہے تو سدھا کر سے اس کا رشتہ ناجائز کس طرح ہو گیا؟
>
> اس کا رشتہ اس لیے ناجائز ہے کہ اس سے صرف اسے خوشی حاصل ہے اور نندوئی کا رشتہ اس لیے جائز تھا کیونکہ اس سے تمام خاندان کو خوشی حاصل ہوتی تھی؟ اس کا معنی یہ ہوا کہ جائز اور ناجائز کا مطلب حالات میں الگ الگ شکل اختیار کرتا ہے۔واہ رے سماج اور سماج کے چوکسی آنکھیں اور واہ رے جائز اور ناجائز کی اصطلاح۔اس کا سر بھنا اٹھا وہ اٹھی، کمرہ میں چکر کاٹنے لگی غصہ سے اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں'' ۔7

لتا امتحان کے دور سے گزرتی ہے لیکن وہ وہی کرتی ہے جو اس کا ضمیر کہتا ہے۔ سماج کے خلاف جنگ کرتی ہے اور سدھا کر کی طرح خود بھی حویلی سے رخت سفر باندھ لیتی ہے۔ جب اس کا بیٹا کہتا ہے کہ آپ کو دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اس میں مرد کے دونوں پہلوؤں کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ سماج میں حیوانیت کے ساتھ انسانیت بھی زندہ ہے جس کی مثال اس کہانی کے حوالے سے لتا کا نندوئی اور دوسری طرف سدھا کر۔ سماج صرف منفی خیالات کے افراد سے پر نہیں ہے بلکہ مثبت خیال کے فرد بھی موجود ہیں۔

مجموعی اعتبار سے جانے کتنے موڑ ایک عمدہ سماجی ناول ہے۔ جو مرد اساس سماج و معاشرے میں گھری عورت کے درد کو اجاگر کرتا ہے۔ نیز عورت کے اندر سماج کے ذریعہ تھوپی گئی زندگی کے قوانین کے خلاف پوری دلیری و بے باکی سے لڑنے کی طاقت کو نمایاں بھی کرتا ہے اور ایک تانیثی آواز بھی ابھر کر سامنے آتی ہے۔

آشا پربھات کا یہ ناول فنی و موضوعی دونوں اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ قاری کی جستجو اور دلچسپی ابتداء تا اختتام برقرار رہتی ہے۔

مختصر بہ طور مجموعی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی خواتین قلم کار اپنی تحریروں میں انہی مسائل کو پیش کرتی نظر آرہی ہیں، جو ترقی یافتہ دور میں تیزی سے پنپ رہے ہیں۔ بعض ایسے موضوعات بھی دکھائی دیتے ہیں جو صدیوں سے چلے آرہے ہیں چاہے وہ حقیقی زندگی میں ہوں یا ناول میں، لیکن تخلیق کار نے نئے زاویے سے اور مختلف انداز میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ عصر حاضر کی خواتین ناول نگار ہر طرح کے مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعہ پیش کر رہی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ نکل کر سامنے آتی ہے کہ ان کے پیش کرنے کا مقصد سماج کی اصلاح کرنا ہے۔ یوں تو مرد ناول نگاروں کی طرح خواتین نے بھی ہر طرح کے ناول خلق کیے ہیں اور اکثر مرد اور عورت کے تحریر کردہ فکشن میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن خواتین نے نسوانی کرداروں کو مرد ناول نگاروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طور پہ پیش کیا ہے۔ مذکورہ بالا جتنے بھی ناولوں کا ذکر ہے، ان میں زیادہ تر کے موضوعات نسائی مسائل اور گھریلو مسائل سے جڑے ہیں۔ گھر

کثیر المعنی لفظ ہے جس کا زندگی، سماج و معاشرے میں کافی اہم رول ہے۔ ان تمام مسائل و موضوعات کو مرد کے مقابلے خواتین قلم کار ہی پوری تفصیل کے ساتھ بخوبی بیان کر سکتی ہیں اور کر بھی رہی ہیں۔ عموماً گھریلو زندگی پر مردوں کے مقابلے میں ان کی گرفت زیادہ پائیدار ہوتی ہے۔ جس کی عکاسی بھی وہ بہتر طور پر کرتی ہیں جس کا اندازہ ہم ان کی تحریروں اور کہانیوں سے لگا سکتے ہیں۔

حوالاجات

1۔ (فلیپ، ناول لمحوں کی کسک، از شہناز فاطمی)

2۔ (مورتی، ناول، ترنم ریاض، ص 90)

3۔ (پیش لفظ، ناول، کہانی کوئی سناؤ متاشا، صادقہ نواب سحر، ص، 8)

4۔ (نادیدہ بہاروں کے نشاں، ناول، شائستہ فاخری، ص، 103)

5۔ (دھند میں کھوئی روشنی، ناول، افسانہ خاتون، ص، 127)

6۔ (پشت، ناول، دھند میں کھوئی روشنی، افسانہ خاتون)

7۔ (جانے کتنے موڑ، ناول، آشا پربھات، ص، 159.160)

اکیسویں صدی میں بنگلہ دیش کے اردو ادباء

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل*

ادب سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے بدلتے ہوئے رجحانات اور تغیرات کا عکس ہوتا ہے۔ اردو کے تین دبستانوں دکن، دہلی اور لکھنو کی بنیاد ان رجحانات وتغیرات کے تحت پڑی تھی۔ بنگلہ دیش کا دبستان اردو بھی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں۔ مذکورہ بالا مراکز سے دور رہ کر بنگلہ دیش کا دبستان اردو اپنی امتیازی خصوصیات کے ساتھ پنپتا رہا ہے۔ بنگلہ دیش کے اردو شعر وادب کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ ہوگا کہ جوں جوں زمانہ بدلا ہے بنگلہ دیش کے اردو فنکاروں نے بھی اپنی تخلیقات میں ان کی ترجمانی کی ہے۔ یہاں کے اردو اہل قلم بھی بنگلا زبان وادب کے فنکاروں سے پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے اپنے ادب کا رشتہ یہاں کی زمین سے جوڑنے کی کوشش کی۔ بنگلہ دیش کے چند اردو نثاروں کا ایک مختصر جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایوب جوہر :

ایوب جوہر کا پورا نام ہے محمد ایوب صدیقی۔ ان کا قلمی نام ہے ایوب جوہر۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سابق مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ بنگلہ دیش کے اردو ادبی حلقے میں ایوب جوہر کا تعارف صحافی، شاعر اور افسانہ نویس کی حیثیت سے ہے۔ ایوب جوہر ۱۹۷۱ء کے بعد سے باضابطہ کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ ان کی چند کہانیاں تاریخی پس منظر میں ہیں۔ جن میں تقسیم ہند، ہجرت، لسانی تحریک کے نتائج اور اس سلسلے میں ۱۹۷۱ء کے انقلاب کو انہوں نے موضوع بنایا ہے۔

ایوب جوہر کے افسانوں میں پرانے ڈھاکہ کے مخصوص علاقوں کے علاوہ محمد پور اور میر پور میں رہنے بسنے

---

*شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

والے مقامی اور غیر مقامی متوسط اور مفلس طبقے کی گھریلو زندگی، نفسیاتی الجھن، سماجی مسائل، لسانی تنازعہ سے پیدا ہونے والے آپسی تنافر کا اظہار ہے۔ انہوں نے اپنی روایات سے رشتہ برقرار رکھتے ہوئے جدیدیت کی طرف بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے کرداروں میں کماحقہ تمثیلی کردار بھی ہیں۔

'سادہ کاغذ' ایوب جوہر کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ 'بسم اللہ'، 'ہجرت'، 'روٹ لیس' وغیرہ ان کے نمائندہ افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ ان کی کہانی 'بسم اللہ' کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک متوسط طبقے کی عورت سماج کی ناانصافیوں سے تنگ آکر بھیک مانگنے پر مجبور ہوجاتی ہے۔

'ہجرت' میں تقسیم ہندوستان کے بعد مقامی باشندوں کی مہاجرین کے ساتھ والہانہ ہمدردی پھول باڑیا ریل اسٹیشن پر مہاجرین کا پرخلوص خیر مقدم، پھر رفتہ رفتہ لسانی تنازعہ میں مقامی وغیر مقامیوں میں پیدا ہونے والی نفرت اور اس کے نتیجے میں ۱۹۷۱ء میں انقلاب بنگلہ دیش کے نتائج میں پیدا ہونے والے اثرات کی عکاسی ہے۔ اس افسانے میں ایوب جوہر خود ہی مرکزی کردار ہیں۔ شروع سے آخر تک تاثر کا ارکاز برقرار ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایوب جوہر میں کہانی لکھنے کی صلاحیت ہے۔ سماج اور معاشرہ پر ان کی گہری نظر تھی۔ متعدد موضوعات کے لحاظ سے ان کی کہانیاں اچھی کہی جاسکتی ہیں۔ شفیق احمد شفیق جوہر کے افسانوں کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے کہتے ہیں :

> ''ایوب جوہر کے افسانوں میں بنگلا دیش کی عوامی و سادہ زندگی، وہاں کے خانگی مسائل اور اندرونی انفرادی کیفیت کی عکاسی ایک مخصوص تخلیقی مناظر میں پائی جاتی ہے۔''[۱]

ڈاکٹر محمد عبداللہ :

پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ بنگلا دیش کے نامور ماہر تعلیم اور ممتاز محقق ہیں۔ وہ مختلف زبانوں سے واقف ہیں۔ بالخصوص بنگلا، اردو اور انگریزی میں انہیں مہارت کامل حاصل ہے۔ وہ چالیس سال تک ان تینوں زبانوں میں تحقیقی کام کرتے رہے۔

پروفیسر عبداللہ کا شمار بنگالی نژاد اردو نقادوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ۳۰ تحقیقی اور عوامی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کثیر التعداد تحقیقی مضامین سپرد قلم کئے جو ماہنامہ فاران (کراچی)، سیارہ (لاہور) ساقی (کراچی) روزنامہ پاسبان (ڈھاکہ) میں شائع ہوتے رہے۔ ادبی خدمات میں ڈاکٹر عبد اللہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فن اردو اور فن کاران اردو کو بنگلہ حلقوں میں اور بنگالی کے مشاہیر ادب کو اردو داں طبقوں میں متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی۔ ان کی تصنیفات اردو میں ''قاضی نذر الاسلام'' قابل ذکر ہے۔ انہوں نے قاضی نذل الاسلام کے تصورات اور جذبات پر ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے۔ بنگلادیش کے طلباء کی اردو انشاء پردازی پر مہارت حاصل کرنے کے لئے انہوں نے ''مفید اردو مضامین'' کے نام سے ایک درسی کتاب لکھی ہے۔ یہ کتاب بنگالی طلباء کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ پروفیسر کنیز بتول اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی تھیسیس میں ڈاکٹر عبداللہ کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''ڈاکٹر عبداللہ کی تحقیق و تفتیش کی صلاحیت اچھی ہے۔ وہ اپنی رائے مدلل بیان کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان سادہ، سلیس اور متین ہے۔ طرز تحریر میں وہ مولانا الطاف حسین حالی سے متاثر ہیں۔''[۲]

قاضی محی الدین وکرم پوری :

اصل نام قاضی محی الدین، معروف قاضی محی الدین وکرم پوری۔ ولادت بنگلہ دیش کے ضلع منشی گنج میں ہوئی۔ ۱۹۵۶ء میں کلکتہ میں کرشن چندر کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی۔ کرشن چندر نے محی الدین کے ادبی رجحانات کو تاڑ کر ان کی ہمت افزائی کی اور کہانی لکھنے کے فنی لوازم سے آگاہ کیا۔ کرشن چندر کی ہدایت سے مزید فائدہ حاصل ہوا۔ ان کی پہلی کہانی 'ربر کی عورت' ہے۔ کہانی کے علاوہ قاضی محی الدین نے مضامین، انشائیہ، ڈرامے، طنز و مزاح، شخصیت نگاری وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی۔ 'گلشن گلشن صحرا صحرا' نامی ان کے ایک ناول ہے۔ 'کال بیساکھی' 'شاپلہ کے پھول' 'بنجارن' وغیرہ ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ ان کی کہانیوں میں بنگلادیش کی دیہاتی زندگی اور قدرتی مناظر کی صحیح عکاسی ہے۔ ان کی کہانیوں میں کرشن چندر کا

تاثر ہے۔ان کی تقریباً پچاس کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔

زین العابدین :

بنگلہ دیش کی ادبی محفل میں زین العابدین کی پہچان ایک معروف افسانہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کی افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۶۰ء سے ہوا۔انہوں نے متعدد افسانے اور کئی فلموں کی کہانیاں تحریر کیں۔ان کا قوت مشاہدہ اور نفسیاتی شعور اچھا ہے۔سماج ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کے مانند ہے۔جس سے وہ افسانوں کا پلاٹ اخذ کرتے رہتے ہیں۔ان کی کہانیوں میں شہر میں بسنے والے متوسط طبقے کی روزانہ زندگی کی ترجمانی کے علاوہ گاؤں کے مزدوروں، کسانوں اور مچھیروں کی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور دکھ سکھ کی ترجمانی ہوتی ہے۔زین العابدین کی کہانیاں کرشن چندر کی کہانیوں سے متاثر ہیں۔ 'گوالا' ،'رکھال'، 'نئی نوکری''، 'سات بھائی چمپا' 'کسان' وغیرہ ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔زین العابدین کے افسانوں کی جڑیں بنگلا دیش کی زمین میں پیوستہ ہیں۔ان کے افسانوں میں بنگلہ دیش کی دیہاتی زندگی کی عکاسی ہے۔انہوں نے دیہات کا مقامی رنگ اور اس کی منظر نگاری ایک مصور کی طرح تصویر اتاری ہے۔زین العابدین کے افسانے بنگلا، پاک و ہند کے مختلف معیاری رسائل سیپ (کراچی) قومی زبان (کراچی) افکار (کراچی) انتخاب (ڈھاکہ) مجلس (ڈھاکہ) وغیرہ میں بڑی شد و مد شائع ہوتے رہے۔

شام بارکپوری :

شام بارک پوری کا اصلی نام شاہ محمد ہے۔شاید انہوں نے 'شاہ' سے 'شا' اور 'محمد' سے 'م' لیکر 'شام' قلمی نام اختیار کیا۔مغربی بنگال کے ایک گاؤں بارک پور میں ۱۹۴۴ء میں ان کی پیدائش ہوئی۔تقسیم ہند کے بعد شام بارک پوری اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش چلے آئے۔بنگلہ دیش میں اردو ناول اور افسانہ کے میدان میں شام بارکپوری نے بڑا نام پیدا کیا۔ان کا پہلا ناول ''کرشنا چوڑا کے سائے'' بنگلا دیش کے قدرتی حسن اور مناظر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان کا دوسرا ناول ''آتش چنار''

ہے۔ اس ناول میں کشمیر کے مظلوم باشندوں کی زندگی، ظلم وتشدد اور بیچارگی کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

شام بارک پوری کا پہلا افسانہ ''آنسو'' ہے جو فروری ۱۹۵۷ء میں 'فنکا' کراچی میں شائع ہوا تھا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پدما کی موجیں'' ۱۹۷۹ء میں، دوسرا مجموعہ ''میگھنا کی لہریں'' ۱۹۸۰ء میں، تیسرا مجموعہ ''جمنا کے دھارے'' ۱۹۸۴ء میں، چوتھا مجموعہ ''سورج مکھی'' ۱۹۸۶ء میں اور آخری مجموعہ ''رجنی گندھا'' ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پس منظر بنگلا دیش کی خوبصورت سرزمین ہے۔ بنگلا دیش کی ندیاں، دریا، تالاب، نالے، کشتی، مچان، مچھلی، دھان کھیت، دھان کی سنہری بالیاں، پٹ سن کے کھیت، ان کھیتوں میں کام کرنے والے کسان اور مزدور، ان کے رہن سہن کے طریقے یہ سب شام بارک پوری کے افسانوں میں جلوہ گر ہیں۔ بقول ایوب جوہر :

> ''شام کے افسانے بنگلا دیش کی عظمت، پاکیزگی اور اس کے والہانہ فطری مناظر کی بھی پوری عکاسی کرتے ہیں اور اس سعادت سے یہاں کے دوسرے افسانہ نگار محروم ہیں۔''۳

شام بارک پوری کا قلم حقائق کی عکاسی کرتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑی عمدگی سے اپنی تحریروں میں سمویا ہے۔ ان کا بیان صاف ستھرا اور سلیس ہے۔ 'شام کے بارے میں' مقالہ میں اشرف صدیقی کہتے ہیں :

> ''شام بارک پوری کی زبان صاف ستھری، حسین دلکش، رواں دواں اور ترنم ریز ہے۔ انداز بیان میں کشش اور سادگی ہے۔ منظر نگاری کا فطرت حسن بھی چھلک پڑتا ہے۔ بنگال کی فضا، بنگال کا ماحول، بنگال کے مناظر، کھیت اور کھلیان دیکھنا ہو تو ان کے مجموعہ میں سب کچھ ملے گا''۴

بنگلہ دیش میں اطفال کے ادب اردو میں شام بارک پوری نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی ادبی زندگی کی

ابتدا بچوں کی کہانی سے ہوتی ہے۔ان کی پہلی کہانی ''حمید چڑیوں کے دربار میں'' ماہنامہ نونہال کراچی کے مئی ۱۹۵۶ء کے شمار میں شائع ہوئی تھی۔اس وقت وہ پانچویں جماعت کے طالب علم تھے۔انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور ہندو پاک کے مختلف رسالوں میں ان کی کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔بنگلہ دیش کے وجود میں آنے کے بعد انہوں نے افسانے اور ناول کے علاوہ بچوں کی بہت سی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔اس ضمن میں ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''چاند ستاروں کی کہانی'' قابل ذکر ہے۔اس کتاب کے بارے میں علقمہ شبلی کہتے ہیں :

> ''یہ امر امید افزا اور خوش کن ہے کہ بنگلا دیش سے بچوں کی کتاب پہلی بار منظر عام پر آرہی ہے۔شاید مشرقی پاکستان کے دور میں بھی بچوں کی کہانیوں کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔یہ اقدام بنگلا دیش میں اردو ادب کے لئے نیک فال ہے اور امید ہے کہ اردو پڑھنے اور سیکھنے والے بچوں کے لئے یہ کتاب مشعل راہ ثابت ہوگی۔''۵

ارمان شمسی :

خاندانی نام محمد ارمان، قلمی نام ارمان شمسی، ارمان شمسی کو بچپن ہی سے افسانہ نویسی کا شوق تھا۔بچوں کے لئے کہانیاں لکھا کرتے تھے۔افسانہ نویسی کا ذوق وشوق نے انہیں بنگلہ دیش کے افسانہ نگاروں کے گروہ میں شامل کر دیا۔افسانہ نویسی میں انہیں مختصر کی تکنیک اپنانے کی صلاحیت ہے۔زبان با محاورہ لکھتے ہیں مگر ان کے افسانوں کا پلاٹ زیادہ تر کلکتہ اور دہلی کے ماحول سے اخذ کئے گئے ہیں۔ان کے افسانوں میں کلکتہ، دہلی اور بمبئی کی شہری زندگی کی عکاسی ہے۔''پیاسی ندیا'' ''دہکتی جنت'' ''اسیر فطرت'' ان کی اچھی کہانیاں ہیں۔ ''آشنائی کا کرب'' ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' ''خواب ریزے'' ان کے اہم افسانوی مجموعہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر :

بنگلہ دیش کے اردو محفل میں ڈاکٹر کلثوم کی پہچان کامیاب معلّمہ، اچھی نثر نگار و محققہ کی حیثیت سے ہے۔ اردو و فارسی کے علاوہ انہیں انگریزی، بنگلہ وہندی زبان سے بھی واقفیت ہے۔ اردو و فارسی میں انہوں نے مفید درسی و ادبی تخلیقات سپرد قلم کئے۔ انہوں نے ابتک کئی کتابیں تصنیف یا تالیف کی ہیں اور تقریباً ۶۰ مقالات لکھے ہیں جو برصغیر کے مختلف معیاری رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات اور کارنامے'' ڈاکٹر کلثوم کی پہلی اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مقالہ کے چند ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے شادانی کی حیات، شخصیت، ان کی شاعری اور تنقید نگاری کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ ''آسان اردو'' ان کی دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب کلاس نہم و دہم کے لئے لکھے گئے ہے۔ ''بنگلادیش میں اردو ادب'' ان کی اور ایک اہم کتاب ہے۔ اس کتاب میں بنگلہ دیش میں اردو ادب سے وابستہ ۱۱ (گیارہ) مضامین کو شامل کیا ہے۔ اگر ان مضامین کے عنوانات پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مصنفہ نے بنگلادیش میں اردو ادب، یہاں کی ثقافت کو پروان چڑھانے اور اردو ادب کی بقاء اور سرپرستی کے لئے جن حضرات نے خدمات انجام دیں تھیں انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

بنیادی طور پر ڈاکٹر کلثوم کا تعلق تحقیق سے ہے۔ ان کا اسلوب تحریر رواں اور دلنشین ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ اپنے مافی الضمیر کو بے تکلفی کے ساتھ بیان کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے مضمون میں بے تکلفی اور شگفتگی قاری کو دوسری طرف متوجہ ہونے نہیں دیتی۔ تنقید جیسی خشک صنف کو وہ اپنی رنگین بیانی اور عبارت آرائی سے قاری کے لئے پرلطف بنا دیتی ہیں۔

کلثوم ابوالبشر کے بارے میں افسر ماہ پوری ایک خط میں لکھتے ہیں :

> '' وہ دنیائے ادب میں بخوبی جانی پہچانی جاتی ہیں اور ان کی خدمات کا ہر ادبی حلقے میں اعتراف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کا اسلوب تحریر صاف ستھرا ہے۔ جو بات لکھتی ہیں اس کی ترسیل و تفہیم میں کوئی الجھن نہیں ہوتی اور میرے نزدیک تحقیق و تنقید کے لئے یہ انداز نگارش نہایت موزوں ہیں۔''

پروفیسر ڈاکٹر ام سلمٰی :

بنگلہ دیش کے دبستان اردو میں ڈاکٹر ام سلمٰی کامیاب معلّمہ، اچھی محققہ اور نثر نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ڈاکٹر ام سلمٰی کو اردو، فارسی انگریزی اور بنگلا زبان پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ ملک اور بیرون ملک میں ان کے تحقیقاتی کارنامے ان چاروں زبانوں میں زیور طبع سے آراستہ ہوتے رہے۔ ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں انہیں کافی سراہا گیا۔ پاکستان کے اخبارات میں ان سے متعلق گزارش بھی چھپی تھی۔

ام سلمٰی نے تقریباً ۴۵ تحقیقی و ادبی مضامین بھی سپرد قلم کئے۔ ان کے جو مقالے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں چند اہم اردو مضامین کے عنوان یہ ہیں:

عبدالغفور نساخ کی اردو اور فارسی کی خدمات، اردو کی پہلی نثری ڈراما ''نوابی دربار'' ، میرزا جان طپش کی ادبی و سیاسی سرگرمیاں، انیسویں صدی میں خواجگان ڈھاکا کی اردو و فارسی خدمات، بنگلہ دیش کے لوک گیت، انیسویں صدی میں فرید پور کے قاضی خاندان کی اردو و فارسی خدمات، اقبال کی نظر میں عورت، بنگلا زبان پر اردو زبان کا اثر، محمد اقبال اور قاضی نذل الاسلام: ایک تقابلی جائزہ ، وغیرہ۔

موصوفہ میں تحقیق و تفتیش کا مادہ اچھا ہے۔ ان میں نئی نئی باتوں کے جاننے کی لگن ہے۔ تحقیق و تفتیش کا کام بڑی دلجوئی اور خوش اسلوبی سے انجام دیتی ہیں۔ ان کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ہر بات کو سمجھا کر لکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان میں خودنمائی و احساس برتری نہیں ہے۔ ان کا ناقدانہ لہجہ نرم اور دوستانہ ہے۔ ان کی اسلوب نگارش میں سلاست، متانت اور سنجیدگی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کے اسلوب کو ادیبانہ کہا جا سکتا ہے۔ ام سلمٰی کا تحقیقی مقالہ ''بنگلہ دیش کے فارسی و اردو ادب میں تاریخی ماخذ'' (انیسویں صدی) تشنہ گان ادب کے لئے مفید تحفہ ہے۔ یہ مقالہ بنگلہ دیش میں انیسویں صدی کی سماجی، سیاسی، ادبی و ثقافتی زندگی کی معلومات کے لئے دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔[۷]

س۔م۔ساجد :

س۔م۔ساجد کی قلمی تخلیق بنگلہ دیشی ماحول میں پروان چڑھی۔ انہوں نے کم عرصے میں بنگلہ دیش کے ممتاز

اردو افسانہ نگاروں کی صف میں اپنی جگہ بنائی۔ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۶۸/۱۹۷۰ میں شائع ہوا۔ فنی اعتبار سے ان کے افسانے قابل قبول ہیں۔ پلاٹ مقصد کے تحت ہوتے ہیں۔ واقعات میں تسلسل اور حقیقت نگاری، زبان کی روانی، تاثر کا ارتکاز ان کی کہانیوں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں بنگلا دیش کی سیاسی اور سماجی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ساجد کہانیوں میں ماضی سے رشتہ جوڑ کر حال پر تنقید کرتے ہوئے ایک پرسکون مستقبل کے تلاشی ہیں۔ '' صلیب کے سائے'' ''کہانی کا قتل'' ''اوورٹائم (over time)'' اور '' پاگل'' جیسی کہانیوں نے انہیں بیرون بنگلا دیش کے ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔

خلیل الرحمان زخمی:

قیام بنگلہ دیش کے بعد اردو زبان و ادب کی بقا اور فروغ کے لئے جن ادیبوں نے قابل قدر کام کئے ان میں خلیل الرحمان کا نام نمایاں ہے۔ ان کا اصل نام خلیل الرحمان اور تخلص زخمی ہے۔ ادبی حلقے میں خلیل الرحمان کی پہچان شاعر اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ زخمی کو افسانہ نویسی سے بہت دلچسپی ہے۔ وقتاً فوقتاً افسانہ لکھتے رہتے ہیں۔ وہ افسانہ نگاری میں منٹو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ زخمی کے افسانوں کے پلاٹ میں کوئی خاص مقصدیت نہیں۔ انہوں نے صرف اپنے گرد و پیش کے واقعات کو افسانہ کا جامہ پہنایا ہے۔ ''درد کا سفر '' ان کا سب سے مشہور افسانہ ہے۔

ڈاکٹر کلیم سہسرامی :

ان کا اصل نام محمد کلیم تھا۔ وہ ۱۹۵۰ء میں بہار سے ڈھاکہ آئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۵۹ء میں اردو میں ایم۔اے اور ۱۹۶۴ء میں فارسی میں ڈبل ایم۔اے کیا۔ ۱۹۷۰ء میں تہران یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصے تک محکمہ ڈاک و تار میں ملازمت کی۔ بعد میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہوئے۔ بنگلا دیش قیام ہونے کے بعد راج شاہی یونیورسٹی میں شعبہ السنہ کے سربراہ مقرر کئے گئے۔[۸]

ڈاکٹر کلیم سہسرامی اچھے محقق اور شاعر بھی تھے۔ بنگلا دیش بننے کے بعد انہوں نے زیادہ تر تحقیقاتی کام کئے۔

بنگال میں غالب شناسی، روایت اور درایت، آثر بنگال، بیمار بلبل ان کی اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔
بنگلہ دیش کے اردو ادب میں پروفیسر کنیز بتول، پروفیسر زینت آرا شیرازی، پروفیسر لطیف احمد نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے تحقیقی کارنامے بنگلا دیش کے اردو ادب کا انمول ذخیرہ ہیں۔
ہندو پاک کی اردو ادبی دنیا کے علاوہ بنگلہ دیش میں بھی اردو زبان و ادب کا ایک دبستان چلا آرہا تھا اور خوش قسمتی سے اب بھی موجود ہے۔ بنگلا دیش کی سیاسی تاریخ سدا تغیرات کے گرداب میں پھنسی رہی۔ ہر انقلاب کے بعد یہ سرزمین ایک نئے نام سے موسوم ہوا۔ نام میں تبدیلی کے باوجود برصغیر کی مشترکہ ادبی، علمی، فرہنگی، ثقافتی اور تہذیبی وراثت میں بنگلا دیش کا برابر کا حصہ رہا۔ بنگلہ دیش کے معروف شاعر حافظ دہلوی نے بجا طور پر کہا تھا :

جس کو بھی توفیق خدا دیتا ہے
آندھیوں میں وہ جلاتا ہے چراغ ۹

منابع و ماخذ :

۱۔ پروفیسر کنیز بتول، بنگلہ دیش میں اردو ادب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء، پی۔ایچ۔ڈی مقالہ (غیر مطبوعہ)، ص۔۲۸۶

۲۔ ایضاً، ص۔۳۰۶

۳۔ ایوب جوہر : جمنا کے دھارے (شام بارک پوری)، ص۔سرورق

۴۔ اشرف صدیقی: میگھنا کی لہریں (شام بارک پوری)، ص۔۱۴۰

۵۔ علقمہ شبلی : چاند ستاروں کی کہانی (شام بارک پوری)، کلچرل اکیڈمی، ڈھاکہ، ۱۹۹۱ء، ص۔۵

۶۔ افسر ماہ پوری : بنگلا دیش میں اردو ادب (ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر) ص۔سرورق

۷۔ پروفیسر کنیز بتول، بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷۔۱۹۹۰)، ساہتیہ و گیشنا کیندرا، ۲۰۲۰، ص۔۴۰۸

۸۔ احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، بنگلہ۔اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکا، ۲۰۱۴ء، ص۔۲۷

۹۔ بنگلا دیش میں اردو ادب، ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلہ۔اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکا، ۲۰۱۵ء، ص۔۱۴

نیا عالمی اُردو افسانہ

پروفیسر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری*

نئی صدی کو شروع ہوئے 19 برس ہو گئے ہیں۔ تیسری دہائی کے دہانے پر کھڑی دنیا عجیب و غریب منظر نامے کے ساتھ ہمارے روبرو ہے۔ امریکا گذشتہ صدی میں بھی سب سے طاقتور ملک تھا اور آج مزید طاقتور ہو گیا ہے۔ اس کے دوست ممالک کا اپنا الگ گروپ ہے۔ جس کی طاقت سے پوری دنیا خائف رہتی ہے۔ دوسری طرف روس، چین اور ہندوستان کی شکل میں ایشیائی طاقت کے ساتھ امریکہ اور دوست ممالک کی طاقت کو متوازن کرنے کے لیے سامنے ہے۔ آج امن کی بات کرنے والے ممالک بھی خود کو جدید جنگی ہتھیاروں سے مسلح کرنے میں لگے ہیں۔ بعض تو جلد از جلد اٹیم بم بنا کر دنیا کے مخصوص طاقتور ممالک میں، خود کو شمار کرنے میں مصروف ہیں۔ جن ممالک کے پاس یہ طاقت پہلے سے موجود ہے وہ نہیں چاہتے کہ مزید ممالک کے پاس یہ طاقت آئے۔ لہٰذا وہ ایسے ممالک کے خلاف معاشی پابندیوں کے ساتھ ساتھ دیگر دباؤ بنانے میں حملہ کرنے تک سے گریز نہیں کرتے۔

دوسری طرف انفارمیشن ٹکنالوجی ایک اور جنگ ہے جس میں دنیا کے بیشتر ممالک ملوث ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال سے آج جو انقلاب برپا ہوا ہے اس نے جہاں ترقی کے نئے نئے در وا کیے ہیں، وہیں جنگی ہتھیاروں کے بازار میں بھی نیا منظر نامہ ترتیب دیا ہے۔ ہتھیاروں کے استعمال میں کمپیوٹر کو جو دخل حاصل ہوا ہے اُس نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔ اب بنا پائلیٹ کے بمبار طیارے، دوسرے ممالک کی جاسوسی کرنے والے طیارے، ہزاروں کلومیٹر تک حملہ کرنے والی میزائلیں، رڈار سسٹم کو بے اثر کرنے کی ٹیکنک اور ہزاروں کلومیٹر دور ایک ملک سے دوسرے ملک جنگ لڑنے کی ترکیب و تکنک سے دنیا

*صدر، شعبۂ اُردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، انڈیا

ایک نئے جہان میں پہنچ گئی ہے۔اس کے علاوہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے سبب جانوروں کے کلون بنالئے گئے ہیں۔ ہرطرح کے کام کے لیے روبوٹ تیار ہیں۔ چاند کے علاوہ دیگر سیاروں پر انسانی آبادی یا دیگر مخلوق کی تلاش میں سرگرداں انسان خلا میں محنت کررہا ہے۔خلا میں زمین کے گرد اور چاند پر اپنے سیارے بھیجنے کی بھی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے۔ لیپ ٹاپ، موبائل، نئے نئے ایپ، ویب سائٹس، سوشل میڈیا وغیرہ نے زمانے کو جو برق رفتاری عطا کی ہے، وہ اس صدی کی بڑی کامیابی ہے۔

نئی صدی میں آنے والی ان تبدیلیوں نے جہاں انسانی زندگی کو متاثر کیا ہے وہیں ادب میں بھی اس کے اثرات بہت واضح ہیں۔سماج کے تغیر وتبدل کا اثر شاعری اور فکشن پر جلد نظر آنے لگتا ہے۔اس پس منظر میں جب ہم ''نیا عالمی اردو افسانہ'' کے موضوع پر غور کرتے ہیں تو خوش آئند حقائق سامنے آتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا ۷۰ء کی نسل اور کچھ ۸۰ء کی نسل کو بھی ملالیں تو بیسویں صدی میں اردو افسانے کے آخری قافلے کے طور پر مرزا حامد بیگ، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، محمد حمید شاہد، سلام بن رزاق، سے لے کر مشرف عالم ذوقی، ارمان نجمی، ترنم ریاض، مبین مرزا، نگار عظیم تک افسانہ نگاروں کی اچھی خاصی تعداد ہمارے سامنے تھی۔اس عہد کے ہمارے کئی بڑے دانشور اور ناقدین کے علاوہ اس نسل کے بعض افسانہ نگاروں کو بھی یہ خوش فہمی اور غلط فہمی تھی کہ اس نسل کے بعد افسانہ ختم ہو جائے گا۔اس نسل کے بعض افسانہ نگاروں کو یہ غلط فہمی آج تک ہے کہ ان کے بعد اردو افسانے میں خاطر خواہ، کچھ نہیں لکھا گیا۔شکر ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی میں اردو افسانے میں متعدد افسانہ نگاروں نے مختلف النوع موضوعات پر افسانے قلم بند کر کے ثابت کر دکھایا کہ اردو افسانہ صحت مند روایت کے ساتھ صحیح سمت میں رواں دواں ہے۔نئی صدی کی دو دہائیوں میں لکھے گئے افسانوں کے تعلق سے کہا جا سکتا ہے کہ افسانے کا مستقبل روشن ہے۔

اب سے قبل جب ہم عالمی اردو افسانے پر بات کرتے تھے تو برصغیر کے افسانوں تک ہی بات

محدود رہتی تھی، یا کبھی کبھار ایک آدھ ایسے افسانہ نگار کا ذکر آجاتا تھا جن کا تعلق یوروپ یا امریکا سے ہوتا تھا۔ نئی صدی میں انفارمیشن ٹکنالوجی کی ترقی نے عالمی منظر نامے کو نہ صرف واضح کیا ہے بلکہ اُسے حقیقتاً بین الاقوامی شناخت عطا کی ہے۔ اب برصغیر کے علاوہ ایک درجن سے زائد ممالک میں مقیم افسانہ نگاروں کے افسانے ہمارے سامنے ہیں۔

'نیا عالمی اردو افسانہ' کو بڑے پیمانے پر نشان زد کرنے کے لیے ہمیں گذشتہ 30-25 برسوں میں تحریر کیے گئے افسانوں کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس مدت میں ہمارے سامنے دو طرح کے افسانہ نگار ہیں۔ ایک قافلہ اُن افسانہ نگاروں کا ہے جن کا تعلق ۷۰ اور ۸۰ کے عہد سے ہے، تو دوسرا قافلہ ایسے افسانہ نگاروں کا ہے جنھوں نے نئی صدی کے آس پاس افسانے قلم بند کرنا شروع کیا۔ اس عہد یعنی 1990ء سے 2020ء تک افسانوں کا عمیق مطالعہ حیرت میں اضافے کا سبب بنتا ہے کہ افسانے میں نہ صرف موضوعات اور تکنک میں نت نئی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں بلکہ عصری حسیت سے سرشار ان افسانوں نے سماجی بیداری میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہندوستان، پاکستان، کے علاوہ یورپ میں جرمنی، انگلینڈ، فرانس، امریکا، کناڈا، آسٹریلیا، بلجیئم، ناروے، نیوزی لینڈ، سوئزرلینڈ، ساؤتھ افریقہ، بنگلہ دیش اور پھر خلیجی ممالک میں سعودی عرب، دبئی، قطر، بحرین میں بھی افسانہ لکھا جارہا ہے اور خوب لکھا جارہا ہے۔ دنیا بھر کے ان ممالک میں تحریر ہونے والے افسانوں میں مقامی مسائل، ماحول اور زبان کے اثرات بھی اردو افسانے کے دامن کو وسیع کررہے ہیں۔ اس طرح نئے عالمی اردو افسانے کا ایک ایسا منظر نامہ ترتیب پارہا ہے جو موجودہ صدی کو فکشن صدی کے طور پر متعارف کرارہا ہے۔ اردو افسانے کے ہر گذرتے برس کے ساتھ وسیع ہوتے منظر نامے کو استحکام اور رفتار عطا کرنے میں انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے رسائل، ویب پورٹل اور سوشل میڈیا پر موجود افسانوں کی مختلف سائٹس اور ان پر منعقد ہونے والے پروگرام عالمی افسانوی میلوں کا اہم کردار ہے۔ اردو عالمی افسانہ فورم کے ہر سال منعقد ہونے والے افسانہ میلہ میں ہزاروں کی تعداد میں کچے پکے افسانے موصول ہوتے ہیں۔ جن میں سے سنیکڑوں افسانے میلے کا حصہ بنتے ہیں۔ ہزاروں کمنٹس اور لائکس (پسندیدگی)۔ سے افسانوں کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان میلوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ

ہورہا ہے کہ افسانے کی دنیا میں ہر برس نئے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہورہا ہے۔ ادھر اس سلسلے میں دولرادبی فورم (کشمیر) کا افسانہ ایوینٹ اور بزم افسانہ (مہاراشٹر) کا افسانہ میلہ نے افسانے کی مقبولیت میں چار چاند لگانے کا کام کیا ہے

'نیا عالمی اردو افسانہ' کے مطالعہ کے لیے میں نے ہندو پاک کے علاوہ دیگر ممالک کے افسانہ نگاروں کے افسانوی مجموعے، ماہنامہ اور سہ ماہی رسائل میں شائع شدہ افسانے اور انٹرنیٹ پر شائع ہونے والے افسانوں کو شامل کیا ہے۔ یہ موضوع خاصا طویل ہے اور ہونا تو یہ چاہئے کہ ہر ملک کے افسانے کا الگ الگ مطالعہ مقامی زبان، موضوعات، مسائل اور فن کے آئینے میں ہو۔ اور افسانوں کا ایک معیاری انتخاب ترتیب دیا جائے۔ یہ کام جہاں دقت طلب ہے وہیں طویل وقت کا بھی متقاضی ہے۔ یہ الگ بات ہے کئی اداروں نے گذشتہ برسوں افسانے پر کئی اچھے نمبر شائع کیے ہیں۔ جن میں لوح، روشنائی، مکالمہ، جیسے رسائل کے خاص شمارے، فکر و تحقیق، دربھنگہ ٹائمز، ثالث، شاعر کے افسانہ نمبر کے علاوہ ہمارے بعض ناقدین کے ذریعہ ترتیب شدہ کتب مثلاً مرزا حامد بیگ، انوار احمد، خالد اشرف، عشرت ناہید، اسماء نینی، منصور خورشتر، ارشاد سیانوی، ریاض توحیدی وغیرہ کی افسانے کی تنقید کے ساتھ افسانوں کے انتخاب نے بھی نئے عالمی افسانے کے منظرنامے کی ترتیب میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

جرمنی میں اردو افسانہ

اُردو افسانہ یورپ میں تیزی سے اپنے قدم جمارہا ہے۔ دراصل یہاں جو ادباء و شعراء ہیں ان میں سے بیشتر ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ موجودہ صدی میں جرمنی میں کئی افسانہ نگار ہیں جو افسانے کی زلفیں سنوار رہے ہیں۔ عارف نقوی، نعیمہ ضیاء الدین، حیدر قریشی، سرور غزالی، عشرت معین سیما، وحید قمر، سید انور ظہیر رہبر، ہما فلک وغیرہ نے جرمنی میں گذشتہ 45-40 برسوں سے اردو افسانے کو اعتبار و استحکام عطا کیا ہے۔ عارف نقوی، حیدر قریشی، نعیمہ ضیاء الدین کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''جدید ادب'' (مدیر، حیدر قریشی) نے اردو افسانے کی

اشاعت وتبلیغ میں بھی اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اسی طرح اردو انجمن برلن نے بھی افسانے کے فروغ میں اہم کردار نبھایا ہے۔

نئی صدی میں اردو افسانے پر نظر ڈالنے سے جہاں سرور غزالی، وحید قمر، سید انور ظہیر، عشرت معین سیما، ہما فلک کے افسانے اپنی بہار پیش کر رہے ہیں تو وہیں عارف نقوی، حیدر قریشی، نعیمہ ضیاء الدین کے افسانے بھی رسائل کی زینت بن رہے ہیں۔ جہاں تک عالمی سطح پر نئے اردو افسانے کا معاملہ ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ سرور غزالی سے ہما فلک تک کے افسانہ نگاروں کے موضوعات میں ایک انفرادیت ملتی ہے۔ اردو افسانے کا نیا رنگ ہمیں سرور غزالی (بکھرے پتے) وحید قمر (ستاروں سے آگے) سید انور ظہیر (ہاتھ سے جنت بھی گئی) ہما فلک (روح دیکھی ہے کبھی) عشرت سیما (گرداب اور کنارے) افشاں کے افسانوں میں بخوبی ملتا ہے۔

> خودکش بم حملے، انتہائی غیر انسانی اور کریہہ فعل ہے۔ لیکن بعض لوگ اور گروہ اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے نہ صرف بے دریغ استعمال کر رہے ہیں بلکہ ثواب اور جنت کے حصول کا واسطہ دے کر نئی نسل کو آمادہ کر رہے ہیں۔ سید انور ظہیر نے اپنے افسانے ''ہاتھ سے جنت بھی گئی'' میں عمدگی سے پیش کیا ہے۔
>
> ''تم موت کا فرشتہ ہو تو مجھے فوراً جنت میں لے کر چلو۔۔۔''
>
> ''ہاہاہا۔۔''
>
> موت کے فرشتے نے اُس کی یہ بات سن کر بہت زور سے قہقہہ لگایا۔۔۔
>
> ''آہا تم جنت میں جانا چاہتے ہو، بہت خوب، معصوم بچوں، عورتوں اور مردوں کو ناحق قتل کر کے تم جنت میں جانا چاہتے ہو، ارے تم نے تو اپنے جسم کا بھی خیال نہ رکھا خدا نے تمھیں امانت کے طور پر دیا تھا اور اس خودکش حملے میں خود کو ہلاک کیا اور کہتے ہو کہ جنت میں جاؤ گے۔'' ۱

ہما فلک صاحبہ نے اپنے افسانے 'تلاش' میں ترقی یافتہ ممالک میں موجود جہیز کی رسم اور اس کے سماج پر اثرات کو عمدگی سے افسانہ کیا ہے۔

''اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ تمہارے خیال میں اس کے ساتھ رہتی اور اس سے خاموشی سے مار کھاتی رہتی؟''

''مارتا تھا؟ ۔۔۔۔ یہاں جرمنی میں رہ کر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔''نہیں میری پہلی شادی مراکو میں ہوئی تھی تب میری عمر بیس سال تھی۔ ہم لوگوں میں رواج ہے جب شادی کرنی ہو تو لڑکا لڑکی کے ماں باپ کو رقم دیتا ہے۔ شادی کے وقت اس نے بھی دی تھی۔ مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسے جوئے اور شراب کی لت تھی۔ اور اس مقصد کے لئے اسے پیسہ چاہئے تھا۔ ہمارے پہلے دو سال اچھے گزرے تھے۔ اس کی اپنے کام پر لڑائی ہوئی تو اسے وہاں سے نکال دیا گیا۔''[۲]

برطانیہ میں نیا اردو افسانہ

جرمنی ہی کی طرح برطانیہ میں بھی ہندو پاک کے افسانہ نگاروں نے ایک ایسا ماحول پیدا کیا کہ جس نے پورے یورپ میں افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ ساحر شیوی، قیصر نمکین، عاشور کاظمی، صابر ارشاد عثمانی، گلشن کھتہ، انور شیخ، جتیندر بلّو، مصطفیٰ کریم، محسنہ جیلانی، وحید احمد قمر، فہیم اختر وغیرہ کے افسانوں سے برطانیہ میں اردو افسانے کا جہان روشن ہے۔

نئے افسانے کے طور پر محسنہ جیلانی (عذاب بے زبانی) جتندر بلّو (گھات) مصطفیٰ کریم (امریکا امریکا) وحید احمد قمر (پکڑ) کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ 'پرواز' مسفیر اردو، اور آواز جیسے رسائل نے بھی افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

امن کا ذہن اس وقت انتہائی اذیت ناک کشمکش سے دوچار تھا۔ اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل پا رہی تھی، اسی لمحے ارچنا بغیر دیکھے مخاطب ہوئی۔

''آپ خاموش کیوں ہیں! خیر اگر آپ خاموش رہیں گے تو آج میں کسی طرح وہ بات کہہ سکوں گی جس کو کہنے کے لیے میں کئی دنوں سے سوچ رہی تھی، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ سے آج امن کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔''

امن یہ جملے سُن کر اور بھی سہم گیا۔ اب اس کے اندر جان بھی باقی نہیں رہی ،اس کے اوسان خطا ہو چکے تھے، وہ سہما ڈرا خاموش بیٹھا رہا۔ اس پر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی پھر ارچنا نے اپنے دل کی اس بات کا اظہار کیا جس کو وہ کب سے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔

''دیکھئے! کیوں نہ ہم لوگ امن کو گود لے لیں، وہ آپ کو بھی پسند ہے اور مجھے بھی، ہماری زندگی کا ایک خلاء بھی یو پورا ہو جائے گا، اور اس طرح ہماری فیملی بھی مکمل ہو جائے گی۔''

امن خاموش مبہوت کھڑا سُن رہا تھا اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی اس نے اپنے منتشر ہوش و حواس کو بہر کسی طور مجتمع کیا اور ہمت کر کے بڑی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔[۳]

''تم نے یہ بات مجھے تو بتا دی ہے۔ صلاح الدین یا منصور سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔ سلیم نے ادھر ادھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

یہ بات چھپی نہ رہ سکے گی۔ نہیں۔۔۔۔۔۔ میں انہیں صاف بتا دونگا۔ کہ ان لوگوں کو نماز پڑھتا دیکھ کر میں ان پر فائرنگ نہ کر سکا۔ بلکہ ان پر یہ بھی واضح کر دونگا کہ میں آئندہ ایسی کسی کاروائی میں حصہ نہیں لونگا۔

بھول کر بھی تنظیم سے الگ ہونے کی بات ان کے سامنے نہ کرنا۔

کیوں۔؟

وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔
مجھے ان لوگوں کا خوف نہیں ہے۔
پھر تمہیں کس بات کا خوف ہے۔ اللہ کی پکڑ کا۔ ایک عبادت گاہ میں خدا کی پرستش کرنے والوں کو خون میں نہلایا گیا ہے، کیا خدا خاموش رہے گا۔ مجھے آسمان پر چھائی اس ہولناک تاریکی سے ڈر لگ رہا ہے.....ھ ہونے والا ہے کچھ ہو کر رہے گا۔ رحیم کی آواز لرز رہی تھی۔[۴]

دونوں افسانوں کا رنگ الگ ہے۔ ایک انسانی جذبات، کشمکش، نفسیات کا افسانہ ہے تو دوسرے میں دہشت گردی مین ملوث نوجوان کے ضمیر کی کہانی ہے۔

امریکا (USA) میں افسانہ

امریکا کے مختلف شہروں خصوصاً لاس اینجلس، کیلی فورنیا، نیویارک وغیرہ میں اردو کی نئی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ ان شہروں میں مشاعرے، ادبی محفلیں، شام غزل کے اہتمام سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اُردو افسانے کو بھی پھلنے پھولنے کے مواقع مل رہے ہیں۔ یہاں بھی ہندو پاک کے اردو افسانہ نگاروں نے فضا کو ہموار کیا ہے۔ امریکہ کے موجوہ عہد کے اہم افسانہ نگاروں کی بات کی جائے تو عذرا عباس (جھڑ بیری کا بیر) سید سعید نقوی (دھوپ کی تپش) رضیہ فصیح احمد (بیسویں صدی کی بپتا) لالی چودھری (شناخت)، معراج رسول رانا (رنگ) بلند اقبال (چاند پر موت) سرور عالم راز سرور (ننانوے سال کا پھیر)، امین صدرالدین بھایانی (ہم صورت گر کچھ خوابوں کے) قمر نقوی، عشرت آفریں، شہلا نقوی وغیرہ نے افسانے سے اپنی شناخت قائم کی اور امریکا میں افسانے کی آبیاری بھی کی ہے۔

''امریکا میں اردو افسانہ'' مامون ایمن کی انتہائی اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ مامون ایمن نے بڑی محنت سے امریکہ میں رہنے والے تقریباً 45 ایسے افسانہ نگاروں کے افسانے شامل کیے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے امریکا پہنچے، یا جنہوں نے طویل عرصے تک وہاں قیام

کیا۔ کچھ امریکی اردو افسانہ نگاروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ویسے زیادہ تر افسانہ نگار پاکستانی ہیں۔ کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں افسانہ۔ افسانے کے موضوعات، کردار، پلاٹ وغیرہ کے تعلق سے بھی مامون ایمن نے خاصی بحث کی ہے۔ مامون ایمن نے افسانہ نگاروں کے احوال وکوائف کے علاوہ ان کا ایک افسانہ اور تجزیہ شامل کیا ہے۔ امریکا میں اردو افسانے کے تعلق سے یہ اولین کاوش ہے جسے مثال پبلشرز، فیصل آباد نے شائع کیا ہے۔ کتاب 1150 صفحات پر محیط ہے۔

لالی چودھری اور امین صدرالدین بھایانی کے افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کریں۔ ان میں آپ کو بالکل نئے رنگ ملیں گے۔ کہیں لڑکیوں کی امنگیں ہیں، خواہشیں، ہیں، تو دوسرے میں ایک قلم کار کی کہانی ہے۔

''ہر بند بوتل کو اُس نے اِس آس میں کھولنا شروع کیا کہ شاید پھک سے کوئی جن یا جنی بوتل سے نمودار ہو کر اُسے کہے کہ مانگو جو مانگنا ہے، وہ اس کی ہر خواہش پوری کرنے کو حاضر ہے۔ تو وہ جھٹ سے اُسے کہے گی کہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسا خوبصورت کزن لا دو جسے دیکھ کر اُس کی شناسا اہلِ کزن لڑکیاں اگر اپنے ہاتھ کاٹیں نہیں تو ہاتھ ملتی ضرور رہ جائیں۔ لیکن سب بوتلیں خالی نکلیں۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر اُس نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعائیں مانگنی شروع کیں کہ پروردگارِ عالم! تیرے 'کُن' کہنے سے 'فیکُن' ہو جاتا ہے۔ بس ذرا سا 'کُن' کہہ کر اس کے لیے کہیں سے دُور پار رِشتے کا ہی کزن بھیج دے۔ لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔[۶]

''میری دعا ہے کہ اللہ پرویز السلام فاضل مرحوم کی مغفرت کرے اور اس کے درجات بلند کرے، آمین۔

یہ آخری کلمات ادا کر کے میں نے ڈائس پر بکھرے کاغذات سمیٹے اور اسٹیج سے اتر کر سُست قدم اٹھاتا ہوا اپنی نشست کی جانب چل دیا۔ کراچی آرٹس کونسل کے کھچا کھچ بھرے ہوئے آڈیٹوریم میں محض چند ساعتوں کی مکمل خاموشی کے بعد

اچانک چھت شگاف تالیوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو تمام حاضرین اپنی اپنی نشستوں سے کھڑے ہو کر والہانہ انداز میں تالیاں پیٹ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تالیاں پرویز السلام فاضل کی برسی پر لکھے گئے میرے مقالے کی پسندیدگی کے لیے تھیں یا خود پرویز السلام فاضل مرحوم کے لیے۔''۷

کناڈا میں افسانہ

امریکہ کی ہی طرح کناڈا میں بھی اردو زبان نے اپنے پیر جما لیے ہیں۔ خاص طور پر اگر افسانے کی بات کی جائے تو مایوسی قطعی نہیں ہوتی۔ عبدالجبار، عبدالقوی ضیاء، ویدپرکاش وٹک سے لے کر سُلطانہ مہر، خالد سہیل وغیرہ نے کناڈا میں کہانی کے لیے جو ماحول تیار کیا وہ آج اپنے ثمرات کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔ عبدالقوی ضیاء نے اردو افسانے کو انگریزی قالب میں ڈھالا۔ سُلطانہ مہر نے ایک ضخیم افسانوی انتخاب شائع کیا۔ خالد سہیل طبع زاد افسانے لکھنے کے ساتھ ساتھ تراجم بھی کرتے رہے۔ ایک زمانے تک عبدالجبار کناڈا کی نمائندگی کرتے رہے۔ ویدپرکاش وٹک ہندی اور اردو دونوں میں سرگرم رہے ہیں۔ آج کناڈا میں متعدد لوگ اپنے علم وفن سے افسانوی فضا سازگار بنا رہے ہیں۔ جاوید دانش نے اپنے افسانوں اور داستانوں سے اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔ خالد سہیل (تھکی ہوئی زندگی)، نیر جہاں (تم کون ہو) شکیلہ رفیق (قطار میں کھڑا آدمی) طلعت زہرہ (سیڑھیاں) سُلطانہ مہر (دل کی آبرو ریزی) جاوید دانش (داستان ہجرتوں کی) نئے عہد کے ایسے افسانے ہیں جن میں عام انسان کا ذاتی کرب ہے تو، عوامی معاملات ومسائل بھی ہیں۔ علاقائی مسئلے اور عالمی معاملات بھی ان میں سانسیں لیتے ہیں۔

''رحمان نے کپکپاتے ہاتھوں سے آمنہ کی سرد انگلیوں کو دھیمے سے تھاما اور اپنے دل کی ہر ایک دھڑکن کو اُس کی دھڑکن میں پیار سے اُتار کر ماضی کے روشن کنوؤں کی منڈیروں پر آ کر بیٹھ گیا۔ گھڑی کی ٹک ٹک اُس کے اور آمنہ کے دلوں کی دھک دھک کے ساتھ الجھ کر اُلٹے قدموں چل رہی تھی۔ آمنہ انجان نظروں سے اُسے تک

رہی تھی کہ اچانک اُس کے سوکھے لبوں پر وہی مُسکان پھیل گئی جو بند آنکھوں سے پرے رحمان کے ہونٹوں پر سجی تھی۔ رحمان کی آنکھیں بند تھیں مگر اُس کے اندر کھلی آنکھوں میں آمنہ کی محبت کے دیے بھڑک رہے تھے۔ اُن دیوں کی روشنی میں وہ اور آمنہ گزرتے وقت کے لمحوں کے خلاف اپنے ماضی کی طرف رواں تھے جہاں اُن کی منزل، وائٹ ہول اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ وائٹ ہول جس میں جانے کا راستہ وقت ،روشنی اور مادے کے لیے تو بند تھا مگر۔۔۔۔ محبت کے لیے کھلا ہوا تھا۔ ۸

بلند اقبال نے واہٹ ہول میں محبت کو نئے پیرائے اور نئی لفظیات میں کچھ اس قدر عمدگی سے پرویا ہے، کہ قاری اپنے اندر بھی محبت کی ترنگیں محسوس کرنے لگتا ہے۔

خلیجی ممالک میں افسانہ

محبانِ اردو کے لیے نہایت اطمنان اور مسرت آمیز بات ہے کہ اردو نے خلیج کے متعدد ممالک کو اپنا گہوارہ بنالیا ہے۔ ریاض، جدہ، دبئی، دوحہ قطر، بحرین، کویت، جبیل وغیرہ ایسے مراکز کے طور پر سامنے آئے ہیں جہاں اُردو کی سرگرمیاں تیزی سے پھیلی ہیں۔ یہاں اردو زبان وادب کی درس و تدریس اسکول۔ کالج کی سطح تک رائج ہے۔ اردو اخبارات ورسائل بھی پابندی سے شائع ہوتے ہیں۔ مشاعروں، سیمیناروں کے ساتھ افسانوں کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ ان ممالک میں ہندو پاک کے ہزاروں افراد بغرض معاش مقیم ہیں اور شمعِ اُردو جلائے ہوئے ہیں۔

خلیجی ممالک میں بہت سے افسانہ نگار اپنے افسانوں سے افسانے کو زندہ کئے ہوئے ہیں۔ قمر سبزواری، دبئی (ہوم لیس) رومی ملک، بحرین (بے گھری) مہتاب عالم پرواز، کویت (کارواں) مشکور پٹھان، دبئی (یوسفِ ثانی) فریدہ انصاری دوحہ قطر (عکس آشنائی) سین علی، جدہ (گلِ مصلوب) وغیرہ کے افسانوں میں خلیجی ممالک کا ماحول، وہاں کے مسائل اور زبان کا بھی خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ بعض افسانہ نگار چند برسوں قبل خلیجی ممالک سے واپس آگئے ہیں۔ لیکن ان کے افسانوں نے بھی خلیجی ممالک کے

افسانے کو استحکام عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان میں ابرار مجیب (رات کا منظر نامہ)، عذرا نقوی (آنگن جب پردیس ہوا)، محمود شاہد (ڈھانچہ) رخشندہ روحی (مگر ایک شاخِ نہال غم)، شاہین نظر (پانی پانی) فرحت پروین (مرگِ محبت)، مجید سلیم (پہلا شکار) کا نام اہم ہے۔

خلیجی ممالک میں اردو افسانوں کا اقبال واجد نے 2001 میں ایک انتخاب ''جہات'' (نئی صدی کا افسانوی ادب) کے نام سے شایع کیا تھا۔جس میں اس وقت وہاں مقیم پانچ افسانہ نگاروں (محمود شاہد، فرحت پروین، عذرا نقوی، ابرار مجیب، مجید سلیم) کے پانچ پانچ افسانے شامل تھے۔

خلیجی ممالک کے چند افسانوں کے اقتباسات ملاحظہ کریں:

''یہ سب تو۔۔۔۔سیلاب کی نذر ہو گئے۔''

''اف۔۔۔۔مجھے زبردست جھٹکہ سا لگا''

''لیکن اس علاقے میں باڑھ کا پانی پہلے تو کبھی نہیں آیا تھا۔۔۔۔؟'' پونم اس سے پوچھ رہی تھی۔

''پچھلے سال باڑھ آنے سے جو بند ٹوٹ گیا تھا اس کی مرمت نہیں کی گئی تھی۔شدید بارش کی وجہ سے اچانک سیلاب کا پانی اس علاقے میں در آیا۔یہ سب اتنی جلدی اور اچانک ہوا تھا کہ بچاؤ میں یہ لوگ کچھ نہ کر سکے۔۔۔۔ہاں صرف ایک عورت بچ پائی تھی۔جو شاید اب بھی صدر اسپتال میں پڑی ہے۔۔۔۔'' ۹

''ہر طرف زہریلی گیس نے اُونٹوں کے دل کی دھڑکنوں میں اپنے اثرات پیوست کر دیئے تھے۔جبکہ SAFETY کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔خون کی اُلٹیاں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔اُونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں ماحول کی نحوست میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں.....اونٹوں کی اس طرح بلبلانے اور خون کی اُلٹیاں کرتے دیکھ کر میں بھی پریشان تھا۔ایسے حالات میں، میں کر بھی کیا سکتا تھا۔سوائے اس کے کہ ان حالات میں انہیں چھوڑ کر فرار کی راہیں اختیار کر لیتا اور فرار کی کوئی صورت بھی کہاں تھی۔

ہر طرف اُونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں تھیں، آہیں تھیں، اور سسکیاں ہی سسکیاں

تھیں۔ آگ کی لپٹوں میں گھری ہوئی صحرا کی پاگل ہوائیں اور بھی پاگل ہو اٹھی تھیں۔۔"[10]

"اس کے سسرال والے والدین سے قدرے کم حیثیت رکھتے تھے۔ رہن سہن میں بھی بہت فرق تھا۔ ان لوگوں کے اسالہ کے میکے سے وابستہ کئی مالی مفادات ان کی امیدوں کے مطابق پورے نہ ہوئے تھے۔ اس بات کا قلق بہت جلد ان کے رویوں میں بھی جھلکنے لگا تھا۔

لیکن اندیشوں اور وسوسوں کی زمینوں پر وصل کی بارشیں برسیں اور اسی دوران امید کی ایک ننھی کونپل اس کے رحم سے پھوٹی کہ اسالہ کی بے رنگ زندگی میں سبزہ لہلانے لگا اور بھید بھری خاموشیوں کے باوجود دھیما سا تبسم اس کے ہونٹوں پر رقصاں رہنے لگا۔"[11]

ان افسانوں میں جہاں بے گھر لوگوں (خانہ بدوش) کی بے گھری کے اسباب کی تلاش اور ان کے دکھ درد میں شامل ہونے کی مرکزی کردار کی کاوش ہے، تو دوسری طرف عرب کے ریگستان میں ریت بھری آندھی سے، زہریلی گیس کے پھیلنے اور اس کے مضر اثرات کے طور پر اونٹوں اور انسانوں کی جان کو لاحق خطرات کے شکم سے نکلنے والا جذباتی افسانہ ہے۔ تیسرے افسانے میں بنا کسی بات کے گھریلو معاملات کب کیسے روپ لے لیتے ہیں۔ حسد، جلن اور بلاوجہ نفرت پھیلانے والے کس طرح کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس بے جا ظلم کی شکار لڑکی کے اندرون کو عمدگی سے زبان دی گئی ہے۔

دیگر ممالک میں افسانہ

خوشی کی بات ہے کہ آج اُردو افسانے نے عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی ہے۔ جن ممالک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ان کے علاوہ متعدد ممالک ایسے ہیں جہاں ایک، دو افسانہ نگار اپنے قلم سے شمع امید روشن کیے ہوئے ہیں۔ جاپان، روس، ہانگ کانگ، آسٹریلیا، بلجیم، ناروے، اسپین، ترکی، مصر، ڈنمارک، نیوزی

لینڈ، سوئزر لینڈ، ساؤتھ افریقہ وغیرہ ممالک کے متعدد افسانہ نگار افسانے قلم بند کر رہے ہیں۔ خاص طور پر میں یہاں اسماء حسن، ہانگ کانگ (افق کے اس پار) فرحین جمال، بلجیم (سرد موسم کے گلاب) سید تحسین گیلانی، ساؤتھ افریقہ (کیمیکل) سلمیٰ جیلانی، نیوزی لینڈ (سسکیاں) نگہت سلیم، آسٹریلیا (آلو قیمہ) شاہین کاظمی، سوئزر لینڈ (برف کی عورت) وحید اختر واحد، سنگاپور (یہ تصویر حرامی ہے) کا ذکر ضرور کرنا چاہوں گا۔ ان میں سے زیادہ تر افسانے بالکل نئے موضوعات پر ہیں۔ ان میں عالمی مسائل ہیں تو مقامی حادثات و معاملات بھی، حسن و عشق ہے تو دہشت گردی بھی، بھوک ہے تو تذبیب بھی، ساتھ ہی انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا سے وجود میں آنے والا نیا جہان بھی۔

> ''مرد کے.....کو ٹھوکر لگے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اسے سوائے اپنے آپ کے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کے ساتھ اگر منہ میں چبانے کے لیے سونے کے دانت بھی ہوں تو رگوں میں دوڑتا لہو زہر بن جاتا ہے جو اچھے برے کی تمیز بھلا دیتا ہے۔ یہی کاشف چوہدری کے ساتھ ہوا تھا۔ اپنی سفلی خواہشات کے تکمیل کے لیے وہ.... پر اتر آیا۔ چار دن... کے بعد جب وہ اسے اماں سرداراں کے پاس لایا تو اس کی محض سانسیں چل رہی تھیں۔''[۱۲]

> ''اثرات مرتب کرتا ہے، سردی اور اندھیرا جینے کی امنگ کو کم کرتا جاتا ہے، ہڈیوں کو کاٹ دینے والی ٹھنڈ روح کو بھی کملا دیتی ہے، بس ایسا ہی ناصر کے ساتھ ہوا، وہ آہستہ آہستہ تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مایوسیوں نے اس کے جگر کو چھلنی کر دیا، ہر طرف سے ناکامی، سکون کی تلاش میں وہ قسط قسط مر رہا تھا۔ بے پناہ مشکلات، گھر سے دوری، اجنبی ملک اور لوگ، اس کی قوت برداشت جواب دیتی گئی اور وہ شراب کا عادی بنتا گیا۔''[۱۳]

بنگلہ دیش میں اردو افسانہ

بنگلہ دیش میں اردو افسانہ تقسیم ہند سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا، جس کا سہرا، احمد سعدی، راحت آرا بیگم، شائستہ سُہر وردی کے سر ہے۔ تقسیم کے بعد افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ ہجرت کر کے بنگلہ دیش آیا۔ جن میں شہزاد منظر، ایوب جوہر، زین العابدین، احمد سعدی، محی الدین نواب، رفیع فدائی، یونس احمر وغیرہ کا نام خاصا اہم ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے بنگلہ دیش میں اردو افسانے کی روایت کو خاصا استحکام واستناد بخشا۔ لیکن ۱۹۷۱ء میں قیام بنگلہ دیش کے بعد ان میں سے زیادہ تر نے پاکستان ہجرت کر لی۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد احمد سعدی، ایوب جوہر، قاضی محی الدین بکرم پوری اور ارمان شمسی نے بنگلہ دیش میں افسانے کی خستہ حال عمارت کو مزید منہدم ہونے سے بچانے کا کام کیا۔ ان افسانہ نگاروں نے بنگلہ دیشی افسانے، کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں، اور نئی صدی میں ایوب جوہر (۲۵۰، افسانوں کے خالق، سادہ کاغذ، ہجرت، سفر، گھر، بے لباس جیسے افسانے) ارمان شمسی (9 افسانوی مجموعوں کے خالق، ریشم کا جال، چاند نگر، خواب ریزے، شناخت، پیاسی ندیا جیسے معروف افسانے) ذاکر عزیزی (سکون کی تلاش، روٹ لیس، خانہ بدوش، میرا جسم ریزہ ریزہ، بہت سوئے) قاسم انیس (بہتے الاؤ، کرب وجود) ایم نعیم (رشتے کی پیاس، پسِ پردہ، محافظ) زین العابدین (سائے، سورج کا رنگ کالا، گوالا، رکھوال، ضیالوں کی دیواریں) س م ساجد (معمولی سی بات، بوڑھی آنکھیں، زخموں کی باس، پاگل، کتے، سوندھی مٹی) کے افسانے بنگلہ دیشی عوام کی زندگی، ان کے مسائل، روزگار، مقامی زبان اور عالمی حادثات و واقعات کے اثرات کو عمدگی سے اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے۔ ہاں یہ بات تشویشناک ضرور ہے کہ موجودہ افسانہ نگاروں میں سے زیادہ تر نے نصف صدی کا سفر طے کر لیا ہے اور ان کے بعد نئے افسانہ نگاروں کا فقدان ہے۔

ارمان شمسی کے افسانہ ''مزدور عورتیں'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> میں نے اس سرو قد حسن آرا کا جائزہ لیا تو سامنے ایک شہابی رنگت کا طلسمی مجسمہ کھڑا پایا جس کو صناع عالم نے چاندنی کے اجالے کے ساتھ سرخ گلابوں کے پھولوں میں گھونٹ کر تیار کیا تھا جس کی زلفیں برہا کی راتوں کی طرح طویل اور اماوس کی راتوں

کی طرح سیاہ تھیں جس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی جھلمل تھی جس کے نازک لبوں پہ نیم شگفتہ غنچوں کا تبسم مچل رہا تھا، میں وارفتہ وشیفتہ اس بت طناز کو تکنے لگا تو اس نے شرما کر اپنے نازک ہونٹوں کا ایک قوس بنایا جہاں سے لذتوں کے سوت پھوٹنے لگے میرے حواس پر بجلی گری اور میں سحر زدہ ہو کر کھو سا گیا۔''[۱۴]

س م ساجد کا افسانہ زخموں کی باس کا اقتباس دیکھیں :

ہجوم میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور چہرے پر ایک انجانی خوشی کی لہر دوڑ گئی اور'' سسٹر آ گئی! سسٹر آ گئی!'' کی آواز فضا میں بلند ہوئی۔ جو عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ جلدی جلدی سے اٹھ کھڑی ہو گئیں۔

رکشا قریب آ چکا تھا۔ واقعی سسٹر فریڈہ ہی تھیں۔ سسٹر فریڈہ ایک تجربہ کار کینیڈین نرس تھیں اور سید پور پروجکٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ کیمپوں میں رہنے والے تقریباً سبھی انہیں پہنچانتے تھے کیونکہ کلینک جب قائم کیا گیا تھا تو سب سے پہلے سسٹر فریڈہ ہی نے سارے کیمپوں کا دورہ کیا تھا اور لاغر بچوں کا انتخاب کیا تھا۔ یہ ان کی ہمدردی اور خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ بڑے چھوٹے سب ہی انہیں سسٹر کہتے تھے۔

سسٹر فریڈہ پر نظر پڑتے ہی عورتوں نے ''سلام سسٹر! اور گڈ مورنگ!'' کے نعرے بلند کئے اور رکشے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔[۱۵]

ارمان شمسی اور س م ساجد بنگلہ دیش کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ یہ دونوں گذشتہ صدی میں بھی بہت سرگرم تھے اور ادھر نئی صدی میں بھی اپنے افسانوں سے، بنگلہ دیش میں افسانے کی شمع کو روشن رکھا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں ایک ایسا جہان ہے، جہاں خوصورت دنیا کے خواب بھی ہیں تو درد وغم بھری حقیقتیں بھی۔ یہ افسانے اپنے گرد و نواح کی سچی تصویر پیش کر رہے ہیں۔ ارمان شمسی کے اسلوب کا بہترین نمونہ افسانہ 'مزدور عورتیں' ہے۔

ماریشش میں اردو افسانہ

ماریشش اردو کی نئی بستیوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کی ادبی عمر یہی کوئی 45-40 برس ہوگی کہ ماریشش کی پہلی مطبوعہ کتاب، قاسم ہیرا کا شعری مجموعہ ''نارسائی'' ہے جو 1991ء میں منظر عام پر آیا۔ اسی طرح ماریشش سے شائع ہونے والا پہلا افسانوی مجموعہ 'کشمکش' ہے۔ فاروق رجل کا یہ مجموعہ 2005ء میں شائع ہوا۔ جس میں کل 10 / افسانے شامل تھے۔ اسی طرح 2008ء میں ایک کتاب '' ماریشش کے افسانے'' شائع ہوئی۔ اس میں احمد رحمت علی نے ماریشش کی دیگر زبانوں کی کہانیوں کا ترجمہ کر کے مجموعے کی شکل میں پیش کیا۔ اس میں کل ۲۰ افسانے شامل تھے۔ احمد رحمت خود بھی افسانہ نگار ہیں ان کا ایک افسانہ احساسِ گناہ، بھی اس میں شامل ہے۔ عبدالقاسم علی محمد کی ایک کتاب ''سرگذشت'' گذشتہ برس شائع ہوئی ہے۔ جس میں بعض دوسری تحریروں کے ساتھ چند کہانیاں بھی شامل ہیں۔

ان دنوں نئی نسل کی نمائندگی محترمہ ابینا ز جان علی کر رہی ہیں۔ ان کے افسانے ہند و پاک کے متعدد رسائل اور اخبارات میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''پیچ وخم'' 2019 میں شائع ہو چکا ہے۔ مجھے جینے دو، مجاہدہ، خود پرستی، سبکدوشی، وغیرہ ان کے اچھے افسانے ہیں۔

دراصل ماریشش میں اردو کی تعلیم کا راستہ 1970ء میں گاندھی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بعد شروع ہوا ہے جس کے خاطر خواہ نتائج اب سامنے آ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ ماریشش میں افسانے کے تعلق سے ہونے والے پروگراموں اور ہندوستانی افسانہ نگاروں کے آنے جانے سے ،فضا ساز گار ہوگی اور افسانے کی ایک نسل سامنے آئے گی۔ ابینا ز جان علی کے افسانے ''یاسمین'' کا ایک اقتباس دیکھیں۔ پڑھنے سے قبل یہ یاد رکھیں کہ ماریشش میں اسی صدی میں افسانے کی شروعات ہوئی ہے۔ یہ کہانی دراصل جاب کرنے والے ایسے میاں بیوی کی ہے، جن کی ڈیوٹی کا وقت الگ ہے۔ شوہر پریشان ہو جاتا ہے اور نوبت طلاق تک آ جاتی ہے۔

> ''میں تمہارے لئے قربانی دیتے دیتے تھک گیا۔ میں اس رشتے کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ میں سب کچھ یہیں پر ختم کر رہا ہوں۔'' ناصر کی آواز یاسمن کے کانوں میں گونجیں۔ اس

پر یاسمن نے ریوالور لکڑی سے بنی بنچ پر رکھا۔ اور آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اپنا فون نکالا اور ناصر کو فون کیا۔ فون بج رہا تھا۔ لیکن صبح کے دو بجے تھے۔ اس وقت ناصر سو رہا ہوگا۔

''میں ایسی بیوی چاہتا ہوں جو اس وقت گھر پر رہے جب میں گھر پر رہوں۔ تم سے تو ملاقات ہی نہیں ہو پاتی یاسمن۔ ہر وقت کام۔ جب تم گھر پر ہوتی ہو اس وقت میں دفتر میں رہتا ہوں اور جب اتوار کو میرا کہیں گھومنے کو جی کرتا ہے اس وقت تم تھانے میں ہوتی ہو۔ یہ کیسی زندگی ہے؟'' ناصر رکھائی سے کہتا۔۱۶

پاکستان میں اردو افسانہ

پاکستان میں اردو کو سرکاری درجہ حاصل ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پاکستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جہاں اردو سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں بھی لاہور تقسیم سے قبل بھی اردو کے ایک بڑے مرکز کے طور پر مشہور تھا۔ قیام پاکستان کے بعد متعدد شہر اردو کے مراکز کے طور پر اُبھرے ہیں ان میں کراچی، فیصل آباد، اسلام آباد، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور، کوئٹہ، سیالکوٹ وغیرہ شہروں نے اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جہاں تک نئے اردو افسانے کا سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں ۱۹۸۰ء کے آس پاس افسانے میں وارد ہونے والی نسل نے پاکستان میں نئے افسانے کی اساس رکھی۔ یہ افسانہ جدید افسانے جیسا نہیں تھا۔ یہ ترقی پسند افسانے جیسا بھی نہیں تھا۔ بلکہ اس میں نئے پن کی ایسی خوشبو تھی، جس کا تعلق اپنی زمین سے تھا، اپنے لوگوں سے تھا۔ دراصل یہ نہ صرف بیانیہ بلکہ کرداروں کی بھی واپسی تھی۔ یہ اپنی جڑوں کی طرف بھی واپسی تھی۔ اس نسل کے افسانہ نگاروں میں رشید امجد (ڈوبتی پہچان) امراؤ طارق (کرفیو کی رات) مرزا حامد بیگ (جانکی بائی کی عرضی) محمد حمید شاہد (باقی عمر اضافی ہے) مبین مرزا (خوف کے آسمان تلے) طاہرہ اقبال (ماں ڈائن) فردوس حیدر (خالی ہوا یہ دل) زاہدہ حنا (تنہائی کا چاہ بابل) گلزار جاوید (خود ساختہ ناخدا) مظہر الاسلام (سانپ گھر) حامد سراج (برائے فروخت) نیلم احمد بشیر

(تیشہ برداری) علی اکبر ناطق (شہاب خلیفہ کا شک) آصف فرخی (مرنا اگر ایک بار ہوتا) احمد داؤد (وسکی اور پرندے کا گوشت)، عذرا اصغر (کھڑکی میں بیٹھا وقت) شہناز شورو (لازوال دکھ) شہناز پروین (آنکھ سمندر) ایسے افسانہ نگار ہیں، جن سے نئے پاکستانی افسانے کی مضبوط و مستحکم عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اسی مضبوط بنیاد پر کھڑی افسانے کی عمارت میں رنگ و روغن کا کام بعد کے افسانہ نگاروں جن میں بعض بالکل نئے ہیں اور کچھ بیسویں صدی کے اواخر کے افسانہ نگار ہیں، نے مکمل کیا۔ دراصل یہی وہ افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں نئی صدی کے موضوعات، انفارمیشن ٹکنالوجی سے پیدا شدہ نئے جہان کے معاملات، دہشت گردی کے مختلف روپ، نائن الیون، جنسی وحشیانہ پن، فیشن کا نیا عہد، رشتوں کا کھوکھلا پن، آنر کلنگ جیسے واقعات اور موضوعات پر افسانے ملتے ہیں۔ نئی صدی میں ایسے افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ ان میں سے زیادہ تر کے کئی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں کم از کم ایک مجموعہ تو ضرور سامنے آچکا ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر الگ سے گفتگو ہونی چاہئے۔ سامنے کے چند افسانہ نگار مثلاً شاہد جمیل (سیر گلشن) فرخ ندیم (چودھویں رات کی رسرچ لائٹ) آغا گل (دوسری بابری مسجد) اقبال خورشید (سرد خانے کا ملازم) اے خیام (نامراد) رومانہ رومی (آٹھواں دروازہ) فارس مغل (قفس کے پھول) فارحہ ارشد (گرہن گاتھا) سمیرا نقوی (انہونی) منزہ احتشام گوندل (جہاز کی کھڑکی سے نظارہ) رابعہ الربا (گرہیں) سیمیں درانی (چھاپ چھاپ) سمیں کرن (بات کہی نہیں گئی) محمد امین الدین (آدم اور خدا) شکیل احمد خان (خواب اور طرح کے) محمد عاصم بٹ (اشتہار آدمی) انیس فاطمہ (زرد چنبلی کی خوشبو) عطا الرحمان خاکی (کچھ حقیقت کچھ فسانہ) نعیم بیگ (آخری معرکہ) نگہت سلیم (جہان گم گشتہ) صائمہ نفیس (رودالی) فیصل سعید (نوحہ گر) فرزانہ احمد (اپنی اپنی صلیب) ثمینہ سید (میں طاہرہ) مسرت افزا روحی (آوازیں) فرحین چوہدری (لٹرم) شبہ طراز (آدھا خواب) فرحانہ صادق (الو کا پٹھا)، شاہدہ شاہ (وادئ سندھ) وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جو نئے افسانے کی شناخت ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات کے ساتھ ان کی زبان بھی منفرد ہے۔ دو ایک افسانوں کے اقتباس ملاحظہ کریں۔

''اسے ایسا لگا جیسے اس کی چھاتیاں بھاری ہونے لگی ہوں، اتنی کہ پھٹنے کے قریب ہوگئی ہوں، آہستہ آہستہ یہ بوجھ بڑھنے لگا۔ یوں جیسے کسی غبارے میں زیادہ گیس بھر جائے تو وہ پھٹنے لگتا ہے۔ ان کے اندر کچھ اُبلنے لگا۔ وہ تپنے لگیں اسے یوں محسوس ہوا جیسے ان کے اندر سے کچھ پھوٹ رہا ہو سیال سے اس کی قمیض کا سامنے کا حصّہ نم ہونے لگا۔'' ۱۷

''اندھیرے میں یہ سب مرد ایک جیسے لگتے ہیں، ایک سائے کی طرح دکھتے ہیں، جن کی کوئی پہچان نہیں ہوتی، جب یہ اپنی پہچان خود کھو بیٹھتے ہیں، ہمیں کیا ضرورت پڑی ان کو پہچاننے کی، عزت کے رکھوالے ہی جب عزت کے سوداگر بن جائیں تو ہم کون ہوتے ہیں اپنی عزت بچانے والے۔'' ۱۸

''ایک دن میں طبعیت کی خرابی کی وجہ سے کچھ دیر پہلے ہی دفتر سے نکل پڑا اور کنول کی قربت سے اپنے درد کا مداوا کرنے لے لیے گھر کی راہ لی۔۔۔۔لیکن جب اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہوا تو میرے پاؤں ٹھٹھک گئے اور رگوں میں خون منجمد سا ہو گیا۔۔۔ایک اجنبی شخص دروازے سے باہر آرہا تھا۔۔۔اُس نے میرا سرتا پا جائزہ لیا اور مضحکہ انداز میں بولا۔۔۔۔

''اب تو ٹیم ختم ہوگیا۔۔بابو جی۔۔۔اب اس کا خصم آتا ہوگا۔۔۔۔'' ۱۹

میں نے یہاں بشریٰ اعجاز، شکیل احمد خان اور رومانہ رومی کے افسانون کے اقتباس لئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک درجن سے زائد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ (دراصل نیا عالمی اردو افسانہ، پوری کتاب کا موضوع ہے، جلد ہی یہ کام پورا کروں گا۔ اس میں افسانوں پر تفصیلی گفتگو ہوگی) ان افسانوں میں سماج کے مختلف رنگ اور شیڈس ہیں۔ ان کا تعلق کسی مخصوص علاقے یا زبان سے نہیں ہے، بلکہ یہ انسان کی فطرت اور خصلت کو پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان میں نیا اردو افسانہ

جہاں تک ہندوستان میں نئے اردو افسانے کا سوال ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ 1975-1980ء کے آس پاس داخل ہونے والی نسل جن میں حسین الحق، شوکت حیات، شفق، عبدالصمد، شموئل احمد، غضنفر، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، اسرار گاندھی، نگار عظیم، بشیر مالیر کوٹلوی، انجم عثمانی، بیگ احساس، ابن کنول، ساجد رشید، حمید سہروردی، نورالحسین، علی امام نقوی وغیرہ اہم افسانہ نگار شامل تھے۔ اسی نسل نے نئے افسانے کی بنیاد رکھی۔ جس کو بعد میں مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، دیپک بدکی، غزال ضیغم، کہکشاں پروین، ابرار مجیب، اسلم جمشید پوری، احمد صغیر، مجیر احمد آزاد، خالد جاوید، شبیر احمد، خورشید حیات وغیرہ نے آگے بڑھاتے ہوئے نئی صدی سے ہم آہنگ کیا۔ نئی صدی میں اردو افسانے کو متعدد نئے چہرے ملے۔ یہ وہ نسل ہے جسے پورے طور پر نئی صدی کی نسل کہا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانے گذشتہ افسانہ نگاروں سے قدرے مختلف ہیں۔ اس نسل میں ہم شائستہ فاخری (سنو رقیہ باجی) اختر آزاد (ہم کہاں جائیں بابولال) بلراج بخشی (زچ) ریاض توحیدی (کالے دیووں کا سایہ) مشتاق وانی (اندر کی باتیں) اویناش امن (خوف) حنیف خان (منگل مکھی) فرقان سنبھلی (آبِ حیات) غزالہ قمر اعجاز (چاند میرا ہے)، اشتیاق سعید (ہل جوتا) سلمیٰ صنم (طور پر گیا ہوا شخص) تبسم فاطمہ (تاروں کی آخری منزل) نسترن فتحی (کال بیلیا) ثروت خاں (مرد مار) تسنیم کوثر (ملیچ) شاہد اختر (تین پیر کا گھوڑا) جاوید نہال حشمی (دیوار) عشرت ناہید (سنگتراش) افشاں ملک (گودلی ہوئی ماں) محمد مستمر (مزہ) نیاز اختر (بوڑھے برگد کا انت) کو شامل کر سکتے ہیں۔ گذشتہ صدی کی نسل کے بعض افسانہ نگار بھی نئے افسانوی اُفق میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ جن میں خاص کر مشرف عالم ذوقی (اصل واقعے کی زیروکس کاپی) ابرار مجیب (رات کا منظر نامہ) خورشید حیات (پہاڑ، ندی، عورت) بشیر مالیر کوٹلوی (پانی کا دوزخ) نگار عظیم (عمارت) ترنم ریاض (شہر) نورالحسنین (کلمہ گو) بیگ احساس (دخمہ) انجم عثمانی (اغوا) شوکت حیات (گنبد کے کبوتر) خالد جاوید (کوبڑ) اسلم جمشید پوری (لینڈ را) احمد صغیر، (ہواشکار) صدیق عالم (مرے ہوئے آدمی کا لالٹین) شبیر احمد (چوتھا فنکار) کہکشاں پروین (پانی کا چاند) شاہد جمیل (ابابیل کی ہجرت) ریاض دانش (جو اماں ملی

)وغیرہ ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں نے نئی نسل کی رہنمائی بھی کی ہے اور نئے اردو افسانے کو استحکام واستناد بھی بخشا ہے۔ ساتھ ہی نئے افسانے کو نئی صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی کیا ہے۔ چند افسانوں کے اقتباس ملاحظہ کریں۔

سڑکوں پر چار پانچ فٹ برف جمی ہوئی تھی۔ راستہ بند ہونے کی وجہ سے ماسٹر گاش لال کے رشتہ دار جموں سے کشمیر نہ آسکے۔ مسلم برادری نے ہندو رسم کے مطابق گاش لال کی لاش کو نہلا دُھلا کر کفن پہنایا۔ ماسٹر گاش لال کے دوسرے شاگردوں نے اپنے شفیق اُستاد کی ارتھی کو کاندھوں پر اُٹھا کر شمشان گھاٹ پہنچا دیا اور احمد گنگا جل مٹکی اُٹھائے آگے آگے چلتا رہا۔ ماسٹر گاش لال کے ایک شاگرد نے ناقوس بجایا اور احمد نے چتا کو آگ لگا کر بڑے بیٹے کا حق ادا کیا۔ بستی کی فضا پر سوگ کا ماحول چھایا رہا۔۲۰

''دونوں بہت خوش وخرم تھے۔ بغیر کسی خوف کے رہتے تھے، دور دور تک دانہ چگنے جاتے تھے۔ ایک دن جب وہ دانہ چگنے جارہے تھے تو ایک جگہ بھیڑ جمع تھی، پولس کی گاڑیاں کھڑی تھیں، شور شرابا ہو رہا تھا۔ دونوں درخت کی ڈالی پر بیٹھ گئے تا کہ معلوم ہو سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان کو پتہ چلا کہ رات میں ایک جم غفیر نے ایک شخص کو پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا ہے کیونکہ اس نے گھر میں ممنوع جانور کا گوشت رکھا تھا۔''۲۱

''وہ سخت لہجے کے ساتھ نکہت سے مخاطب ہوتا ہے۔

'' دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔۔۔کیا اسی دن کے لئے پیدا کیا تھا تجھے۔۔۔!!؟ اور جو جواب نکہت دیتی ہے اسے سن کر اس کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کاش۔۔۔! زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

''اپنے مزے کے لئے پیدا کیا تھا مجھے۔۔۔!!'' نکہت ایک دم نکا سا جواب دے دیتی ہے۔

اسے ایسا لگتا ہے کہ اس کے گھر میں بم پھٹ گیا ہو اور پوری عمارت منہدم ہو کر اس

کے وجود کو ختم کر رہی ہو۔۲۲

درج بالا تینوں افسانے ناقوس اور اذان (ریاض توحیدی)، جائے امن کی تلاش (حنیف خان) مزہ (محمد مستمر) موضوع اور ٹریٹمنٹ کے لحاظ سے بالکل مختلف ہیں۔ ریاض توحیدی کے افسانے میں سماج میں مذہبی رواداری اور مساوات کا ایسا پیغام ہے جس کی آج ملک کو بے حد ضرورت ہے ۔حنیف خان کے افسانے میں پرندوں کی زبانی انسانی ظلم وزیادتی بلکہ انسانی بربریت کی کہانی کا بیان ہے۔محمد مستمر کے افسانے میں نئی فیشن اور بدلتے سماج کی ایک ایسی سفاک حقیقت کو پیش کیا ہے، جو آج کل عام ہے، لیکن ہماری شرمندگی کے لئے کافی ہے۔ یہ تینوں نئے افسانے کی مختلف آوازیں ہیں، جو نئی نسل کی نمائندگی کر رہے ہیں۔

اس طرح نیا عالمی اردو افسانہ، کے تعلق سے مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ افسانے کے مستقبل کے تعلق سے نا اُمید ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ نیا افسانہ اپنی رفتار اور معیار کے ساتھ محو سفر ہے۔نئی صدی میں ایسی نسل سامنے آگئی ہے جس سے آپ مطمئن ہو سکتے ہیں۔ایک خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اب افسانہ برصغیر کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں اپنے پیر پھیلا چکا ہے۔افسانے کی اس پھیلتی زمین اور وسیع ہوتے آسمان کے پیچھے سب سے بڑا ہاتھ سوشل میڈیا کا ہے، جس نے افسانہ نگاروں کو عالمی سطح پر مختلف ومتعدد پلیٹ فارم عطا کئے ہیں۔ بنگلہ دیش میں منعقدہ ''اکیسویں صدی میں اردو ادب'' جیسی بین الاقوامی اور دیگر قومی سطح کی کانفرنسوں اور سیمیناروں سے بھی افسانے کو ایک پلیٹ فارم مل رہا ہے اور افسانہ ہماری توقعات کے عین مطابق فروغ پا رہا ہے۔اس صورتِ حال کو اطمینان بخش کہا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔افسانہ: ہاتھ سے جنت بھی گئی، عکس آواز، انور ظہیر رہبر

۲۔افسانہ: تلاش، روح دیکھی ہے کبھی، ہما فلک، ص 101-100

۳۔افسانہ: پیاسی ندی، فہیم اختر کے افسانے

۵۔افسانہ: پکڑ، وحید احمد قمر

۶۔افسانہ: کھٹا میٹھا رشتہ، گریز پا، لالی چودھری

۷۔افسانہ: ہم صورت گر کچھ خوابوں کے، امین صدرالدین بھایانی

۸۔افسانہ: وائٹ ہول، بلند اقبال کی اکیاون کہانیاں، بلند اقبال

۹۔افسانہ: بے گھری، رومی ملک

۱۰۔افسانہ: کارواں،: کارواں، مہتاب عالم پرویز

۱۱۔افسانہ: ان ٹیوشن، گل مصلوب، سبین علی

۱۲۔ افسانہ: برف کی عورت، ڈاکٹر شاہین کاظمی

۱۳۔افسانہ: سرد موسم کے گلاب، فرحین جمال

۱۴۔افسانہ :مزدور عورتیں، ارمان شمسی

۱۵۔افسانہ: 'زخموں کی باس'، س م ساجد

۱۶۔افسانہ: یاسمین، ابیناز جان علی

۱۷۔ افسانہ، ادھوری تصویر، بشریٰ اعجاز

۱۸۔افسانہ، نصیب جلی، شکیل احمد خاں

۱۹۔افسانہ، فطرت۔، بالکونی میں کھڑی عورت، رومانہ رومی

۲۰۔افسانہ: ناقوس اور اذان، ریاض توحیدی، 172

۲۱۔افسانہ: جائے امن کی تلاش، حنیف خان، ص 137

۲۲۔افسانہ: مزہ، محمد مستمر، ص 114

اکیسویں صدی میں بنگلہ دیش کے چند اردو شعراء

حسین البناء*

شاعری انسانی جذبات کی عکاسی کرنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ شاعری عالم انسانیت کی ہر ایک تہذیب کا حصہ ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعہ انسان اپنے شعور و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور اپنی قوم کو نئے راستوں کا پتہ بتاتا ہے۔

شاعری کے سلسلے میں جہاں تک بنگلہ دیش کا سوال ہے، بنگلہ دیش سے اردو زبان کا رشتہ بہت قدیم ہے۔ آج بھی بنگلہ دیش کے بہت سارے لوگ اردو بخوبی بولتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں۔ مگر تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بنگلہ دیش میں اردو شاعری کا داغ بیل اٹھارہ ویں صدی کے اواخر میں پڑا۔ جب مرزا جان طپش (۱۷۸۶) اپنے کئی شاگردوں کے ساتھ بنگلادیش آئے اور بارہ سال تک یہاں قیام پذیر رہے۔ کہا جاتا ہے کہ بنگلادیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں قیام کے دوران مرزا جان طپش نے اپنی کلیات مرتب کی (۱)۔ شاعری میں مرزا جان طپش خواجہ میر درد دہلوی کے شاگرد تھے۔

مرزا جان طپش کے بعد انیسویں صدی میں بنگلادیش میں خاص طور پر مشاعروں اور ادبی نشستوں کا جلسہ قائم رہا۔ اس وقت بنگلہ دیش کی شاعری میں حافظ اکرام احمد ضیغم، عبدالغفور نساخ، منشی رحمٰن علی طپش اور محمود آزاد جیسے شعراء کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے اوائل سے تقسیم ہند تک بہت سارے شعراء بنگلہ دیش میں پناہ گزیں ہوئے جن کے کارنامے شاعری کی متعدد اصناف پر نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ان میں حافظ رحمت، ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی، علامہ امین عباسی (چریا کوٹی)، سلیم اللہ فہمی اور حافظ ظہور المبارکی کے نام قابل ذکر ہیں۔

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش۔

تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے فسادزدہ شہروں سے شعراء اور اساتذہ یہاں قافلہ در قافلہ آئے۔ جس کی وجہ سے یہاں کے اردو شعری ادب کو بڑا فروغ ہوا۔ آنے والوں میں اردو کے افسانہ نگار، تنقید نگار، صحافی اور درس و تدریس سے وابستہ ممتاز افراد بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی بڑی تعداد ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا اور سید پور میں آباد ہوئی۔ جس کی وجہ سے یہاں کے نئے ادبی اور شعری ماحول میں اردو ادب اور شاعری کو نئی جلاء ملی۔ ان مہاجرین حضرات میں شعراء کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں اساتذہ بھی تھے اور تلامذہ بھی۔ اساتذہ شعراء میں علامہ رضا علی وحشت، حکیم ناطق لکھنوی، آصف بنارسی، احسن احمد اشک، علامہ تمنا عمادی، شاغل فریدی، ماہر فریدی وغیرہ شامل تھے۔ آصف بنارسی، احسن احمد اشک وغیرہ علامہ رضا علی وحشت کے مشہور شاگردوں میں تھے۔ ان کے علاوہ بعض ایسے شعراء بھی آئے جو کسی کے شاگرد نہیں تھے مگر جدید اور ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ ان شاعروں کی آمد کی وجہ سے بنگلا دیش میں اردو شاعری ترقی پسند خیالات سے واقف ہوئی اور آہستہ آہستہ اس کا اپنا ایک الگ اور منفرد رنگ نمایاں ہونے لگا اور اردو شاعری میں رنگ برنگ کے پھول کھل اٹھے۔

مگر بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں اکثر اردو بولنے والوں نے پاکستانی ظالم فوجیوں کی حمایت کی۔ جس کی بنا پر ۱۹۷۱ء کی جنگ آزادی کے بعد اردو بولنے والوں کے لیے ماحول بڑا المناک تھا۔ جس طرح مغلیہ حکومت کی ہلاکت کی وجہ سے دہلی اور لکھنو کی ادبی محفلیں اجڑ گئی تھیں اسی طرح بنگلا دیش کے وجود میں آنے سے ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا اور سید پور میں بھی اردو کی بساط شاعری الٹ کر رہ گئی۔ اور نامساعد حالات سے مجبور ہو کر اکثر و بیشتر مشاہیر شعراء و ادباء پاکستان اور ہندوستان چلے گئے۔ بنگلہ دیش میں اردو زبان معتوب بن گئی اور اردو بولنے والے بھی۔ اس وقت چند گنے چنے افراد نے اردو ادب کی طرف رخ کیا اور ''ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہینگے'' (۲) کا عہد کرتے ہوئے اردو شعر و ادب کے چراغ کو روشن رکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت جن حضرات نے اردو کی مرجھی ہوئی اور گرتی ہوئی شاخ کو سنبھالنے کی کوشش کی ان میں چند حضرات ایسے ہیں جو اکیسویں صدی شروع ہونے سے پہلے چل بسے اور چند حضرات ایسے ہیں جو ابھی تک اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ میں اس مقالہ میں ان حضرات کے بارے میں باتیں کرونگا جو

اکیسویں صدی میں اردو کی خدمات انجام دیتے ہوئے وفات پا گئے یا جن کی خدمات ابھی تک جاری ہیں۔ ان حضرات میں ڈاکٹر کلیم سہسرامی، عاطف بنارسی، عطاء الرحمٰن جمیل، سید فیاض حسین قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ان میں سے ہر ایک کا مختصر تعارف اور نمونہائے کلام پیش خدمت ہے۔

(۱) ڈاکٹر کلیم سہسرامی (متوفی ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر کلیم سہسرامی ۱۲ جنوری سہسرام بہار میں پیدا ہوئے۔ وہ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۵۰ء میں ڈھاکہ آئے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے ماسٹرس کیا۔ بنگلہ دیش بنے کے بعد ۱۹۷۶ء میں راجشاہی یونیورسٹی میں ''شعبۂ السنہ'' کے سربراہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں ملازمت سے فارغ ہوئے۔ ڈاکٹر کلیم سہسرامی محقق ہونے کے ساتھ ساتھ اردو کے ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ وہ تاحین حیات اکثر مشاعروں کی صدارت کرتے تھے۔ انکے اشعار میں اپنے محبوب کی لاپرواہی اور بے وفائی کی صورت رونما ہے۔ انکی غزلوں میں عشق و عاشقی کی ناکامی کی تصویر زیادہ نمایاں ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

کسی کی جب سے وفاؤں کا سلسلہ نہ رہا
دل حزیں میں محبت کا حوصلہ نہ رہا
خودی نہ ہو سکی منت کش نشاط وفا
ہمارا ہاتھ کبھی مائل دعا نہ رہا (۳)

(۲) عاطف بنارسی (متوفی ۲۰۰۶ء)

ان کا نام محمد جسیم الدین۔ تخلص عاطف بنارسی۔ وہ ۱۹۳۲ میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ عاطف صاحب ۱۹۱۵ میں ریلوے کے ملازم کی حیثیت بنگلہ دیش آئے۔ وہ بے حد مقبول اردو شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں نئی زندگی اور نیا سفر کی امنگ ہے۔ ۱۹۷۱ کی جنگ آزادی کے بعد اردو کی بگڑی ہوئی حالت سے وہ مایوس نہیں ہوئے بلکہ روشن مستقبل کی امید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

غبار وقت کے ذرے تو ساتھ دیتے ہیں
ہمارے ساتھ کوئی ہم سفر نہیں، تو نہ ہو

چاند پر ہی تو نہیں ختم ترقی کا سفر
اور دو چار قدم آگے بڑھالو یارو (۴)

(۳) عطاء الرحمٰن جمیل (متوفی ۲۰۰۸)

عطاء الرحمٰن جمیل بہار (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک انجنیر تھے۔ بنگلہ دیش کے پی۔ڈبلو۔ڈی کے ملازم تھے۔ انہوں نے نظموں کے علاوہ خوب صورت غزلیں بھی کہی ہیں۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ بڑے خوش مزاج، دردمند، غم آشنا اور حاضر جواب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے حساس طبیعت کا مالک تھے۔ مگر دوستوں کی بے اعتنائی انہیں بہت دکھ پہنچاتی اور وہ آزردہ ہو جاتے تھے۔ اسی کیفیت کا اظہار ان کی اکثر غزلوں میں ملتا ہے۔ جنگ آزادی کے بعد اردو زبان جب معیوب بن گئی اور ادب کی تشنگی مٹانے کے لیے گھریلو طور پر مشاعرہ کا اہتمام ہونے لگا تو جمیل صاحب بھی وہاں شریک ہونے لگے۔ ان کی ایک غزل مقبول عام ہے۔

گھر میں اور دالان میں، آنگن میں اور کھڑکی کے پاس
سب کے سائے ناچتے ہیں جانے پہچانے ہوئے (۴)

(۴) میکش بنارسی (متوفی ۲۰۰۹)

میکش بنارسی کا اصل نام احمد علی انصاری۔ وہ مغل سرائے میں پیدا ہوئے۔ ریلوے کے ملازم کی حیثیت سے ان کے والد بنگلہ دیش آئے۔ وہ سید پور کا رہنے والے تھے۔ ان کی غزلوں میں نہ ملنے کا درد اور مایوسی بہت زیادہ ہے۔ خصوصا جب اردو بولنے والوں کو بنگلہ دیش میں محصورینِ پاکستان کی حیثیت پہنچانے جاتے تھے۔ وہ اس حالت سے مایوسی میں مبتلا ہو کر کہتے ہیں

میں انتخاب کے قابل نہیں سہی لیکن
غلط کچھ آپ کا معیار انتخاب بھی ہے
وہ لا مکاں ہیں تو اتنا غرور کیا معنی
کہ لا مکاں تو یہ خانماں خراب بھی ہے (۵)

فی الحال تو حالت اچھی ہے۔ بنگلہ دیش کی اعلی عدالت انہیں بنگلہ دیشی تسلیم کرلیا۔ اور ووٹ دینے کا حق بھی انہیں حاصل ہو چکا۔(۶)

(۵) معراج العارفی (متوفی ۲۰۱۰)

اصل نام محمد قاسم اور قلمی نام معراج العارفی۔ وہ کلکتہ میں پیدا ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے سید پور میں چلے آئے اور بنگلہ دیش میں آباد ہوئے۔ وہ بنگلہ دیشی نوجوان شعراء کے رہنما تھے۔ ان کی شاعری میں تصوف کا اظہار ابھرتا ہے۔ اللہ تعالی کی معرفت، حیات، موت، قبر اور حشر ونشر وغیرہ ان کی شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

مجھے خود آگہی نے ریزہ ریزہ کردیا
بکھر کر میں نے یہ جانا خودی کیا ہے خدا کیا ہے
میں اس مقام سے گزارتا ہوں مسکراتے ہوئے
حیات و موت میں جب کوئی فاصلہ ہی نہ تھا
وہاں سے لوٹ کے آیا ہوں ثابت و سالم
جہاں سے لوٹ کے آنے کا راستہ ہی نہ تھا(۷)

(۶) سید فیاض حسین (متوفی ۲۰۱۴)

سید فیاض حسین ایک بنگالی نژاد شاعر تھے۔ ان کی مادری زبان بنگلہ تھی۔ ان کی شاعری بنگلہ اور اردو دونوں میں ہیں۔ ان کے بنگلہ نظموں کے مجموعہ کا نام ہے ''پشپانجلی''۔ ان کی نظموں میں ایک فلسفہ ہے جو وحدت الوجود سے مشابہت رکھتا ہے۔ ان کی اردو نظم 'آرزو ناتمام' کے چند مصرع ملاحظہ ہوں

نہ میری کوئی صورت ہے، نہ میری کوئی سیرت
بشر کا نام ہے لیکن جمع نکتوں کی مورت ہے
خود اپنی غلطیوں کی ہر قدم پر کار فرمائی

فریب و مکر کی میری نگاہوں میں صداقت ہے
گمان و وہم ہیں میرے الجھے ہوئے
یہی ہے زندگی میری یہی حال وحقیقت ہے(۸)

بنگلادیش میں آج بھی جواردو شعراء باحیات ہیں اور اردو غزلیں ونظمیں لکھ رہے ہیں اور اپنی شاعری سے اردو دنیا کو روشن کر رہے ہیں ان میں احمد الیاس، جلال عظیم آبادی، شمیم زمانوی، صابر علی صابر، سید تقی محمد، سید ماجد اقبال، محمد عبدالسلام الحمیدی، اشرف الحق بابو، محمد عنایت اللہ صدیقی، ڈاکٹر رشید احمد خاطی، ڈاکٹر پروفیسر محمد محمود الاسلام، ڈاکٹر پروفیسر محمد غلام ربانی اور راقم الحروف حسین البناء کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۱)احمد الیاس

احمد الیاس فی الحال بنگلہ دیش کے زندہ شعراء میں ایک اہم نام ہے۔ اردو شاعری میں وہ اپنی جگہ نہایت انفرادیت کے مالک ہیں۔ اردو شعراء وہ بنگلہ دیش کے فی الحال سب سے بزرگ شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۳۴ء کلکتہ میں ہوئی۔ تقسیم کے بعد وہ ڈھاکا آئے۔ اور ابھی یہیں مقیم ہیں۔ احمد الیاس بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ مگر شاعری کی متعدد اصناف پر ان کے کارنامے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ ابھی تک ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ بنگلہ دیش کی اردو داں حضرات ان کی شاعری سے مستفید ہوتے آرہتے ہیں۔ ان کی شاعری قارئین کے دلوں میں ایک پرسکون فضا پیدا کر دیتی ہے۔ انداز بیان میں بے تکلفی اور سادگی ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

سچ بولو کہ سچ کہنا آسان بہت ہے
سچائی کے چہرے کی پہچان بہت ہے
جس بستی میں بچے شور مچاتے تھے
اس بستی کو بھی دیکھا سنسان بہت ہے
تنہائی کی کھوج میں دنیا ساتھ چلی
سوچا تھا تنہا رہنا آسان ہے(۹)

(۲) جلال عظیم آبادی

جلال عظیم آبادی کا پورا نام سید جلال الدین احمد۔ لیکن ادبی دنیا میں جلال عظیم آبادی کے نام سے وہ مشہور ہیں۔ ان کی پیدائش ۱۹۵۲ء ڈھاکہ میں ہوئی۔ وہ بنگلہ دیش کے ایک معروف و مشہور اردو شاعر ہیں۔ شاعری ان کا ذوق نہیں، فطرت ہے۔ شاعری ان کو ورثہ میں ملی۔ ان کی شاعری میں حب الوطن، عشق و عاشقی، محبت، سیاسی کشمکش کے مضامین نمایاں ہیں۔ ابھی تک ان کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ن کا شعری مجموعہ 'کہکشاں' کی نظم۔ حب الوطن کے چند سطریں ملاحظہ ہوں

میں اس دیش میں رہتا ہوں جس کا ڈھنگ انوکھا ہے
میرا پیارا وطن جیسے کوئی جنت کا ٹکڑا ہے
ہوائیں سرسراتی ہیں گویا گنگناتی ہیں
فضائیں کیف کی مستی میں آکر جھوم جاتی ہیں (۱۰)

(۳) سید تقی محمد

ان کی پیدائش ۱۹۵۴ء ڈھاکہ میں ہوئی۔ ان کے آبا و اجداد مرشد باد سے آئے تھے۔ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی مرحومہ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کے سگے بھائی ہیں۔ پہلے وہ افسانہ لکھتے تھے پھر شعر و شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ آج کل کثرت بیماری کی وجہ سے ان کے لکھنے پڑھنے کی رفتار کافی سست پڑ گئی ہے۔ ان کی شاعری میں انقلاب کا ایک جذبہ ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

زحمت دید بھی بدنام نہ ہوگی مجھ سے
آنکھ بالائے بام نہ ہوگی مجھ سے
غیرت و شرم پس چلمن مژگاں رکھئے
شہرت قصۂ گلفام نہ ہوگی مجھ سے

(۴)ہیکل ہاشمی

محمد مصطفیٰ ہیکل ہاشمی ترقی پسند معروف ومشہور شاعر مرحوم نوشاد نوری کے بیٹے ہیں۔ وہ بنگلہ اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ شاعری ان کو ورثے میں ملی ہے۔ ان کی شاعری میں پر تکلف الفاظ کا استعمال زیادہ ہے۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

زندگی میں جو ایک ہے سناٹا
وقت نے بھی اسے کہاں پاٹا
زیست کا درد، تیرا سرمایہ
ہم نے بے وجہ اس کو کب بانٹا(۱۱)

(۵)اشرف الحق بابو ساگر

اشرف الحق بابو ساگر کی پیدائش ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ ان کے والد بہار سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، فی الحال وہ سید پور میں مقیم ہیں۔ وہ ایک شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر منتظم بھی ہیں۔ ان کے زیر اہتمام کئی انجمنیں بھی چلتی ہیں۔ وہ بنگلہ اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ ان کا انداز بیان سادہ اور تکلفات سے خالی ہے۔ ان کا دل غربت اور مفلسی میں مبتلا لوگوں کے لیے روتا ہے۔ شاعری کی متعدد اصناف پر ان کے کارنامے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ فٹ پاتھ پر لیٹے ہوئے اور ظلم وستم برداشت کرنے والے لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں

رات کتنی سہانی ہے فٹ پاتھ پر
چاند کی حکمرانی ہے فٹ پاتھ پر
آج کی رات مزدور سوئیں کہاں
آج بارش کا پانی ہے فٹ پاتھ پر(۱۲)

(۶) محمد عبدالسلام حمیدی

محمد عبدالسلام حمیدی کی پیدائش ۱۹۶۹ء میں سید پور میں ہوئی۔ اردو اور بنگلہ دونوں زبانوں پر ان کی مہارت ہے۔ وہ بنگلہ تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ ان کی غزل مقبول عام ہوئی۔ جیسا کہ وہ کہتے ہیں

جانے کیوں اس کی جدائی میں تڑپ اٹھا ہوں میں
جانے والے سے تو کوئی میرا رشتہ بھی نہ تھا
لوگ کہتے ہیں جو بوو گے وہی کاٹو گے تم
میں نے کاٹا ہے وہی جو کبھی بویا بھی نہ تھا (۱۳)

(۷) سید ماجد اقبال

سید ماجد اقبال کی پیدائش ۱۹۷۱ء میں ہوئی۔ ان کے والد پٹنہ سے سید پور آئے تھے۔ ان کی شاعری حقیقت پسندی اور صاف گوئی پر مبنی ہے۔ ان کے خیالات میں پیچیدگی نہیں، وہ سادگی وصفائی سے اپنی باتیں قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ ماجد کے اشعار سے ایک نمونہ کلام پیش خدمت ہے۔

احساس کی نظروں سے پرکھو تو مجھے جانو
کیا میری بلندی ہے کیا مجھ میں ہے گہرائی
ہمارے دل پہ قیامت تو کب ٹوٹ چکی
ہم اور خاک قیامت کا انتظار کریں (۱۵)

(۸) شمیم زمانوی

پورا نام شمیم احمد خان۔ لیکن وہ شمیم زمانوی کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ فی الحال بنگلہ دیش کے مشہور اردو شعراء میں ایک ہیں۔ ان کے مرحوم والد کا نام محمد اسرائیل خان ہے۔ شمیم زمانوی ۱۵ دسمبر ۱۹۵۰ میں پیدا ہوئے۔ شعر گوئی کی ابتدا ۱۹۶۵ میں ہوئی۔ شمیم زمانوی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ فی الحال بنگلادیش کے بہت سارے نئے شاعران سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ ایک نظم نگار ہیں اور ساتھ ساتھ غزل گو بھی ہیں۔

ان کی ثلاثیات بھی بڑی مقبول عام ہوئیں۔ان کی ایک غزل سے کچھ اشعار درج ذیل ہیں:

خود اپنی نمائش کو تماشا نہیں کہتے
ہر چارہ گر وقت کو عیسی نہیں کہتے
اک ہم کہ برا خود کو سمجھتے ہیں بروں سے
اک تم ہو کہ اچھوں کو بھی اچھا نہیں کہتے (۱۶)

(۹)عنایت اللہ صدیقی

پورا نام عنایت اللہ صدیقی ہے۔ان کے والد بہار سے ڈھاکہ آئے تھے۔ان کی پیدائش ۱۹۸۶ء میں ڈھاکا میں ہوئی۔اس اعتبار سے وہ بنگلادیش کے کم عمر شاعروں میں سے ایک ہیں۔وہ ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ماسٹرز کیا اور نمبر اول ہونے کی وجہ سے انہیں زرین تمغے سے نوازا گیا۔وہ غزل بھی لکھتے ہیں اور نظم بھی۔انداز بیان بہت سادہ اور سلیس ہے۔وہ اپنے گردوپیش کے حالات سے باخبر ہیں۔راقم الحروف بھی ان سے اپنی اردو شاعری کی اصلاح لیتا ہے۔ان کے اشعار میں زندگی کی تصویریں اور معاشرے کی جھلکیاں دیکھی جاتی ہیں۔جیسا کہ وہ خود اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

لہجے میں متانت ہے تو سمجھو عنایت ہے
اسلوب میں ندرت ہے تو سمجھو عنایت ہے
آتے ہیں نظر بھیڑ میں بھی وہ تنہا
الفاظ میں جدت ہے تو سمجھو عنایت ہے۔(۱۶)

علاوہ ازیں ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اساتذہ میں شعراء کی حیثیت سے پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، ڈاکٹر رشید احمد خاطی اور راقم الحروف کے نام قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام دراصل ایک محقق ہیں۔ابھی تک ان کی کئی تحقیقی کتابیں شائع ہوچکیں ہیں۔ تحقیق کے ساتھ ساتھ وہ کبھی کبھار شاعری بھی کرتے ہیں۔ان کا انداز بیان بہت سادہ اور سلیس ہے۔ان

کی شاعری متعدد اصناف سخن سے متصف ہے۔ زبان میں اتنی صفائی ہے کہ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات ان کی نہیں کسی اہل زبان کی ہے۔ بنگلا اپنی مادری زبان ہونے کے باوجود ان کی اردو کافی حد تک صاف ہے۔ عشق، گیت، تنہا، فہم تو، نصیب اور آرزو ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ ان کی نظم 'عشق' سے چند سطریں ملاحظہ ہوں:

عشق وہ ایک آگ ہے جو جلتا ہے مگر بجھتا نہیں
عشق وہ طاقت ہے جو چلتا ہے مگر ہٹتا نہیں
عشق وہ جوش ہے جو ابلتا ہے مگر ٹھہلتا نہیں
عشق وہ چاہت ہے جو اپناتا ہے مگر چھیڑتا نہیں۔

راقم الحروف یعنی میں خود بھی شعبۂ اردو کے ساتھ ۲۰۱۲ء سے منسلک ہوں۔ ابھی تک میری چودہ بنگلا کتابیں شائع ہوئیں۔ جن میں چھ کتابیں تحقیقی ہیں۔ دہشت گردی کے خلاف میری چند نگارشات نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ بنگلہ، اردو اور عربی زبان میں بھی الحمدللہ میری شاعری موجود ہے۔ میری بنگلہ شاعری کی کتاب 'کبر سات کہون' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ میری شاعری کے اکثر مضامین بنگلہ دیش کی جنگ آزادی، تحریک زبان اور اتحاد قومیت پر مشتمل ہیں۔ جنگ آزادی کے ایک دردناک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میری نظم کے چند سطریں پیش خدمت ہیں:

ماں کا لاڈلا اپنا آزاد
مسکراتے ہوئے ماں سے بولا
کل بھات لیکے آنا ماں
ایک زمانہ ہوا بھات نہ کھائے ہوئے... گرم بھات

بنگلا دیش میں جو شعراء اردو میں شعر و شاعری کرتے ہیں وہ اردو سے محبت رکھتے ہوئے یہ خدمات انجام دے رہے ہیں اگر غیر جانبدارانہ نظر سے دیکھا جائے تو ان کے اشعار دنیا کے کسی بھی شعر و شاعری سے کم

نہیں بلکہ بہتر ہیں۔ مگر صد افسوس کہ ان کے اشعار میں اکثر و بیشتر مسودہ کی حیثیت سے رہ جاتے ہیں۔ غربت و مفلسی ان اشعار کو کتابی شکل دینے میں مانع بن جاتی ہے۔ ان شعراء کے اشعار کو ہمیں حفاظت کرنی چاہئے۔ ورنہ گردش زمانہ میں یہ سب گم ہو جائینگے۔

حوالہ جات

(۱) سید اقبال عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ڈھاکہ ۱۹۵۴ء، ص ۱۴۲۔

(۲) فیض احمد فیض، اظہار حسرت، ادارۂ ادب ہند، دہلی، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۔

(۳) احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۷۴۔

(۴) ایضاً ص ۷۵۔

(۵) ایضاً ص ۷۷۔

(۶) ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلا دیش میں اردو، اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵ء، ص ۹۰۔

(۷) احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ص ۷۸۔

(۸) ایضاً ص ۸۷۔

(۹) احمد الیاس، عذاب آگہی، اینما ڈیزائن اینڈ آفسٹ پریس، ڈھاکہ، ص ۲۱۔

(۱۰) جلال عظیم آبادی، کہکشاں، جوئل فوٹو کاپی کارنر، ڈھاکہ، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۲۔

(۱۱) احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، ص ۹۹۔

(۱۲) ایضاً ص ۱۰۰

(۱۳) ایضاً ص ۱۰۲۔

(۱۴) ایضاً ص ۱۰۲۔

(۱۵) ایضاً ص ۱۰۴۔

(۱۶) فکر و تحریر، کولکاتا، جنوری تا مارچ ۲۰۱۸، ص ۱۰۔

اکیسویں صدی کے اردو ناولوں میں موضوعاتی تنوع: ایک مطالعہ

تبسم حسن*

موجودہ صدی میں ناول جس رفتار کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اس وجہ سے اس صدی کو 'ناول کی صدی' کہنا غلط نہ ہوگا۔ عصر حاضر میں بہت سارے ایسے ناول تخلیق کیے گئے ہیں جن میں نت نئے موضوعات پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ موجودہ دور کے ناولوں میں زندگی اور معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عہد حاضر کے ناول نگاروں نے سلگتے ہوئے مسائل اور غور طلب موضوعات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ اس وجہ سے دور حاضر کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکیسویں صدی میں کئی ایسے ناول لکھے گئے ہیں جن میں مختلف اور منفرد موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔ آج کا فرد جہاں ایک طرف سائنس اور ٹیکنالوجی سے فائدہ حاصل کر رہا ہے وہیں دوسری سمت وہ ذہنی انتشار، نفسیاتی الجھن، تنہائی اور اکیلے پن کا شکار ہے۔ دور حاضر کے انسان کو جہاں ایک طرف زندگی کی ساری آسائشیں میسر ہیں وہیں دوسری طرف وہ فریسٹریشن اور ذہنی وجسمانی ناآسودگی کا شکار ہے۔ اکیسویں صدی کے ناولوں میں ان تمام موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں میں نے جن ناولوں کا انتخاب کیا ہے ان میں نیلوفر کا ناول 'آوٹرم لین'، صادقہ نواب سحر کا 'جس دن سے'، شائستہ فاخری کا 'نادیدہ بہاروں کے نشان'، غضنفر کا 'شوراب'، اور مشرف عالم ذوقی کا 'پوکے مان کی دنیا' شامل ہیں۔ یہ تمام ایسے ناول ہیں جن میں نئے اور اچھوتے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔

آوٹرم لین نیلوفر کا ایک خوبصورت ناول ہے۔ مصنفہ نے اس میں ایک الگ اور منفرد موضوع

*پی ایچ۔ڈی ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، بھارت

پر بات کی ہے۔اس ناول میں یہ موضوع پیش کیا گیا ہے کہ یو۔پی۔ایس۔سی (civil services) میں آنے کے لئے طلباء کو کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، کتنی پریشانیوں اور دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کوچنگ سینٹروں کا پھیلتا ہوا جال کس طرح سے طلباء کو سبز باغ دکھا کر گمراہی کے راستے پر ڈھکیل دیتا ہے اور اس طرح سے معصوم طلباء کا استحصال ہو جاتا ہے۔یہ ادارے طلباء کو جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا سکھاتے ہیں اور پھر جب انکے یہ خواب ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں تو وہ غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ان کوچنگ سینٹروں کا مقصد صرف اور صرف طلباء سے پیسے لوٹنا ہوتا ہے جیسا کہ اس ناول کے کرداروں زبیر اور وریندر کے ساتھ ہوتا ہے۔اس حوالے سے ناول کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''زبیر۔تم کو کیا لگتا ہے۔یہ ککورمتوں کی طرح پھیلتے ہوئے کوچنگ انسٹی ٹیوٹ کسی کو گائڈینس دیتے ہیں۔یہ تو صرف گمراہ کرتے ہیں گمراہ (غصے سے اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں) امتحان قریب آنے تک اپنی کوچنگ میں بھیڑ بھاڑ بنائے رکھنے کا دکھاوا کرنے میں یہ بچوں کا career برباد کر دیتے ہیں۔نوٹس کے پیکٹ کا کھلا مارکیٹ ان کے بزنس کا ایک حصہ ہے نہ کہ کسی کی نوکری کی ضمانت۔اگر ہم نوٹس سے ہی I.A.S. بن جائیں تو پھر کوچنگ میں داخلہ کیوں لیتے ہیں۔ورکشاپ میں اپنی قابلیت، گائڈنس و بہتر strategy کا دکھاوا کر کے یہ students کو پھانس لیتے ہیں۔اور جب تک اس کو ان کوچنگوں کے جال میں اپنی حالت سمجھ میں آتی ہے تب تک وہ اپنا چانس کھو چکا ہوتا ہے۔اور سوائے ان کی کوچنگون کا دلال بننے کے اس کے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا''۔[۱]

عصر حاضر کے سماج کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ والدین ہی بچوں کا مستقبل طے کر لیتے ہیں۔وہ اپنے بچوں کی صلاحیت اور دلچسپی کو قطعاً اہم نہیں سمجھتے۔ماں باپ کے خواب کو پورا کرنے کے لئے بچے جدوجہد تو کرتے ہیں اور کچھ اس عمل میں کامیابی سے ہمکنار بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر کو ناکامی کا سامنا کرنا

پڑتا ہے۔اس ناول کے کردار ورییندر اور نشا کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ان کے والدین کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ آئی۔اے۔ایس افسر بن جائیں۔البتہ نشا اس میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے لیکن ورییندر اور اس جیسے کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں یہ کامیابی حاصل نہیں کر پاتے اور ان کا انجام پھر خوف ناک اور کرب انگیز ہوتا ہے۔

خوشنودہ نیلوفر نے رشوت خوری کے مسئلے پر بھی ناول میں خامہ فرسائی کی ہے۔عہد حاضر میں رشوت خوری سماج میں ایک ناسور بن کر ابھر رہی ہے۔رشوت خوری کی وجہ سے لوگ ناانصافی کے شکار ہو جاتے ہیں۔رشوت کی ہی بدولت نااہل لوگ ملک کے معزز عہدوں پر فائز ہیں اور اس کے برعکس قابل اور با صلاحیت لوگ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔اس سماجی نظام کو تبدیل کرنے کی اشد ضرورت ہے تب ہی اس ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

رواں صدی کا ایک اور دلچسپ ناول صادقہ نواب سحر کا ''جس دن سے'' ہے اس ناول میں مصنفہ نے کئی اہم موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔انھوں نے ایک متوسط طبقے کو اس ناول میں پیش کیا ہے اور یہ بات ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ جب خاندان ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں تو ان کے بچوں کی نفسیات کس طرح متاثر ہو جاتی ہے۔یہ عصر حاضر کا ایک اہم اور توجہ طلب موضوع ہے۔دراصل یہ ناول ایک کثیر الجہات ناول ہے۔اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔دور حاضر کے ان مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔اس ناول میں بچوں کی طرف ماں باپ کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کو دکھایا گیا ہے۔ناول میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ آج کے مادہ پرستی کے دور میں انسان بہت لالچی اور مطلبی بن گیا ہے۔اس کو جہاں اپنا مطلب اور فائدہ دکھائی دیتا ہے وہاں وہ تعلقات استوار کرنے کوشش کرتا ہے۔ناول میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جنسی پیاس بجھانے کی خاطر لوگ ہر روز نئے نئے رشتے بنا لیتے ہیں۔لوگ آئے دن رشتے بدلتے رہتے ہیں۔جہاں لوگوں کو جنسی طور پر تسلی و تسکین میسر نہیں ہوتی وہاں سے وہ لاتعلقی اختیار کر لیتے ہیں اور دوسرے رشتے کے متلاشی ہوتے ہیں۔مصنفہ نے اس ناول میں یہ حقیقت بھی ظاہر کی ہے کہ آج کے مشینی دور میں

انسان کتنا بے حس ہو گیا ہے، اسے رشتوں کی قدر ہی نہیں ہے۔ اس ٹیکنالوجی کے دور میں انسان کے آس پاس بہت سارے لوگ موجود ہیں لیکن وہ اس بھیڑ میں خود کو اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ ان سارے مسائل کو مصنفہ نے کامیابی کے ساتھ اس ناول میں پیش کیا ہے۔ وہ ان موضوعات کے ساتھ انصاف کرنے میں پوری طرح سے کامیاب نظر آتی ہیں۔ ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ صادقہ نواب سحر اس ناول میں عہد حاضر کی صحیح عکاسی کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ سکتے ہیں کہ ناول نگار نے زندگی کی جن حقیقتوں کو اس ناول میں پیش کیا ہے وہ اس میں بجا طور پر کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ یقیناً اس ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری محظوظ ہوگا۔

شائستہ فاخری کا ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کا یہ ناول ادب کی دنیا میں اپنے منفرد موضوع کی وجہ سے کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس میں عورت کی لاچاری، استحصال، مظلومیت، بے بسی اور قربانی کو پیش کیا گیا ہے۔ مصنفہ نے اس ناول میں حلالہ کے موضوع پر جرأت مندانہ اور بے باکانہ انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔ ناول میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اگر خطا مرد سے سرزد ہوتی ہے تو اس کی سزا بھی عورت کو ہی ملتی ہے۔ اس ناول کے مرکزی کردار علیزہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ اس کا شوہر شک کی بنیاد پر اور جنون میں آ کر اسے طلاق دے دیتا ہے اور پھر اپنے ہی بھائی اعیان کے ساتھ حلالہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ علیزہ سے ایک بار بھی اس کی رائے نہیں پوچھی جاتی کہ وہ اس عمل کے لیے رضامند ہے بھی یا نہیں۔ وہ دو مردوں کے بیچ ایک کٹھ پتلی بن کر رہ جاتی ہے جب جو چاہے اس کے ساتھ کھیل کر چلا جاتا ہے۔ اس کا جیسے اپنا کوئی وجود، کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ آخر کار علیزہ فیصلہ لے کر مردوں کے چنگل سے خود کو آزاد کر کے آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتی ہے۔ شائستہ فاخری نے اس موضوع کو بڑے ہی خوبصورت اور دلچسپ انداز میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ انھوں نے عام فہم زبان اور موثر انداز بیان استعمال کر کے اس ناول کو قاری کے لیے باعث کشش بنایا ہے۔ ناول نگار نے زندگی کے تلخ حقائق کا دلچسپ پیرائے میں اظہار کیا ہے۔ گوپی چند نارنگ ان کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''شائستہ فاخری نے زندگی کے سچ کو اتنے مختلف النوع جہتوں سے پیش کیا ہے کہ یقین نہیں ہوتا ہمارے معاشرے کا سچ کتنی ملاوٹوں کے ساتھ بر سر پیکار ہے۔موضوعات کے انتخاب میں شائستہ فاخری نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ان کے اسلوب میں ایسی پختگی اور اظہار بیان میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسرے معاصر لکھنے والیوں (چند ایک کو چھوڑ کر) سے ان کو ممتاز کرتی ہیں۔ ۲

اس ناول میں جدید ٹیکنالوجی سے ملنے والے فوائد کی طرف بھی قاری کی توجہ مرکوز کی گئی ہے ۔جدید ٹیکنالوجی نے جہاں دنیا کو حیرت میں ڈال دیا ہے وہیں اس کے مثبت نتائج سے لوگ اطمینان کا اظہار بھی کر رہے ہیں کیونکہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے وہ کام بھی ممکن ہو پایا ہے جس کا انسان نے آج تک تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس ناول کا موضوع اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں روایتی عورت کو پیش نہیں کیا گیا ہے جو مرد کے ظلم وستم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کر رہی تھی بلکہ اس میں جدید دور کی خوددار اور جرأت مند عورت کو دکھایا گیا ہے جو مرد کے ظلم وزیادتی اور وحشیانہ برتاو کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکتی بلکہ ناانصافی، ظلم اور استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی ہے۔اسی سبب بھی ناول کا موضوع اچھوتا اور منفرد بن گیا ہے۔

غضنفر کا ناول 'شوراب' بھی دور حاضر کا ایک اہم ناول ہے۔اس میں بھی ایک اہم اور مختلف موضوع کو قلمبند کیا گیا ہے۔عہد حاضر کے پڑھے لکھے نوجوانوں کو جو پریشانیاں اور دشواریاں پیش آتی ہیں مصنف نے ان کی صاف اور شفاف طور پر ناول میں عکاسی کی ہے۔ناول نویس نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ موجودہ دور کے نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود بھی روزگار حاصل کرنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔انہیں اپنے ملک میں روزگار کے مواقع فراہم نہیں کیے جاتے جس کے سبب وہ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔پیٹ کی آگ بجھانے، اپنی ذمہ داریوں اور اپنے عزیزوں کی خواہشات کی تکمیل کے لیے وہ خلیجی ممالک میں نوکری کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔وہاں انہیں ان کی

تعلیم اور قابلیت کے مطابق نوکری فراہم نہیں کی جاتی بلکہ نامعقول اور نامناسب نوکری کرنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے جس وجہ سے ان نوجوانوں کو لاتعداد جسمانی اور ذہنی اذیتوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ناول نگار نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہوئے قاری کی توجہ مبذول کرائی ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کوئی قدر رہی نہیں ہے۔ وہ تلاش معاش کے لیے دربدر پھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس کم پڑھے لکھے یا ان پڑھ لوگ ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کو زندگی کے تمام آرام و آسائشیں میسر ہیں۔ دوسری طرف اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے ذہین نوجوان ہر لمحہ ذہنی انتشار اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ انھیں زندگی کا کوئی سکھ اور مسرت و شادمانی نصیب نہیں ہوتی۔ ہر سال ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ دیتے وقت اس بات کو مدنظر نہیں رکھا جاتا کہ کل کو جب یہ طالب علم تعلیم حاصل کر کے یونیورسٹی سے فارغ ہو جائیں گے تو روزگار کی کوئی سبیل یا ذریعہ انھیں فراہم ہوگا بھی کہ نہیں اور پھر ہوتا بھی یہی ہے کہ ان تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو رزق کی تلاش میں اپنوں سے دور بیرونی ممالک کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ اپنے وطن اور عزیز و اقارب کی دوری انھیں ہر لمحہ اذیت پہنچاتی رہتی ہے۔ وہ اپنے وطن لوٹ آنے کے خواہش مند بھی ہوتے ہیں لیکن اپنی اور اپنے عزیزوں کی ضروریات وخواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ خود کو زہر کا یہ گھونٹ پینے کے لیے مجبور و بے بس پاتے ہیں۔ ناول میں ایک مرکزی کردار شیبا ہے۔ وہ اردو میں ایم۔ اے پاس ہوتی ہے۔ اس کی بھی بہت ساری خواہشات ہوتی ہیں۔ وہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن اس کے گھر والے اس کی شادی بابو جان سے کر دیتے ہیں جو کہ کسی بھی انداز سے شیبا کے قابل نہیں ہوتا لیکن شیبا کے گھر والے اس کی شادی بابو جان سے یہ سوچ کر کر دیتے ہیں کہ وہ بہت دولت مند گھرانے کا بیٹا ہے اور شیبا وہاں رانی بن کر سب پر راج کرے گی۔ شیبا کی تعلیم اور تمناؤں کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اس کے والدین یہ نہیں سوچتے کہ کیا وہ وہاں اپنے ان پڑھ شوہر اور سسرال والوں سے ہم آہنگ ہوگی بھی کہ نہیں۔ وہ صرف اس کی شادی کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں لیکن شیبا کو عمر بھر بہت ساری تکالیف اور ذہنی اذیتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ یہاں پر ناول نگار نے یہ خیال ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ کیا والدین کا فرض

صرف اتنا ہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو تعلیم دے کر اسے ایک دولت مند گنوار آدمی کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور کر دیں۔ کیا ایک لڑکی کی اپنی خواہشات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ کیا ایک لڑکی اس کی حقدار نہیں ہوتی کہ اسے اپنے لائق شوہر کی خواہش کرنی چاہیے۔ کیا اس کے پیٹ کی ضرورت کے سوا اس کی کوئی اور ضرورت نہیں ہوتی جو پوری ہونی چاہیے۔ شیبا کو اپنے سسرال میں پیٹ پالنے کے لیے ہر چیز میسر ہوتی ہے۔ ہر طرح کی سہولت ملتی ہے لیکن وہ وہاں کبھی بھی ذہنی طور پر سکون حاصل نہیں کر پاتی۔ پیٹ کے بغیر اس کی باقی ساری خواہشات اور ضروریات ہمیشہ تشنہ ہی رہتی ہیں۔ اگر اس کے ماں باپ نے اس کی شادی کرنے میں صبر سے کام لیا ہوتا تو شاید شیبا کو اپنے لائق شوہر مل جاتا جو شیبا اور اس کی تعلیم کی عزت اور خیر مقدم کرتا لیکن اس کے والدین نے جلد بازی سے کام انجام دیا اور اپنے فرض سے دستبردار ہوئے لیکن ان کی جلد بازی کا خمیازہ شیبا کو زندگی بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ موجودہ دور میں لوگوں کی قابلیت اور صلاحیت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اس دور میں ہر کوئی پیسے کو ہی خدا تصور کرتا ہے اور پیسے کو انسان کی قابلیت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس رشوت کے لیے پیسے نہیں ہوتے یا سفارش نہیں ہوتی وہ روزگار حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ شاداب جو کہ ناول کا ایک اور مرکزی کردار ہے بھی اسی سب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کے پاس بھی رشوت اور سفارش نہیں ہوتی اسی وجہ سے وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود بھی نوکری حاصل نہیں کر پاتا۔ حالانکہ وہ ہر طرح سے نوکری حاصل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے لیکن پھر بھی وہ ناکام رہ جاتا ہے۔ ناول نگار نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں ان تمام باتوں کو قاری کے روبرو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ موجودہ دور کے سماج و معاشرہ کی صحیح و سچی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مصنف نے ناول میں دلچسپ اسلوب بیان اپنا کر قاری کو محظوظ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور وہ بلاشبہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

دور حاضر کا ایک اور معروف ناول مشرف عالم ذوقی کا 'پو کے مان کی دنیا' ہے۔ یہ ناول اپنے اچھوتے موضوع کے اعتبار سے ایک اہم ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں جدید ٹیکنالوجی کے مضر اثرات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جدید

ایجادات مثلاً ٹی۔وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویڈیو گیمس وغیرہ کیسے بچوں سے ان کا بچپن چھین رہے ہیں۔ان آلات کے سبب بچے اپنی عمر سے بہت آگے نکل گئے ہیں اور ان سے ایسے جرم سرزد ہو رہے ہیں جن کی ان سے توقع نہیں کی جاسکتی۔ناول نگار نے ساتھ ہی اس بات کا انکشاف بھی کیا ہے کہ جو غلطیاں موجودہ دور کے بچوں سے سرزد ہو رہی ہیں اس میں ان کا کوئی قصور نہیں بلکہ اس سب کے لیے ان کے والدین ذمہ دار ہیں کیوں کہ ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح تربیت کریں اور انھیں ان ایجادات کے مثبت اور منفی اثرات سے روشناس کرا سکیں۔کمپیوٹر کی تعلیم جتنی تیزی سے عام ہوتی جا رہی ہے اتنی ہی تیزی سے سائبر کرائم بھی جنم لے رہے ہیں۔سوشل میڈیا، ٹی۔وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ویڈیو گیمس وغیرہ کی وجہ سے دور جدید کے بچوں میں برق رفتاری سے اخلاقی گراوٹ کے آثار آشکار ہو رہے ہیں۔ان سب چیزوں نے معصوم بچوں کے دل و دماغ پر قبضہ جما لیا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ وحشیانہ جرائم انجام دینے پر ذرا بھی نہیں کتراتے جیسے اس ناول کا ایک کردار بارہ سال کا 'روی کنچن' اپنے گھر میں فحش فلمیں اور ویڈیوز دیکھتا ہے اور اپنی ہم عمر لڑکی 'سونالی' کا جنسی طور پر استحصال کر بیٹھتا ہے۔وہ بچہ جب گرفتار ہوتا ہے اور اس سے اس کے جرم کے بارے میں پوچھ گچھ کی جاتی ہے تو اس کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس نے کیا جرم کیا ہے۔روی اور سونالی جب جنسی تعلق بنا لیتے ہیں تو وہ اس کو ایک کھیل سمجھ کر انجام دیتے ہیں۔سنیل کمار رائے جو کہ پیشے سے ایک جج ہوتا ہے روی کا کیس اس کے سپرد ہوتا ہے لیکن فیصلہ سنانے سے پہلے ہی اس سے یہ مقدمہ لے لیا جاتا ہے لیکن وہ خواب اور بے خوابی کی حالت میں اپنا فیصلہ کچھ اس طرح سے سناتا ہے:

> ''روی کنچن بے قصور ہے۔اور اس پورے معاملہ کا اس سے کوئی سروکار نہیں۔ایک چھوٹے سے پوکے مان کی غلطی کو نظر انداز کرنے میں ہی ہم سب کی بھلائی ہے۔لیکن اس کے باوجود کوئی نہ کوئی مجرم ضرور ہے اور جو مجرم ہے، اسے سخت سے سخت سزا تو ملنی ہی چاہئے۔اس لیے۔۔۔۔۔
>
> میں پورے ہوش و حواس میں یہ فیصلہ سناتا ہوں کہ تعزیرات ہند 'دفعہ 302 کے تحت ۔۔۔میں اس ٹیکنالوجی، ملٹی نیشنل کمپنیز، کنزیومر ورلڈ اور گلو

بلائزیشن کو سزائے موت کا حکم دیتا ہوں۔۔۔۔۔ ہینگ ٹل ڈیتھ۔'' ۳

ایک اور حساس مسئلہ جو عہد حاضر کے معاشرہ میں تیزی سے ابھر رہا ہے وہ یہ ہے کہ آج کل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شادی سے قبل Live in relationship میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ناول میں اس بات پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس ناول میں موجودہ سماج و معاشرہ کی سچی اور ہو بہو تصویر کشی کی گئی ہے۔ فنکار نے نہایت ہی دلچسپ انداز میں قاری کو ان مسائل سے روشناس کیا ہے جن سے ہمارا سماج جوجھ رہا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کے مضر اثرات جس طرح سے معصوم بچوں کے ذہن پر مسلط ہو رہے ہیں اور جس طریقے سے ان کا بچپن برباد کر رہے ہیں ،ان سب باتوں کو ناول نگار نے نہایت ہی فنکارانہ اور پر اثر اسلوب میں قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

ان سب ناولوں کے علاوہ بھی عصر حاضر میں بہت سارے ایسے ناول تخلیق کیے گئے ہیں جن میں ہمیں موضوعاتی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسے کئی سارے ناول لکھے گئے ہیں جن میں ایسے مسائل کو پیش کیا گیا ہے جن سے آج کا انسان متصادم ہے۔ مثلاً کہانی کوئی سناؤ متاشا (سادقہ نواب سحر) مورتی (ترنم ریاض) بکھرے اوراق (عبدالصمد) ایک ممنوعہ محبت کی کہانی (رحمان عباس) جانے کتنے موڑ (آشا پربھات) اگنی پرکشا (کشمیری لال ذاکر) دروازہ ابھی بند ہے (احمد صغیر) اندھیرا پگ (ثروت خان) وغیرہ۔ یہ سارے ایسے ناول ہیں جن میں ان مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے جو موجودہ معاشرے میں پنپ رہے ہیں اور جن کا تدارک ناگزیر ہے۔ حالیہ دور کے ناولوں کی ایک اہم بات یہ ہے کہ ان میں بے باکانہ انداز اور دوٹوک الفاظ میں ان مسائل کو پیش کیا گیا ہے جو سماج کے لیے ایک خطرہ بن کر ابھر رہے ہیں اور ایک حساس قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں کہ ان مسائل کا سد باب کیسے ممکن بنایا جا سکے تاکہ ایک صحت مند اور ذمہ دار معاشرہ وجود میں آسکے۔ ان ناولوں کے ذریعے قاری کو عہد حاضر کے سیاسی، سماجی، معاشی و معاشرتی، اقتصادی اور مذہبی مسائل سے روشناس کرانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ ان تمام تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات میں مؤثر زبان و بیان اور پرکشش اسلوب اختیار کیا ہے اور

قاری کی طبیعت کو اپنی تخلیقات کی طرف مائل کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ رواں صدی کے اردو ناولوں میں ایسے موضوعات و مسائل کو پیش کیا گیا ہے جو غور طلب ہیں اور ایک ذمہ دار قاری کو جو کہ ایک ذمہ دار شہری بھی ہوتا ہے ذہن پر زور ڈالنے کے لیے مجبور کر دیتے ہیں کہ ان مسائل کا حل کیسے نکالا جا سکے اور موجودہ اور آنے والی تمام نسلوں کو ان مسائل سے نمٹنے کی قوت کیسے دلائی جائے۔ آخر پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ عہد حاضر کے ناولوں میں سماج و معاشرے کی صحیح اور سچی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ اردو ناول کا یہ کارواں آئندہ بھی یونہی ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا اور قاری کو مختلف اور منفرد موضوعاتی اور اسلوبیاتی تجربوں سے محظوظ کرتا رہے گا۔

حوالہ جات

۱۔ خوشنودہ نیلوفر، ''آوٹرم لین''، ص (۶۸۔۶۷)

۲۔ شائستہ فاخری، فلیپ پر درج، ''نادیدہ بہاروں کے نشان''

۳۔ مشرف عالم ذوقی، ''پوکے مان کی دنیا''، ص (۳۳۰)

۴۔ صادقہ نواب سحر، ''جس دن سے''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۶ء

۵۔ غضنفر، ''شوراب''، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۰۹ء

اکیسویں صدی میں اردو تنقید کی نئی فصلیں

ڈاکٹر تسلیم عارف*

الطاف حسین حالی سے اردو میں جس صنف نے شان و شوکت کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا، اس کی ترقی کی رفتار دیگر اصناف کے مقابلے زیادہ ہے۔ اس وجہ سے ہر دور میں نئے پرانے لکھنے والوں کا ایک قافلہ نظر آتا ہے۔(۱) کلیم الدین احمد نے اپنی مشہورِ زمانہ کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' میں مختلف مثالوں سے یہ بات واضح کی ہے کہ تنقید بہ ظاہر ایک ظالمانہ فعل نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں اس سے علم و ادب کو سنوارنے کا کام کیا جاتا ہے۔(۱) آج ہمارے ناقدین اصولی اور عملی دونوں جہات سے ادب کی تفہیم کے عمل پر کاربند ہیں جو کہ لائقِ تحسین بھی ہے لیکن کیا تنقید کی اس نئی نسل نے اپنے اگلے ناقدوں کے کام کو آگے بڑھایا؟ یا اُن کے معیار و مرتبے سے بڑھ کر یا مکھی پر مکھی بٹھانے سے آگے بڑھ کر کوئی ایسی لکیر کھینچنے کا کام کیا جو اُنھیں اگلے ناقدین سے امتیاز بخش سکے؟ یا کم از کم بزرگ ناقدین سے مختلف ایسا کوئی کام کیا جو واقعی اُن کی الگ پہچان قایم کر سکے؟ یہ دیکھنا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

موجودہ ادبی تنقید کی دو دہائیوں کا اگر بہ غور مطالعہ کیا جائے تو یہاں ہمیں تقریباً تین سے چار نسلیں ادبی متون کی تعبیر و تشریح اور تجزیے میں بہ یک وقت کارفرما نظر آتی ہیں۔ اگر ہمیں اکیسویں صدی کے گذشتہ دو دہائیوں کے تنقیدی سرمایے کا احتساب کرنا ہے تو پس منظر کے طور پر بزرگ ناقدین کے تنقیدی سرمایے کو فراموش کر دینا مناسب نہیں اور یہ زمانہ ۱۹۸۰ء کے آس پاس کے ناقدین کی تحریروں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو ادب میں مختلف ناقدین کی ایک پوری جماعت وجود میں آتی ہے جو مختلف اندازِ تنقید کے حامل ہیں۔

*اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جی ایل اے کالج، میدنی نگر، پلامو، جھارکھنڈ، ہندستان

عام طور سے 1980ء کے بعد مابعد جدید تنقید کا عہد تصور کیا جاتا ہے۔ فطری طور پر اس دوران جدیدیت کے علمبردار نقاد بھی سرگرم عمل رہے۔ مابعد جدیدیت کو اگر عہد کے ساتھ ساتھ ایک ادبی رویہ تسلیم کیا جائے تب کئی ایسے نقاد بھی سامنے آتے ہیں جن کی جدیدیت کے عہد میں کبھی پہچان قائم تھی، لیکن بعد میں وہ مابعد جدیدیت کی طرف بھی مڑ گئے۔ ایسے نقادوں میں گوپی چند نارنگ سب سے اہم ہیں۔ پہلے انھیں جدیدیت کا علمبردار سمجھا جاتا تھا لیکن 1980ء کے بعد وہ مابعدِ جدیدیت کے علم بردار بن گئے۔ انھوں نے مابعد جدیدیت کے اصول ونظریات کے سلسلے سے اپنے متعدد مضامین لکھے اور اصولی اور عملی دونوں انداز کی کتابیں پیش کیں جس کی وجہ سے اب انھیں اردو میں مابعدِ جدید رویّے کا نظریہ ساز مانا جاتا ہے۔ (۲)

گوپی چند نارنگ نے ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں'' کتاب سے اپنی تنقید نگاری کا آغاز کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے لسانیاتی مسائل پر چند مضامین لکھے۔ درمیانی مدت میں راجندر سنگھ بیدی پر ان کے مضمون 'بیدی کے افسانوں کی اساطیری کی جڑیں' سے ان کا ادبی نقاد کے طور پر مقام متعین ہوا۔ انتظار حسین کے سلسلے سے بھی انھوں نے بھرپور مضمون لکھا۔ بعد میں مابعد جدیدیت کے تعلق سے ان کی سب سے تفصیلی کتاب بعنوان ''ساخیات، پس ساختیات اور اردو شعریات'' سامنے آئی۔ اردو غزل اور ہندوستانی تہذیب اور بیسویں صدی میں اردو ادب جیسی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ غالب کو مابعدِ جدید فکری رویّوں سے انھوں نے پہچاننے کی کوشش کی۔

گوپی چند نارنگ نے خود کو ادبی انتظام کار کے طور پر پیش کر کے ادبی تنقید کے گہرے فرائض سے خود کو دور رکھا۔ بیدی اور فراق پر پہلے ان کے جس طرح کے گہرے مضامین آئے تھے، بعد میں ویسی کوئی صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ گذشتہ برسوں میں ان کی جو کتابیں شایع ہوئی ہیں، اُن میں تنقید کی درّاکی کا کوئی ثبوت تلاش کرنا مشکل ہے۔ مابعد جدیدیت کے تعلق سے ان کے مضامین اور کتابیں بھی شدید اعتراضات کا حملہ جھیل رہی ہیں۔ نارنگ کی زبان بہت سجی دھجی اور پر اثر ہے جس کا وہ اپنی تقریروں میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک زمانے تک نقاد کی حیثیت سے گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی کی حیثیت ادبی مقابل کی طرح تھی، لیکن

شمس الرحمٰن فاروقی نے نہایت سنجیدگی سے ادبی نقاد کے منصب کو سمجھا اور اپنی تحریروں پر گہری توجہ رکھی۔ یہ کام نارنگ انجام نہیں دے سکے جس کی وجہ سے ان کی شہرت کے مقابلے ان کا ادبی کارنامہ موافق نہیں ہے۔

مابعد جدید نقادوں میں گوپی چند نارنگ کے ساتھ ساتھ وہاب اشرفی کا شمار ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی بھی پہلے جدیدیت کے ساتھ تھے، بعد میں مابعد جدیدیت کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ وہاب اشرفی کی شہرت ''تاریخ ادبیات عالم'' کی وجہ سے ہوئی جس کی آٹھ جلدوں میں انھوں نے دنیا کی قابل ذکر زبانوں کا تعارف کرایا تھا۔ غیاث احمد گدی پر انھوں نے مضمون لکھ کر یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ بہترین تجزیاتی نقاد ہیں۔ لیکن ایسے مضامین ان کے یہاں محدود تعداد میں ملیں گے۔ پچھلے دنوں انھوں نے اردو زبان وادب کی تین جلدوں میں تفصیلی تاریخ لکھی۔ مارکسزم اور مشرق ومغرب میں شعریات کے تصور پر ان کی کتابیں بہت اہتمام سے شائع ہوئی ہیں۔ اس کے پہلے مابعد جدیدیت پر وہ 'مابعدِ جدیدیت: مضمرات وممکنات' نام سے کتاب پیش کر چکے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے قاضی عبدالودود اور مجروح سلطان پوری پر ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے متفرق مضامین کے مجموعے بھی بڑی تعداد میں چھپے۔

عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، نظام صدیقی اور شافع قدوائی مابعد جدید نقادوں میں اچھی خاصی پہچان رکھتے ہیں۔ عتیق اللہ نے مابعد جدید اصولوں کے ادب پر انطباق کا خاص خیال رکھا۔ ان کے مضامین چاہے جن موضوعات پر ہوں لیکن ان میں مابعد جدید تصورات کی پرچھائیں لازماً پڑے گی۔ لیکن انھوں نے اپنا ایک ایسا اسلوب وضع کر لیا ہے جس میں انجانے لفظوں اور اصطلاحات کی بہتات ہے، اسی لیے ان کی تنقید میں الجھاوے بہت ہیں۔ مابعد جدید نقادوں میں ابوالکلام قاسمی کا امتیاز یہ ہے کہ وہ دبستانی ہنگامہ آرائیوں اور غیر ضروری اصطلاحوں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ روایتی ادب کی تربیت ان کا سب سے مضبوط ہتھیار ہے۔ اردو کے ساتھ فارسی، عربی اور مغربی ادبیات کی تنقیدی پیش رفت پر ان کی نگاہ نے انھیں اعتبار عطا کیا۔ مابعد جدید نقادوں میں شاید وہ تنہا ہیں جنھیں متن سے الجھنے کا شوق اور حوصلہ ہے۔ (۳) انھوں نے تنقید پر شاعری اور فکشن سے زیادہ لکھا، یہی ان کی تنقید کی حد بھی ہے۔ کوئی نقاد صرف تنقید پر قانع ہو جائے تو

ادبی نقاد کا بنیادی فریضہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ان کی زبان صاف اور تجزیے کا اسلوب موثر ہے۔

نظام صدیقی اور مناظر عاشق ہرگانوی نے مابعد جدید موضوعات پر اپنی متعدد تحریریں پیش کیں۔ دونوں کے ہاں انجانے لفظوں اور ثقیل اصطلاحات اس قدر حائل ہیں کہ ان کی تحریریں قبول عام کا درجہ حاصل نہیں کرسکیں۔ مابعد جدید نقادوں میں شافع قدوائی کے بعض نہایت عمدہ مضامین پچھلی دو دہائیوں میں سامنے آئے۔انھوں نے تحقیق سے بھی اپنا شغف رکھا ہے اور اس سے حسبِ ضرورت اپنی تنقید کو فائدہ بھی پہنچاتے ہیں۔ان کی نثر رواں ہے اور جرح کرنے کے دوران ان کی تنقیدی درّا کی ابھر کر سامنے آتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے اصولوں کو وہ ادبی متن کی تفہیم کے دوران بہت سلیقے سے برتتے ہیں۔وہ متن سے گریز کی خو نہیں اپناتے۔اسی لیے ہم عصر نقادوں میں ان کی واضح شناخت قائم ہوئی۔شافع قدوائی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اردو ادب کے تعلق سے وہ تواتر کے ساتھ انگریزی میں بھی مضامین لکھتے ہیں اور انھیں ذولسانی مصنف کے طور پر خاص پہچان حاصل ہے۔

1980ء کے بعد ایسے نقاد جنھوں نے خود کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت سے الگ تھلگ رکھا ان میں شمس الحق عثمانی فکشن کے نقاد کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ان کی کتاب ''بیدی نامہ'' راجندر سنگھ بیدی کی حیات وخدمات پر اب بھی سب سے مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔ بیدی کے ساتھ منٹو کو بھی انھوں نے تنقید و تحقیق میں توجہ کے ساتھ برتا۔اردو میں شاید ہی کوئی دوسرا نقاد ہو جسے منٹو اور بیدی کی تخلیقات کے متن پر ایسی بھرپور گرفت ہو۔شمس الحق عثمانی کی زبان عام ناقدانہ انداز سے الگ ہے جس کے سبب ان پر اچھے خاصے اعتراضات بھی ہوتے رہتے ہیں۔فکشن کے سلسلے سے ارتضیٰ کریم کی متعدد کتابیں سامنے آئیں۔انھوں نے 'عجائب القصص' سے اپنی تنقید نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن تحقیقی اعتبار سے انھیں جو پختگی ملی تھی، اس کا تنقیدی اعتبار سے انھوں نے استعمال نہیں کیا۔ادبی تنقید میں نکتہ رسی اور تجزیے میں جس گہرائی کی توقع ہوتی ہے، وہ ارتضیٰ کریم کے یہاں وقت کے بڑھنے کے ساتھ زیادہ موثر صورت میں سامنے نہیں آئی۔ان کی کتابیں تحقیقی اعتبار سے اہم ہیں مگر وہ خود کو مرتبِ متن کے طور پر سامنے لانے سے زیادہ مطلب رکھتے ہیں، حالاں کہ وہ نقاد کے بہ طور اچھے خاصے کام کر چکے ہیں مگر ایسے کاموں پر اُن کا ارتکاز نہیں۔

رشید حسن خاں اور عبدالستار دلوی یوں تو جدیدیت کے زمانے سے ہی اپنی تنقیدی نگارشات سے

لوگوں کو متوجہ کرنے میں لگے تھے لیکن ان کی اصل شناخت 1980ء کے بعد قائم ہوئی۔ دونوں کی پہچان نقاد سے زیادہ محقق کی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے مضامین کافی وقیع ہیں اور ان کے تنقیدی فیصلے پر اردو کے علمی حلقے میں خاصی توجہ دی گئی۔ رشید حسن خاں نے جوش اور فیض احمد فیض کے سلسلے سے جو مضامین لکھے، وہ گہری تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔ باغ و بہار، فسانہ عجائب، گلزار نسیم، سحر البیان، مثنویات شوق وغیرہ کی تدوین میں ان کے مقدمے بہترین تنقیدی اوزاروں سے لیس ہیں۔ ناسخ اور سودا کے سلسلے سے ان کے مضامین قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ (۴)

عبدالستار دلوی لسانی نقاد کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اردو ہندی کے مسائل پر ان کے کئی مضامین سنجیدہ فکر کے حامل ہیں۔ اردو کے صوتی نظام پر بھی ان کی تحریر نہایت حقیقت پسندانہ ہے۔ اردو زبان کے ہندوستانی سیاق پر ان کی تفصیلی تحریر بہترین تنقیدی سمت کی وجہ سے قابل اعتبار رہی ہے۔ گیان چند جین کی متنازعہ کتاب کے سلسلے سے عبدالستار دلوی کی مکمل کتاب ان کے گہرے علم اور مطالعے کی وسعت کا ایک ساتھ اندازہ کراتی ہے۔

لطف الرحمٰن کے ابتدائی مضامین جدیدیت کے عہد کے ہیں لیکن انھیں بھی 1980ء کے بعد ہی قابل اعتبار نقادوں میں جگہ حاصل ہوئی۔ ابتدائی زمانے میں انھوں نے سکہ بند جدیدیت کی تفہیم کو اپنی تنقید کا محور بنایا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ دوسرے موضوعات کی طرف بھی بڑھتے چلے گئے۔ ان کی زبان نیم خطیبانہ، نیم کلاسیکی اور نیم تخلیقی ہے۔ یہ تنقید کے لیے ہر اعتبار سے موزوں زبان نہیں۔ ادبی متن سے زیادہ سے زیادہ سروکار رکھ کر کوئی ادبی نکتہ پیدا کریں، اس میں کئی بار لطف الرحمٰن ناکام ہوئے ہیں۔

قاضی افضال حسین کی ابتدائی شہرت میر شناس کی وجہ سے ہوئی لیکن وہ اپنی فلسفیانہ اپج کی وجہ سے مابعد جدیدیت کی طرف مڑ گئے۔ انھوں نے نئے ادبی تصورات کے نظری پہلوؤں پر کئی بھرپور مضامین لکھے۔ اطلاقی امور پر ان کا قلم رواں نہیں ہوا ہے۔ خورشید احمد نے خاص طور پر فکشن کو اپنی نگاہ میں رکھا۔ گہرے تنقیدی نکتے اٹھانے کے باوجود انھیں نقاد کے طور پر قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔ ان کے یہاں قوت انشا کی شدت سے

کمی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مفروضوں کو تفصیلی تجزیے کے بعد حکم کے درجے تک نہیں پہنچا پائے۔ مغربی ادب سے استفادہ کرنے کے دوران وہ بھرپور تنقیدی تجزیے سے گریز کرتے ہیں۔

آج اردو کے ادبی منظرنامے پر متعدد بزرگ لکھنے والوں کے ساتھ بڑی تعداد میں نوجوان لکھنے والے بھی ہیں۔ یہ سب کے سب مزاج اور تنقیدی رویے کے اعتبار سے مابعد جدید نہیں کہے جاسکتے ہیں۔ کئی ایسے بھی ہیں جو ایسے تنقیدی مسئلوں میں الجھنا بھی نہیں چاہتے۔ ان میں سے اکثر و بیشتر کی پہچان ابھی پایۂ اعتبار تک نہیں پہنچی لیکن ان کی تحریریں یا کتابیں غور و فکر کے ساتھ علمی حلقے میں پڑھی جاتی ہے۔ جمشید قمر، شمس بدایونی، ظفر کمالی وغیرہ نئی نسل کے ایسے نقادوں میں نمایاں ہیں جنھوں نے تحقیق سے اپنے تنقیدی فیصلوں کو معتبر بنایا۔ انھیں صرف محقق کہہ کر ان کی تنقیدی اہمیت سے رو گردانی نہیں کی جاسکتی۔ اسی طرح بعض تخلیق کاروں نے تنقیدی اعتبار سے گراں مایہ کام انجام دیے۔ خورشید اکبر کا شمس الرحمٰن فاروقی کی شاعری پر تحریر کردہ مضمون 'آسماں محراب یا شاعری کی مٹی خراب' بہترین تنقیدی کاوش ہے۔ حسین الحق اور طارق چھتاری کے افسانوں پر لکھے بعض مضامین اس قبیل کی تنقید کی نہایت اہم مثالیں ہیں۔ اس سے ان کی تنقیدی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

موجودہ عہد میں نئے نقادوں کا ایک ایسا حلقہ بھی مستعدی کے ساتھ تنقیدی کارنامے انجام دے رہا ہے جس میں سے اکثر 1980ء اور بعض افراد نے 1990ء کے بعد ادبی دنیا میں اپنی آنکھیں کھولیں ہیں۔ تنقید میں فکری پختگی اور علمی گہرائی کی کسوٹی پر کم عمر کے لکھنے والوں کا محاسبہ کرنا نامناسب ہے۔ اس کے باوجود ایسے نقادوں کی فہرست ترتیب دی جائے تو وہ کچھ یوں ہوسکتی ہے۔ صغیر افراہیم، قاضی جمال حسین، شہناز انجم، ش۔ک۔ نظام، بیگ احساس، انیس اشفاق وغیرہ یہ تمام نقاد 70 کی عمر میں ہیں۔ ان میں خاص طور سے نقاد کے طور پر انیس اشفاق نے اپنی شناخت قائم کی۔ 'اردو شاعری میں علامت نگاری' جیسی ان کی دوسری کتاب کا لوگوں کو انتظار ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ بیگ احساس نے کرشن چندر پر اپنی تحقیق و تنقید سے داد و تحسین حاصل کی۔ اردو ادبی نثر کے ارتقا پر شہناز انجم نے بہترین کتاب تیار کی تھی۔ نقادوں کے اسی زمرے میں بعض کم عمر کے لکھنے والے بھی شامل ہیں۔ ان میں صفدر امام قادری، انور پاشا، ابوبکر عباد، کوثر مظہری، مولا بخش، شہزاد انجم، عمیر منظر، راشد انور راشد، ابرار رحمانی، امتیاز احمد، جاوید رحمانی، ندیم احمد، معید

رشیدی، معراج رعنا، قمر الہدیٰ فریدی، سرور الہدیٰ، محمد کاظم، اسلم جمشید پوری، شہاب ظفر اعظمی وغیرہ کی شناخت رفتہ رفتہ مستحکم ہو رہی ہے۔ ان کی کتابوں پر علمی حلقہ توجہ دے رہا ہے اور ان کی بعض تحریریں ان کے تنقیدی رویے اور انضباط کی نشاندہی بھی کر رہی ہیں۔

تنقید کی تاریخ پر توجہ دینے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اردو میں اس صنف نے برق رفتاری سے ترقی پائی۔ ادب کی تاریخ میں یوں تو سوا سو سال ایک معمولی اور محدود وقفہ ہے لیکن اس مختصر میعاد میں اردو تنقید کے کارواں نے ہفت اقلیم سر کر لیا۔ لکھنے والوں کی تعداد بھی حیرت انگیز ہے۔ اردو میں تنقید اور نقادوں کی ترقی اتنی تیز رہی کہ اس دوران تخلیق کاروں اور تخلیق پر گفتگو تناسب کے اعتبار سے کم ہوئی۔ تخلیق کاروں کا ایک بڑا طبقہ تنقید کی طرف تو آیا ہی لیکن نقادوں کا سب سے بڑا حلقہ وہ تھا جو کل وقتی طور پر اسی کوچے کی سیاحی میں مصروف رہا۔ آزادی کے بعد نقادوں کا رعب و دبدبہ بڑھا۔ ترقی پسند نقادوں نے تخلیق کاروں پر اپنے خیالات تھوپنے کی کوششیں کیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت دونوں عہد میں نقادوں کا زور اتنا بڑھا کہ تخلیق کار ان کے حاشیہ نشیں معلوم ہوتے ہیں۔ ادبی گروہ بندی میں موجودہ تنقید نے مجرمانہ خطِ فیصل کھینچ رکھی ہے۔ (۵) آج ادبی تنقید باطن میں اکثر گروہی تنقید اور کبھی کبھی ادبی دہشت گردی بن گئی ہے۔ یہ تنقید کے منصب کے اعتبار سے بہت خطرناک اور تاریخی اعتبار سے بہت بری غلط کاری ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری سے ہماری تنقید کا جو سلسلہ قائم ہوا اس میں عملی نکتہ رسی، منصفانہ مزاج اور خلوص کا بڑا دخل تھا۔ تنقید کے لیے یہ تین ستون تھے۔ آج کی تنقید میں بالعموم تنقیدی نکتہ رسی اور علم کا تو اضافہ ہوا ہے لیکن منصفانہ مزاج اور خلوص نیت میں سخت کمی آئی ہے۔ اس جرم میں ایک نو آموز سے لے کر آفتاب و ماہتاب قسم کے نقاد سب کے سب شریک ہیں۔ جس کی وجہ سے نقادوں کا اعتبار کم ہوا ہے۔ کیونکہ آج یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کسی نقاد نے کوئی بات کہی ہے تو اس کے علمی اور ساتھ ساتھ گروہی انسلاکات کون سے ہیں۔ گیان چند جین کی کتاب کے سلسلے سے جو بحث اردو کے ادبی رسائل اور مستقل کتابوں میں سامنے آئی، اس میں نفس مضمون سے زیادہ ضمنی اور ذیلی موضوعات پر حق یا مخالفت میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ بات آج سے 50 سال پہلے کی تنقید میں کم تھی۔

آج اردو کے قاری کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اس منصف مزاج، دیانت دار اور علمی اعتبار سے لیس نقاد کی تلاش ہے جو نقاد کے بھولے ہوئے منصب کی بازیافت کر سکے۔ آج نقاد کے لیے یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ اس کی باتوں پر لوگ اعتبار کر سکیں۔ پرانی تنقید کو یہ فائدہ حاصل تھا کہ نقادوں کی باتوں کو نہایت سنجیدگی اور بھروسے کے ساتھ قابل غور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج ہماری تنقید بے راہ رو ہوگئی ہے اور ادبی رسائل جمہوری تقاضوں کے حامل نہیں رہے جہاں نقادوں کی بے سمتی پر سوالات قائم کئے جاتے ہیں۔ کلیم الدین احمد کے بعد کسی نقاد کو یہ حوصلہ ہی نہ ہوا کہ وہ اپنے ہم عصروں یا بعد والے لوگوں پر اپنے بھرپور مشاہدات درج کرائیں۔ اس کی وجہ سے نقادوں کی پہچان کا بھی مسئلہ قائم ہوا ہے۔ کیا شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی سے اردو کے قارئین کو یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اپنے عہد کے نقادوں اور بعد کی تنقید پر تفصیل کے ساتھ بے لاگ انداز میں ایسی گفتگو کر سکیں جس سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ ان کی روز نئی کتابیں بازار میں آرہی ہیں اس لیے ان کی عمر کا کوئی حیلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ نقادوں نے خود کو دوست اور دشمن کی قبیل میں بانٹ رکھا ہے۔ اس لیے ایک دوسرے کے بارے میں قدر شناسی کے فرائض سے وہ خود بچنا چاہتے ہیں لیکن جب تک اردو تنقید پھر سے اپنی تاریخ اور عہد حاضر کے تمام کارناموں کا بالاستیعاب جائزہ نہیں لیتی ہے، اس وقت تک ہم عصر اردو تنقید پر بعض سوالیہ نشان قایم رہیں گے۔

حوالہ جات:

(۱) کلیم الدین احمد: اردو تنقید پر ایک نظر: صفحہ ۴-۳، بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۲۰۱۲ء

(۲) وہاب اشرفی: مابعدِ جدیدیت: مضمرات و ممکنات: صفحہ ۵۲، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲

(۳) وہاب اشرفی: مابعدِ جدیدیت: مضمرات و ممکنات: صفحہ ۱۷۹، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲

(۴) نیا دور (رشید حسن خاں نمبر)، صفحہ ۱۳، لکھنؤ، دسمبر ۲۰۰۷

(۵) سہ ماہی آمد: شمارہ نمبر-۱، صفحہ ۷، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱ء

ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کی موجودہ صورت حال

(اردو شاعری کے خصوصی حوالے سے)

توصیف احمد ڈار*

اردو زبان ایک عالم گیر زبان ہے۔اس عالم گیر زبان کی ترقی وترویج اور مناسب تشہیر وترسیل کے حوالے سے وہ تمام ادارے، انجمنیں، تحریکات ورجحانات اور دبستان وغیرہ اپنی اپنی سطح پر بھرپور کردار پیش کررہے ہیں جو اس کی اہمیت ومعنویت اور آفاقیت وافادیت کے مظہر ہیں۔شمالی ہندوستان کا زرخیز علاقہ، جو عرفِ عام میں وادیٔ جنتِ نظیر کے لقب سے مُلقب ہے اور جو اپنی ہمہ جہت علمی، ادبی، روحانی و اخلاقی اقدار وروایات کی وجہ سے روئے زمین پر مشہور ومعروف ہے، کا نام وکام بھی اس سلسلے میں اپنی مثال آپ ہے۔اردو زبان وادب کی ایک مستحکم ومعقول تاریخ رقم کرتے ہوئے اس دبستان کی اردو زبان وادب کے تئیں خدمات کو کسی بھی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔اپنی ابتداء سے ہی اس ریاست سے وابستہ قلم کاروں نے اپنی تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ادبی حلقوں میں اپنی ہنرمندی کا لوہا منوایا ہے۔ناول ہو کہ افسانہ، خاکہ ہو کہ انشائیہ یا غزل، نظم اور رُباعی وغیرہ غرض ہر ایک صنفِ ادب میں طبع آزمائی کرکے اعلیٰ اور قابلِ تقلید شہہ پارے انھوں نے اپنی یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں، جو اردو زبان و ادب کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔یہاں کی ادبی روایت کم وبیش ایک صدی کے زمانے کو محیط ہے۔اس عظیم ادبی رویات کا مفصل اور مکمل جائیزہ پیش کرنا قطرے میں دَجلہ دکھانے کے مترادف ہے جس کی یہاں گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔اس بات کو ملحوظ رکھ کر زیرِ نظر مقالے میں محض دبستانِ جموں وکشمیر کی اردو شاعری کی موجودہ صورت حال کے مختصر تجزیے پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، انڈیا

جیسا کہ درج بالا سطور میں آیا کہ ابتدا سے ہی اس ریاست سے ایسے قلمکار پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے فنی ارتکاز اور تخلیقی بہاؤ کے طفیل اپنی اپنی بساط کے مطابق یہاں علمی اور ادبی ماحول قائم کرنے کی شعوری اور غیر شعوری کوششیں کیں اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک شاندار ادبی روایت کی داغ بیل ڈالی۔ پریم ناتھ پردیسی، محمد الدین فوقؔ، خوشی محمد ناظرؔ، وشوناتھ درماؔ، اللہ رکھا ساغرؔ، راجہ شیر علی، پنڈت ہرگوپال خستہؔ، غلام حیدر چشتی، مرزا مبارک بیگؔ، ڈاکٹر عماد الدین سوزؔ وغیرہ کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے معروف اور بنیاد گزار شعرا کے ہراوّل دستے میں ہوتا ہے۔ اگر چہ ان کا فکری میلان زیادہ تر غزل کی طرف ہی رہا ہے لیکن نظمیہ شاعری بھی اِن کے یہاں خاصی تعداد میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ روایتی رنگ میں رنگ کر وہ حسن وعشق، تصوف، دنیا کی بے ثباتی، موت وحیات وغیرہ موضوعات سے گلوخلاصی نہیں کر پائے۔ ۱۹۴۷ء تک ریاست کے شعری سرمائے میں ایک خاص رنگ غالب رہا جس میں ارباب اقتدار کے ظلم وستم کی داستان، غلامی کی زنجیر سے چھٹکارا پانے کی خواہش اور عوامی بے کسی و بے بسی وغیرہ جیسے اہم مسائل نے مختلف انداز واسالیب میں شعری تخلیقات میں جگہ پائی۔ اُس دور کے شعرا جہاں سیاسی وسماجی کشمکش اور حب الوطنی کے جذبات کی مصوری کرتے رہے وہیں وہ حیات وکائنات کے مسائل ومعاملات سے بھی دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ عرش صہبائی، شوریدہ کاشمیری، طالب کاشمیری، رسا جاودانی، منوہر لال دلؔ، سیفی سوپوری، غلام علی بلبلؔ، قیصر قلندرؔ، تنہا انصاریؔ، میکش کاشمیریؔ، غلام رسول نازکی وغیرہ اس دور کے قابل قدر فنکار ہیں۔ اِن شعرا کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی جس کی وجہ سے وہ معمولی سے معمولی مضامین کو بھی اعلیٰ شعری آب ورنگ سے آراستہ کرتے ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں عصری آگہی کی ایسی تصویر کشی کی گئی ہے کہ روح عصر اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ بقول حامدی کاشمیری:

> ''اس دور کے شعرا میں دور اوّل کے شعرا کی نسبت فنی شعور میں زیادہ پختگی اور رچاؤ ہے۔ موضوعات میں زیادہ فکری گہرائی ہے۔ بیانیہ نظموں کے ساتھ ساتھ فکری اور داخلی موضوعات پر بھی متعدد نظمیں لکھی گئی ہیں۔''[۱]

۱۹۴۷ء کے بعد سے جو دور شروع ہوتا ہے وہ ملک اور ملک کے باشندوں کے لیے ایک عتاب

الٰہی ثابت ہوا۔ ایک طرف جہاں ایک طویل جدوجہد اور کشمکش کے بعد صدیوں کی غلامی سے یہاں کی قوم رِہا ہوئی وہیں دوسری طرف تقسیم ملک کے عظیم سانحہ سے لوگوں کو دوچار ہونا پڑا۔ اس تقسیم نے ایک عظیم اور صدیوں سے قائم مشترکہ قومی وتہذیبی روایت کی آناً فاناً دھجیاں اڑادی۔ زندگی کا ہر ایک شعبۂ اس واقعے کی سنگینیت سے متاثر ہوا۔ ادب وآرٹ بھی چوں کہ انسانی ثقافت کا ایک اہم اور لازمی حصہ ہے اس لیے اس کا بھی ان حادثات کا اثر قبول کرنا ایک فطری امر ہے۔ ادب میں نئی سوچ، فکر اور نئے اسالیب نمایاں ہونے لگے۔ اس دور کے بیشتر ادباء وشعرا کے یہاں انہی انسانیت سوز اور حیوان صفت واقعات کی تصویر کشی ایک غالب موضوعی صورت اختیار کرگئی۔ ریاست جموں وکشمیر کے اُس دور کی شعری روایت بھی ان حالات و معاملات ہی کی غمازی کرتی ہے۔ اس کے بعد جدیدیت کا رجحان سامنے آیا جس کے زیرِ اثر ادب میں نئے نئے موضوعات اور تصورات نے جگہ پائی۔ بعض ادبی محققین اور مورخین کا دعویٰ ہے کہ اردو ادب میں ۱۹۶۰ء کے بعد جس جدیدیت نے فنی اور فکری سطح پر اُردو ادب کو متاثر کیا تھا، کشمیر کے اردو ادبا وشعرا نے اس ادبی رجحان کا بہت کم اثر قبول کیا، جس کی اپنی تہذیبی، سماجی، سیاسی، علمی، ادبی اور جغرافیائی وجوہات تھیں۔ تاہم یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ ادب چونکہ کسی ایک ملک یا قوم کی جاگیر نہیں بلکہ اس کا دائرہ وسیع وعریض ہوتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے میں ریاست جموں وکشمیر سے وابستہ شعرا بھی ان تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہاں کے شعرا نے لب ولہجہ کی تبدیلی، الفاظ اور تراکیب کی تراش خراش اور نئے شعری تجربوں کے ذریعے اردو کے شعری اُفق پر تابناکیاں بکھیر دیں۔ نہ صرف ریاستی سطح پر بلکہ قومی وبین الاقوامی سطح پر نئے شعرا کے افکار وخیالات سے ہم آہنگ ہوکر براہ راست ان کا اثر قبول کیا اور اس طرح اس رجحان کے زیر اثر حیات وکائنات کو ایک نئے تناظر میں دیکھنے لگے۔ حامدی کاشمیریؔ، حکیم منظورؔ، میر غلام رسول نازکیؔ، شہہ زور کاشمیریؔ، تنہا انصاریؔ، میکش کاشمیریؔ، قیصر قلندرؔ، فاروق نازکیؔ، مسعود سامونؔ، شہباز راجوریؔ، منیب الرحمٰنؔ، فاروق آفاقؔ، رفیق رازؔ، رخسانہ جبینؔ، اشرف ساحلؔ وغیرہ جیسے شعرا اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

ہر نئے عہد میں بدلتے ہوئے حالات کے تحت ایک نئے شعری مزاج کی تشکیل ہوتی ہے اور اس شعری مزاج کی عکس نمائی اس عہد کی شعری تخلیقات سے ہوتی ہے۔ شاعر چونکہ حساس شخصیت کا مالک ہوتا

ہے اس لیے خارجی حالات کے دباؤ کے تحت اس کے ذہنی رویئے داخلی تپش کی آنچ میں تپ کر شعری تخلیقات میں متشکل ہوتے ہیں اور یہی عمل نئے رجحان کی نمود کا باعث بنتا ہے۔ انہی رجحات سے واقفیت رکھنے والا اور ان کی نمائندگی کرنے والا شاعر صحیح معنوں میں عصری شعور کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ اب جبکہ ادبی منظرنامے پر مابعد جدید تصورات کا ارتقا ہو رہا ہے ریاست سے وابستہ شعرا بھی عالمگیریت اور صارفیت کی زائیدہ ثقافتی صورتحال کے اثرات قبول کر رہے ہیں اور اس کا اظہار شعوری یا لاشعوری طور پر ان کی شاعری میں فطری انداز میں آزادانہ طور پر ہو رہا ہے۔ اکیسویں صدی کے اس بدلتے منظرنامے پر ریاست جموں و کشمیر سے جو شعرا ابھر کر سامنے آئے اور جنہوں نے ریاست کی شعری روایت کو اپنی جولانیٔ طبع سے بلندی عطا کی ان میں دو طرح کے لوگ شامل ہیں۔ ایک وہ جو موجودہ صدی سے قبل ہی اردو ادب بالخصوص ریاست کی شعری روایت میں اپنے گہرے مشاہدے، فنی پختگی، منفرد اسلوب بیان اور وسیع مطالعے کی بدولت ایک اعلیٰ شان اور پہچان قائم کر چکے ہیں اور آج بھی اپنی ان خوبیوں اور صلاحیتوں کو شاعری کا جامہ پہنا کر قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔ دوسرا گروہ اُن تخلیق کاروں پر مشتمل ہے جو اس صدی کی پہلی یا رواں دہائی سے ہی اس میدان میں سامنے آئے ہیں اور جو نہایت کم و قلیل مدت میں ہی اپنی فطری صلاحیتوں اور ہنرمندیوں کو بروئے کار لا کر ادبی حلقوں میں اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اوّل الذکر گروہ سے تعلق رکھنے والے سرِ فہرست شاعروں میں پدم شری پروفیسر حامدی کاشمیری کا نام ہر اعتبار سے اوّلیت کا حامل ہیں۔ آپ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک شاعر و ادیب گزرے ہیں۔ آپ نے اگرچہ اپنی ادبی زندگی کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا ہے لیکن بعد میں وہ ناول، تنقید و تحقیق، غزل، نظم اور رُباعی وغیرہ ادبی اصناف میں بھی اپنے خیالات و مشاہدات کا اظہار کرتے گئے۔ یوں وہ ادبی دنیا میں ایک کامیاب افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، محقق، صحافی، سفرنامہ نگار وغیرہ کی حیثیت سے ایک بلند مقام کے حامل ہیں۔ ان کے اب تک سات شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں عروسِ تمنا، نایافت، لاحرف اور شاخِ زعفران وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے ''عروس تمنا'' کے مطالعے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی شاعری فطرت پرستی، رومانیت اور سماجی احساس کی پروردہ

ہے۔ بعد میں وہ اپنے کلام کو موضوع اور اسلوب کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر کے نئے تقاضوں کے مطابق کر دیتے ہیں۔ زبان کے تازہ کارانہ اور تخلیقی برتاؤ سے ان کی شاعری میں طلسمی فضا بندی پیدا ہوتی ہے۔ پروفیسر مجید مضمر، حامدی کی شاعری کے ارتقائی سفر سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''تجربات اور فکر کی سطح پر اس کی (حامدی کاشمیری) شاعری کے مختلف مرحلے ''خود'' شاعر کی ذاتی زندگی سے لاتعلق نہیں ہیں۔ حسین خواب اور آرزوئیں ''عروس تمنا میں'' شکست خواب اور اس کے نتیجے میں اذیت اور کرب ''نایافت میں'' نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ''لاحرف'' خوف ودہشت اور اذیت اور کرب کی اس گنجان فضا کو چیرتے امید ورجا کے پہلوؤں کی تلاش ہے ۔ ''شاخ زعفران'' اور اس کے بعد کی شاعری میں سمندر کا سا سکون ہے جہاں ہر شعر تخلیقی سطح پر علم وخبر سے بے نیاز ہو کر ''بے نام'' تجربوں کی حرف کاری سے عبارت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان مجموعوں کی شاعری، تجربے اور مزاج کے اعتبار سے یا تخلیقی سطح پر ایک دوسرے سے مختلف ہے بلکہ اس کے برعکس اس میں ایک فکری ارتقا ملتا ہے۔''[۲]

حامدی کاشمیری کی شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ساتھ جدید حسیت اور عصری آگہی، وسعتِ مشاہدہ، فکری تنوع اور جدتِ اسلوب سے مزین ہے۔ ان کے کلام کا بنیادی وصف ان کا منفرد لسانی برتاؤ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے تخلیقی تصورات وتجربات کے بیان کے لیے الفاظ کا ہی سہارا لیتے ہیں ۔ وہ اظہاریت کے فطری اصول کے تحت تجربات کی تجسیم کو اہمیت دیتے ہیں۔ اُن کے یہاں ایک ایسی طلسماتی فضا ملتی ہے جو استعجاب انگیز بھی ہے اور دہشت خیز بھی۔ جسے خارجی دنیا سے باطن کی جانب مراجعت کی روداد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے کلام میں طلسمی صورتِ حال تخلیق کرنے کے قائل ہیں اور اس شعری انفرادیت کو کامیابی سے برتتے ہیں۔ وہ پیکر تراشی اور استعاراتی اظہار کو اپنی تخلیقات میں مقدم رکھتے ہیں۔ مثلاً برف، وادی، پہاڑ، سنگ، شجر، سایہ، شعلہ، آسیب، دشت وغیرہ الفاظ ان کی شاعری میں

استعاراتی نظام قائم کرتے ہیں۔عصری آگہی اور قدروں کی شکست وریخت اور زندگی کی لایعنیت ان کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔نمونے کے طور پر کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں ۔

سب کو آشفتہ کار ہونا تھا　　دشت کو بے کنار ہونا تھا

روکو نہ میرا راستہ سرسبز جنگلو!　　میں دست و پا شکستہ ہوں، پیچھے غنیم ہے

سایہ سایہ ہے اژدھا صورت　　کیا یہ آثار اسی جہاں کے ہیں؟

سکوت برف میں برگد صدا بکھرے رہے　　قدم اُٹھائے کہاں، نقش پا بکھرے رہے

غلام نبی ناظر اپنے ایک مضمون ''کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال'' میں حامدی کاشمیری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''حامدی کاشمیری کی شاعری کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ جدید حسیت اور عصری آگہی اور وسعت مشاہدہ، فکری تنوع اور جدت اسلوب سے مزین ہے ان کی زبان اور تراکیب اور علامات اور استعارات کا جدید استعمال ان کی شاعری کو ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔''[۳]

حکیم منظور (مرحوم) اس اوّلین گروہ سے وابستہ دوسرے اہم شاعر ہیں۔وہ نصف درجن کے قریب شعری مجموعہ جات کے خالق ہیں۔جن کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں ایک پختہ کار قلم کار کی حیثیت سے اردو غزل اور نظم کو ایک نئی زبان دی ہے۔انھوں نے ایک نئے اور انوکھے آہنگ، لب و لہجے اور جدید طرزِ اظہار کے ساتھ ریاستی شعری قافلے کی رہنمائی کی۔ان کی شاعری کا پس منظر اُن کے فکر و ادراک کو توانائی اور اظہار کو استناد عطا کرتا ہے۔مقامی رنگ و آہنگ لیے استفہامیہ اندازِ بیان کے ساتھ وصفی تراکیب اور علامتوں کا خوبصورت امتزاج ان کی شاعری کو فکر کی نئی جہتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔وہ نامانوس لفظیات، اَن چھوئے پیکروں کے طفیل تازہ کاری کا احساس دلاتے ہیں۔وہ مشرقی و مغربی لسانی و شعری تصورات کے حوالے سے شعر میں الفاظ و تراکیب کے انتخاب، استعمال اور برتاؤ کی حقیقت سے آگاہ تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنی شاعری میں قدم قدم پر کیا ہے۔جیسے ۔

ہر حرف پورے لفظ کا معنی طلب کرے　　ابہام کو ہو دعویٰ تفصیل کیا عجب

کیوں نہیں کرتا محسوس پس لفظ ہے کیا　　ریشمی لہجے کو ہی پیار سمجھتا کیوں ہے

حکیم منظور نے عصری غزل میں جس سنجیدگی اور خلاقانہ مہارت کے ساتھ لفظیات داخل کی ہے وہ ان کے لسانی شعور کا صحیح مظہر ہے اور اُن کے تازہ کار شعری احساس کا ضامن بھی۔ قاضی غلام محمد، حکیم منظور کے مقبول شعری مجموعے ''پھول شفق آنگن'' کے دیباچہ میں اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

''حکیم منظور کی شاعری کے حوالے سے بات کیجئے تو یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے۔ کہ یہ حساس اور گہری سوچ کا حامل شاعر کس مواد سے اور کس طرح اپنے اصنام خیال تراشتا ہے۔''[۴]

سلطان الحق شہیدی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ آپ کا شمار ریاست کے کہنہ مشق اور استاد شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ نظم، غزل، قطعہ اور رُباعی وغیرہ شعری اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں، لیکن غزل گوئی آپ کا اصل میدان ہے۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ آپ کی ابتدائی شاعری روایتی اور رومانوی طرزِ احساس سے ہی پُر ہیں لیکن گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کے موضوعات کا دائرہ بھی پھیلتا گیا۔ موجودہ زندگی کی تمام تر الجھنوں، تلخیوں، فریب کاریوں اور جعلسازیوں کو بالخصوص وہ اپنی توجہ کا مرکز بناتے ہیں۔ آپ کے یہاں سادہ بیانیہ اسلوب کے ساتھ ساتھ اشاراتی اور استعاراتی اندازِ بیان بھی جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً

کھوٹ دلوں میں جھوٹ لبوں پر ہوس کے بندے کیا کہیے　　دل کی دنیا کالی کالی چہروں پر اُجیالا ہے

دین ہو، فلسفہ ہو، حکمت ہو　　آج کل سب کا چل گیا بیوپار

خون پی پی کے جی رہے ہیں دوست　　اس زمانے میں جو بھی ہیں خوددار

رفیق رازؔ اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں بیک وقت شاعری تخلیق کرتے ہیں۔ ان کی تمام تر شاعری انکشافِ ذات کی شاعری ہے۔ اُن کا کلام نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ زبان اور الفاظ کے تخلیقی برتاؤ کی بدولت بھی ایک نئی شعری کائنات خلق کرتا ہے۔ اپنے معاصر قلم کاروں کے برعکس ان کے اندازِ

بیان میں قدرے بانکپن اور کھردراپن پایا جاتا ہے جس سے ان کی شاعری کا ایک منفرد لہجہ مرتب ہوتا ہے۔

اپنا ہی کوئی در پئے آزار مجھ میں ہے　　مجھ سے ہی کوئی برسرِ پیکار مجھ میں ہے

دیکھو تو موج فنا۔ موج میں آنے والے　　دشت میں خاک ہوئے اُڑانے والے

رفیق رازؔ اپنی شاعری میں ہیئت، آہنگ اور ڈکشن کے اعتبار سے کچھ نیا اور انوکھا کرنے کی قوت اپنی لسانی تشکیل میں رکھتے ہیں۔ انھوں نے اردو، عربی اور فارسی کی روایتی شاعری کے ساتھ ساتھ صوفیانہ شاعری سے بھی بہت استفادہ کیا ہے۔ جس سے ان کے فکر وفن میں بالیدگی اور پختگی پیدا ہوگئی۔ پروفیسر حامدی کاشمیریؔ آپ کی فکری وفنی انفرادیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''۱۹۸۰ء کے بعد ریاستی اور ملکی سطح پر اُبھرنے والے نئے شعرا میں رفیق راز نے بہت جلد اپنی انفرادیت منوانے میں کامیابی حاصل کی۔ وہ ان معدودے چند نئے شعرا میں نمایاں، امتیازی اور مستحکم حیثیت رکھتے ہیں جو تخلیق شعر میں بنیادی لوازم کو عزیز رکھتے ہیں جو شعر میں کسی منصوبہ بندی سے کسی خیال یا نظریے کو ڈھالنے کے بجائے لفظوں اور پیکروں کو اپنے بل بوتے پر ترکیبی صورت میں ڈھلنے اور نادر کار شعری تجربے میں مقلب ہونے پر اسرار کرتے ہیں۔ دوسرے جو روایت کے گہرے شعور کے ساتھ جدت کاری سے کام لیتے ہیں۔ رفیق راز خارجی زندگی کے خونچکاں واقعات، سانحات اور تضادات کا سامنا کرتے ہوئے ذہنی واردات سے گزرتے ہیں اور گہرے زبان، خوف، اجنبیت اور دل گرفتگی سے آشنا ہوتے ہیں تاہم وہ مابعد جدیدیت رویّے کے تحت خواب بینی سے دست بردار نہیں ہوتے ہر چند کہ وہ لحہ بہ لحہ ''شکست خواب'' کے المیے کا سامنا کرتے ہیں۔''[۵]

ریاست جموں وکشمیر سے وابستہ اکیسویں صدی کے نمایاں شاعروں میں فاروق نازکی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ فاروق نازکی شعر وادب کا نکھرا ہوا ذوق رکھتے ہیں یہ ذوق انھیں ورثے میں ملا ہے۔

ان کی متنوع شخصیت ایک حساس فنکار کی طرح ان کے کلام میں جھلکتی ہے۔فیض احمد فیض کے شعری آہنگ سے وہ خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔''آخری خواب سے پہلے'' اور ''لفظ لفظ نوحہ'' ان کے دو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ان میں شامل نظمیں اور غزلیں ان کی فنی واقفیت،فکری گہرائی،عصری آگہی اور منفرد لب ولہجے کا بین ثبوت فراہم کرتی ہیں۔عصر حاضر کے گوں نہ گوں مسائل ومعاملات کو وہ اپنی شاعری میں علامتی پیرائے میں بحسن وخوبی پیش کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں عصری دردوکرب کے ساتھ ساتھ ڈرامائی پس منظر اُبھر کر سامنے آتا ہے جو ان کی کامیابی پر دال ہے۔مثال کے لیے یہ نظم پیش کی جاتی ہے۔

زمین شعلے اگل رہی ہے
فضا سے تیزاب گر رہا ہے
زمین اگنی پہ لوٹتی ہے
ہوائیں چہرہ بگاڑتی ہیں
سنا تو تھا
آج دیکھتے ہیں
یہاں ہوائیں ہیں نارسیرت
ازل سے لے کر ابد تک بے قرار ہوں گی
ہماری روحیں
جنم جنم تک
بھٹک بھٹک کر
فنا فنا بے کراں تباہی کا نام لے کر
نہ پیڑ ہوں گے
نہ قمریوں کے سریلے نغمے
شوالکا پر نہ کوئی جوگی

صدائے جشن بہار دے گے
کوئی قلندر نہ کوئی رومی
نئے سروں کی تلاش کرنے
کسی نیستاں میں جا رکے گا [۶]

موجودہ زندگی اتنی پیچیدہ اور مسائل سے گھری ہوئی ہے کہ اس سے مفر ممکن نہیں۔ یہ لفظ ہی ہیں جن کے ذریعے ہم زندگی کے دکھ سکھ اور اپنے جذبات و احساسات، خیالات اور تجربات دوسروں تک بہ آسانی منتقل کر سکتے ہیں۔ لفظ ہماری زندگی میں بہت اہمیت و معنویت رکھتے ہیں۔ فاروق نازکی الفاظ کے استعمال اور انتخاب میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ معاشرے میں پھیلے تناؤ اور بگاڑ نے اخلاقی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ تہذیب کی شکست و ریخت، منافقانہ رویہ اور بے راہ روی سماج میں عام ہے۔ انسان کا کردار پستی کی طرف گامزن ہے اور اس پر بے حسی کی کیفیت طاری ہے۔ جب معاشرے کے حالات ایسے ناگفتہ بہ ہوں تو ایک منجھے ہوئے شاعر کا ان کی معقول و مناسب ترجمانی کوئی امرِ تعجب نہیں ہے۔ فاروق نازکی اپنی شاعری میں کہیں علامتی و استعاراتی انداز میں اور کہیں سادہ اور سلیس انداز میں عصر حاضر کے ان مسائل و معاملات کا اظہار کرتے ہیں۔ فاروق نازکی نے آزاد غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کے شاعرانہ لہجے کا تنوع، اندازِ بیان کی جدت انھیں بڑے شاعروں کی صف میں شامل کرتے ہیں۔ اُن کی شاعرانہ مہارت پر غلام نبی ناظر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ (فاروق نازکی) اپنے جذبِ دروں کو لطف و انبساط کی شدت کی آنچ دے کر غزل کے رنگ میں ایک دلکش اور پر کیف انداز میں پیش کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔'' [۷]

ریاست جموں و کشمیر کی موجودہ صدی کی اردو شعری روایت میں فرید پربتی کا نام قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے بیک وقت اردو غزل، نظم اور رُباعی میں اپنے تخلیقی جواہرات پیش کیے ہیں۔ ''فرید نامہ''، ''گفتگو چاند سے'' اور ''ہزار امکاں'' پربتی کے وہ مجموعے ہائے کلام ہیں جو رواں صدی میں منصۂ شہود پر آ کر

ادبی حلقوں میں مناسب داد وتحسین وصول کر چکے ہیں۔ان کی شاعری میں جہاں کلاسیکی رکھ رکھاؤ کی آنچ دکھائی دیتی ہے وہیں ان کے یہاں عصری زندگی اور تہذیب کے حوالے سے جدید ترین سوچ اور فکر کے دھارے بھی بدرجہ اتم موجود ہیں، جو ان کی فنی مہارت اور تخلیقی ہنرمندی کی پختگی کا بین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔مثال کے لیے یہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر　　کہ بکتی دھوپ ہے ایک اِک دکاں پر

میرے ہر خواب کی تعبیر سے گھبراتے ہیں　　ہاں میرے بھائی بھی یوسفؑ کے برادر نکلے

نذیر آزاد ریاست جموں وکشمیر کے اکیسویں صدی کے شعرا کی فہرست میں ایک قابلِ قدر نام ہے، جو اپنی نظموں میں رنگ وآہنگ کی سطح پر کچھ مختلف ومنفرد کرنے کی قوت اپنے گہرے مطالعے اور مشاہدے میں رکھتے ہیں۔آپ اپنے تجربات ومشاہدات کو من وعن بیان نہیں کرتے بلکہ ان تجربات و مشاہدات سے جو احساس ان کے دل پر مرتسم ہوجاتا ہے، اسے تخلیق کا پیکر عطا کرتے ہیں۔دل پر طاری ہونے والا یہ احساس شعلوں کی مانند نہیں بھڑکتا بلکہ قدرے دھیمی دھیمی آنچ سے سلگتا ہوا احساس ہے اور یہی احساس ان کے فن کے سونے کو کندن بنا دیتا ہے۔نذیر آزاد اپنے سماج، ماحول اور عہد میں پیش آنے والے حالات وواقعات پر گہری نظر رکھ کر بڑی فنکاری سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ان کے تجربات کی دنیا بے حد وسیع اور لامحدود ہے اس لیے وہ کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتے بلکہ ہر طرح کے موضوعات کو اپنی شاعری میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔موضوعاتی تنوع پذیری کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں بیان کی سلیقہ مندی کی عمدہ جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ملاحظہ ہوں یہ دو اشعار

گریباں چاک ہے تو ہو، ابھی دستار باقی ہے　　چلے آنا تماشا بر سرِ بازار باقی ہے

ہمارے خانۂ دل میں وہ جگنو بن کے آئے گا　　مگر تب کچھ زیادہ رات کالی ہوگئی ہوگی

پرتپال سنگھ بیتاب اردو کے نظم اور غزل گو شعرا میں اپنے منفرد لب ولہجے کی وجہ سے ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ان کا کلام فکر واحساس کی تازگی، انقطاع روایت اور نئے شعری رجحانات سے عبارت ہے۔انھوں نے عہد بہ عہد زندگی کے بدلتے رنگوں سے آشنائی حاصل کی اور اپنے شعری منظرنامے کے وسیع

کینواس کو اس کے بھرپور رنگوں سے سجاتے رہے۔ پرتپال سنگھ نے اپنے تجربات کو اپنی ذات کے حوالے سے، جو بھی مواد اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے، ان کی حد بندیوں کو زماں و مکاں میں محصور ہونے کے باوجود اس طرح توڑ دیا ہے کہ وہ ہمارے نہاں خانوں میں داخل ہو کر ہماری ہی داستان کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ ان کی نظمیہ شاعری میں خاص طور پر اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے اور اس سے معنی کی نئی دنیاؤں کے در وا ہونے لگتے ہیں۔ آپ وقت کی کروٹوں کا احساس رکھتے ہیں اور سماجی اقدار کی شکست و ریخت کے ساتھ ساتھ آشوب زدہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو فنی تکنیک کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔

بھوت بنگلے کہلانے والے چند ایک محلات
جن کی ایک ایک اینٹ
لمحہ لمحہ اکھڑ رہی ہے
بے بام و در کمروں جیسی چند ایک دیواریں ہیں
جن کو دیکھ کے لگتا ہے
کہ کبھی یہ عمارت کے حصے میں رہی ہوں گی
ہم نہیں ہیں
مگر شاید ہم بھی ہیں پیچھے دور
اڑتے ہوئے غبار میں پھیلی ہوئی
اک فقط شرمندگی کی صورت[۸]

پرتپال سنگھ بیتاب کے اب تک کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''نظم اکیسویں صدی کی'' اور ''شہر غزل'' موجودہ صدی کی دین ہیں۔ ریاست کے دوسرے شعرا کی طرح آپ کی شاعری میں بھی مقامیت، وجود کے دوہرے پن اور مایوس و پژمردگی کے احساسات ملتے ہیں لیکن ان کا اظہار جدید استعاروں کے ساتھ ہوا ہے۔ مثلاً

کھودی تھیں ہم نے روایات کے لیے
یہ کیا ہوا کہ انہی قبروں میں گر گئے

جائے حیرت اس نئی تہذیب میں موجود ہے　　اک پرانا سا کھنڈر اونچے گھروں کے درمیان

پڑھتے رہے ہمیشہ پرانی کتاب ہم　　اور ڈھونڈتے رہے ہیں نیا کوئی باب

ماہر لسانیات منیب الرحمٰن، بیتابؔ کی شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''پرتپال سنگھ بیتابؔ بھی منفرد اسلوب شعر کی بشارت اپنی نظموں اور غزلوں میں الگ الگ طور پر دیتے ہیں۔ اُن کے مجموعہ کلام ''پیش خیمہ'' سے ظاہر ہے کہ وہ الفاظ کی نئی معنوی جہتیں اپنے تجربات اور احساسات کے تناظر میں تلاش کرتے ہیں۔'' ۹

شفق سوپوریؔ وادیٔ کشمیر کے موجودہ شعرا میں ایک اہم نام ہے۔ آپ کے آج تک اگرچہ کئی افسانے، تبصرے اور ناول بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں لیکن بنیادی طور پر آپ کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے ہی مسلم ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے آپ بڑی سنجیدگی سے نظم اور غزل کہہ رہے ہیں۔ ''صحرا میں اذاں'' اور ''دشت میں کہیں'' آپ کے آج تک سامنے آنے والے شعری مجموعے ہیں۔ آپ کے دوسرے شعری مجموعے ''دشت میں کہیں'' کو ریاست جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی جانب سے سال ۲۰۰۷ء کی بہترین کتاب کے انعام سے نوازا گیا ہے۔ آپ کی فکر میں تازگی، تکیل میں تنوع اور ادائیگی میں ندرت ہے۔ آپ کی شاعری نہ صرف موضوعاتی سطح پر بلکہ الفاظ کے تخلیقی برتاؤ کی بنا پر ایک نئی شعری کائنات خلق کرتی ہے۔ حامدی کاشمیریؔ شفق سوپوری کی شعری فضا پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان کی شعری فضا میں حد بندی، یک رنگی اور گھٹن کا احساس نہیں ہوتا ہے بلکہ آزادی، توسیع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔'' ۱۰

نمونے کے طور پر آپ کے کلام سے یہ ایک دو اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

یہاں پہ اب کوئی موسم نہیں اداسی کا
کہ میرا دل بھی مرے شہر بے اماں سا ہے

کہاں اُتار لوں تیری نظر کی پاک کرن
کنارہ دل و جاں تک دھواں دھواں سا ہے

''خودرو'' اور ''شام سے پہلے'' نامی شعری مجموعوں کے خالق ایاز رسول نازکی موجودہ شعری روایت میں ایک ناقابل فراموش نام ہے۔ روایت کا اعلیٰ شعور، فنی اکتساب، نئی حسیت، منفرد جمالیاتی ذوق اور عصری آگہی جیسے اہم پہلوان کے فکر وفن اور اظہار واسلوب کو مستحکم بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔ نازکی کی شاعری میں اگرچہ روایت کا اعلیٰ شعور موجود ہے لیکن ان کا ذہن روایت زدہ نہیں ہے اس کے برعکس ان کے یہاں موجود تخلیقی بہاؤ اور بے پناہ تازگی قارئین کو اپنے ساتھ دور تک بہا کر لے جاتی ہے اور مسرت سے بصیرت تک کا سفر طے کراتی ہے۔ اپنے چند مقبول ہم عصر شعرا سے وہ یقیناً متاثر ہیں لیکن بقول فرید پربتی'' ان کا لہجہ اپنا ہے زبان اپنی ہے اور احساسِ جمال اپنا ہے۔'' ان کے یہاں ایسی غزلوں اور نظموں کی کثیر تعداد موجود ہیں جن میں فنی اور جمالیاتی تقاضوں کو بڑی مہارت سے برتتے ہوئے جدید تر افکار و خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً

پہلے جیتے تھے نفرتوں کے بغیر — اب بھی جیتے ہیں چاہتوں کے بغیر
تم پہ ایسا کبھی سماں گزرا — سانس لینا بھی جب گراں گزرا

ریاست جموں و کشمیر کا شعری منظر نامہ جن شعرا کی وجہ سے روشن ہے اُن میں معروف شاعر اور ناقد اقبال فہیم ہر دو اعتبار سے قابل ذکر ہیں۔ اقبال فہیم غزل گوئی کے ساتھ ساتھ نظم نگاری میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ اپنی مٹی سے جڑا ہوا یہ شاعر نہ صرف زمینی حقائق کی بھرپور آگہی رکھتے ہیں بلکہ پوری آب وتاب کے ساتھ اپنی نظموں میں ان حقائق کو برتتے بھی ہیں۔ ان کی شاعری کے آج تک کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''سنگ بر آب''، ''ندائے آوارگی'' اور ''موج نفس'' شامل ہیں۔ ماورائیت ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ لطیف اور نازک پیکروں کے ذریعے وہ اپنی شاعری کو رومانیت سے قریب تر کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری سے تخلیقی آسودہ پن اور فلسفیانہ انداز فکر کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ان کے اشعار میں معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات کے جذباتی تقاضوں پر سماجی تقاضوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ احتجاج کہیں نرم اور کہیں سخت انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ معاشرے میں زندگی بسر کر رہے افراد کی مصیبتوں، تکلیفوں اور رنجشوں سے وہ بخوبی واقف ہیں اور اُن کے نفسیاتی

پہلوؤں کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

بہت غرور پروں پر ہے جس پرندے کو　　تم اس کے سامنے اونچی اُڑان رکھ دینا

چاند کو چھونے کی ضد نے بدنام کیا　　ہم نے تیرے نقش بنائے شاخوں پر

ریاست جموں وکشمیر سے وابستہ اکیسویں صدی کے اہم شعراء میں احمد شناسؔ کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ''پس آشکار'' کے نام سے ان کا شعری مجموعہ حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اپنی شاعری میں انھوں نے بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حالات کو اپنی ذاتی فکر واحساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کی نظموں میں کشمیر اور کشمیریت سے ان کی بے لوث محبت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں ریاست میں جو نامساعد سیاسی وسماجی نیز تہذیبی ومعاشی طوفان بپا ہے، قدروں کی شکست وریخت اور روحانی واخلاقی سطح پر جو بے راہ روی اور حیوانیت کا بازار گرم ہے، اس کی بھرپور تصویر کشی ان کی نظموں میں دیکھی جاتی ہے۔ احمد شناس کی ان خوبیوں کو محمد یوسف ٹینگ ''پس آشکار'' کے پیش لفظ میں یوں اُجاگر کرتے ہیں:

> ''شاعر (احمد شناس) کشمیر کی مٹی کو مٹھی میں لے کر بو باس کو شعر کے رنگ و ریشے میں INJECT کرتا ہے تو اس میں انفرادی دکھ درد کے ساتھ انسانی کرب کی لہریں مچلتی ہیں۔ ایسے اشعار کے اندر کشمیر کے زخم لو دیتے ہیں۔ لیکن انھیں ان قدروں کو بڑے تناظر کے ساتھ جوڑنے میں بھی کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ اس وقت دنیا میں نرم جذبات، اچھی قدروں اور بڑے آدرشوں کی جو شکست وریخت ہو رہی ہے وہ جیسے روحانی سطح پر ایک ''سونامی'' کی گرج کا سراغ دے رہے ہیں۔ ان کی ترجمانی احمد شناس کی شاعری میں بڑی فنکارانہ اعتبار سے ملتی ہے۔''[11]

مذکورہ ریاست کی موجودہ شعری روایت کی تابناکی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ گذشتہ کئی دہائیوں سے یہاں کئی شاعرات نے بھی اس میدان میں قدم رکھ کر اپنی ہنرمندی کا لوہا منوایا۔ اپنی فنکارانہ اور تخلیقی انفرادیت کا مظاہرہ کر کے وہ نہ صرف ریاست بلکہ بیرون ریاست میں بھی قدر کی

نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ان میں ترنم ریاض، پروفیسر نصرت چودھری، شبنم عشائی، پروین رلجہ، نسرین نقاش، رخسانہ جبین، نگہت فاروق وغیرہ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سارے نام قابل ذکر ہیں۔

شبنم عشائی کا پورا شعری سرمایہ نثری نظموں پر مشتمل ہے۔وہ اپنا ایک منفرد لہجہ اور اسلوب رکھتی ہیں۔ان کی نظمیں مختلف النوع موضوعات کو محیط ہیں۔ان کی نظموں میں محرومی، یاسیت اور شکستگی کا سایہ نظر آتا ہے لیکن باوجود اس کے وہ تلخی اور درشتی یا قنوطیت کو اثر انداز ہونے نہیں دیتی ہیں۔اکیسویں صدی میں میڈیا کی گونج چہارسوں گونج رہی ہے، صارفیت کا سیلاب سا امڈ آیا ہے، ٹیلی وژن، کمپوٹر، ٹیلی فون وغیرہ نے ہماری تہذیبی وثقافتی ترجیحات کو الٹ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ایک ایسے بحران نے جنم لیا ہے کہ عصر حاضر کا ہر ایک فرد کسی نہ کسی طرح کے ذہنی کرب میں اور ذہنی انتشار کا شکار ہے۔اس انتشار کی عکاسی شبنم عشائی کی نظموں میں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ایک نظم مثال کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

خوشی چھوٹی نہیں/دکھ سا ہے/من مسافر ہے/جانے کن زمانوں کی/طراوت کھوجنے/ہر پل سفر میں رہتا ہے/بنجر سرزمینوں میں خنک چشموں کے/خواب بودیتا ہے/تعبیریں پھوٹتی نہیں/دکھ اگ جاتا ہے/دکھ جب اگنے لگتا ہے/من کی ساری نمی/لے لیتا ہے /آنکھوں کی نمی اور خواب/دونوں سوکھ جاتے ہیں/اور دکھ/بس جاتا ہے۔ (شبنم عشائی)

ترنم ریاض کئی اعتبار سے ادبی حلقوں میں اپنی اہمیت ومعنویت رکھتی ہیں۔وہ ایک کامیاب افسانہ نگار، ناول نگار اور دور حاضر کی نباض شاعرہ ہیں۔وہ ایک لطیف اور نرم لہجے کی شاعرہ ہیں۔ایک عورت ہونے کے ناطے وہ خواتین کے مسائل ومعاملات اور ان کی نفسیات سے متعلق گہری واقفیت رکھتی ہیں، جس کا بین ثبوت ان کی شاعری میں ملتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری محض نسوائی مسائل تک ہی محدود ہے بلکہ ان کی شاعری میں بقول فرید پربتی ''عصر حاضر کے انسان کا بکھراؤ اور شکست خوردگی پورے شعری آب ورنگ کے ساتھ نمایاں ہوجاتی ہے۔''انھوں نے اپنے تازہ کارانہ اسلوبِ بیان کے ذریعے سے عمومی موضوعات کو بھی وسیع تناظر کے ساتھ بیان کیا ہے۔انھوں نے جہاں عصری حالات میں منہدم ہوتی انسانی اقدار اور سفاکانہ قوتوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے وہیں فطری طاقتوں کے

آگے انسان کی بے بسی کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اسے اپنی زندگی کی یادیں تڑپانے لگتی ہیں۔

یہ سرمئی بادلوں کے سائے / یہ شام کی تازہ تازہ سی رٹ / یہ گاڑیوں کی کئی قطاریں / یہ باغ میں سیر کرتے جوڑے / یہ بچوں کے قہقہے

سریلے / وہ دور سے کوکتی کویلیاں / یہ عکس پانی میں بجلیوں کا / چہار جانب میں شادمانی / مگر میں ہوں بے قرار مضطر / نہیں ہے اس شہر میں مرا گھر۔ (ترنم ریاض)

ترنم ریاض موضوعاتی تنوع اور تازگی احساس کی باز آفرینی سے ایک نئی دنیا خلق کرتی ہیں۔انھوں نے اپنے تازہ کارانہ پیرایۂ بیان سے عمومی موضوعات کی بھی وسیع تناظر میں پیش بندی کی ہے۔ان کے کلام میں فکر وآگہی، ذہنی بالیدگی اور بصیرت کے بہت سارے مدّ وجزر ایک نئے انداز میں ملتے ہیں۔ان کی شاعری انسانی جذبات ومحسوسات، انسانی کسم پرسی، عصری مسائل اور زندگی کی پیچیدگیوں کو روبرو کراتی ہے۔

نسرین نقاش کا شمار اکیسویں صدی کی ممتاز شاعرات میں ہوتا ہے۔نسرین نقاش کا بنیادی میدان اگرچہ غزل گوئی ہے لیکن ان کی نظمیں بھی فنی شعور، وجدانی کیفیات اور آشوبِ آگہی کے کامیاب مرقعے ہیں ان کا کلام ایک باشعور اور خود آگہی تخلیق کار کی تخلیقی اپج کا نتیجہ ہے، ان کے شعری آہنگ اور لفظیات سے ایک انوکھا پن چھلکتا ہے۔نسرین نقاش کی شاعری زبان وبیان کی خوبی کے ساتھ صدیوں سے جاری تلاش حقیقت کی ایک اہم کڑی بن گئی ہے۔

اکیسویں صدی کی خواتین قلم کاروں کی فہرست میں نصرت چودھری ایک ناقابل فراموش نام ہے۔ان کی نظموں کا مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ستائیس نظموں پر مشتمل یہ مجموعہ آزاد نظم کا بہترین نمونہ ہے۔''ہتھیلی کا چاند'' کے علاوہ ''دشت تنہائی'' اور ''لہریں چناب کی'' ان کی شاعری کے دوسرے مجموعے ہیں۔ان کی بیشتر نظموں کے موضوعات عورت اور مسائل ومعاملاتِ عورت کو محیط ہیں۔ عصر حاضر میں عورت پر جس قدر ظلم وستم روا رکھے جاتے ہیں، عورتیں جس طرح بنیادی حقوق سے محروم کر دی جاتی ہیں، عورت کی محرومیوں، حسرتوں اور ناکامیوں وغیرہ کو وہ اپنی نظموں میں بالخصوص پیش کرتی ہیں۔

ان کی نظموں میں عصر حاضر کے نامساعد حالات کے تئیں بغاوت کے آثار جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں لیکن وہ نعرہ بازی اور بے جا جذباتیت کی بجائے پُرامن طریقے کو پسند کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے یہاں کشمیر کی ظاہری فضا اور عصری مسائل کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔ وہ مشکل پسندی کی نہیں بلکہ سادہ و عام فہم زبان و بیان کی قائل ہیں۔ اپنی شاعری میں عام بول چال کی زبان استعمال کر کے مٹھاس کا رس اس قدر بھر جاتی ہے کہ ہر دل عزیز زبان بن جاتی ہے۔ مثلاً

اپنی ہی گرمی سے جل کر اس طرح سوکھا چنار
دیکھتے ہی دیکھتے پھر تنہا ہو گیا چنار
جس کے سائے میں کسی نے پیار کا رستہ چنار
یاد آئے گا مجھے برسوں وہی اونچا چنار

رخسانہ جبیںؔ اپنے منفرد اسلوب اور لب ولہجہ کے ساتھ نسوانی جذبات کا بھرپور اظہار اپنی نظموں اور غزلوں میں کر رہی ہیں۔ ذاتی محسوسات اور حسن و عشق کی نیرنگیوں کے علاوہ وہ زندگی کی سچائیوں، فرد کی محرومیوں، کربناکیوں، زمانے کی بکھرتی قدروں کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ بے ساختہ لب ولہجہ ان کی شاعری کو معنویت کی وسعتوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ مدثر لالیؔ کے شعری مجموعے ''بکھرے لمحے'' میں اگرچہ نظم و غزل کے کامیاب نمونے ملتے ہیں لیکن ان کا بنیادی میدان غزل گوئی ہی ہے۔ ان کے یہاں جذبے کی صداقت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اُن کے تجربات ذاتی نوعیت کے ہیں۔ پروین راجہؔ زندگی کے متنوع پہلوؤں پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ عصری حسیت کو اپنی شاعری میں جگہ دینے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں رچاؤ اور پختگی کے ساتھ ساتھ تازہ کاری بھی ہے۔

ان شعرا کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر سے وابستہ مظفر ایرجؔ، اشرف ساحلؔ، فاروق مضطرؔ، مشتاق مہدیؔ، اشرف عادلؔ، پریمی رومانیؔ، پرویز مانوسؔ، صاحبہ شہریارؔ، نکہت فاروقؔ، سلمیٰ فردوسؔ، عابدہ احمدؔ، ستارہ نرگسؔ، عائشہ مستورؔ وغیرہ ایسے تخلیقی فن کار ہیں جو اکیسویں صدی کے اس بدلتے منظر نامے میں نہ صرف غزل بلکہ دوسری شعری اصناف کی روایت کو اپنی فکری و تخلیقی صلاحیتوں سے آراستہ کرنے میں سرگرم

عمل ہیں۔ان میں سے بیشتر کے مجموعے بھی منصۂ شہود پر آئے ہیں۔ان کے یہاں موضوعات کا تنوع اور ہیئتی وتکنیکی سطح پر نئے نئے تجربات بدرجہ اتم موجود ہیں۔آزاد نظم، معرا نظم، نثری نظم کے قابل قدر نمونے انہوں نے اردو دنیا کو تفویض کیے ہیں۔ان کی شاعری میں کربِ ذات، عصری شعور اور انسان کے اندر نمو پذیر محسوسات کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔زندگی کے عمومی مسائل اور موجودہ دور کے جدید رویّوں کو وہ بڑی سلیقہ مندی سے اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔اس مختصر جائیزے سے اس حقیقت کا اعتراف ہو جاتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں شعرا و شاعرات کا ایک بڑا حلقہ اس روایت کو کامیاب اور زرخیز بنانے میں کوشاں ہے اور اس کا مستقبل سرسبز و شاداب نظر آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ حامدی کاشمیری۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، ص ۱۷

۲۔ پروفیسر مجید مضمر۔''سامنا ظلمت کی تابانی کا ہے''، مشمولہ ''رنگ باتیں کریں''، ص ۲۷

۳۔ غلام نبی ناظر۔کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال، مشمولہ ''شیرازہ''، ص ۱۳۷

۴۔ قاضی غلام محمد۔پیش لفظ ''پھول شفق آنگن کے'' از حکیم منظور۔ص ۴

۵۔ پروفیسر حامدی کاشمیری۔''انہا ۱۹۹۸ء''، از رفیق راز

۶۔ نظم ''ایک نظم جنگلوں کے نام''، از فاروق نازکی

۷۔ غلام نبی ناظر۔کشمیر میں اردو شاعری کے پچاس سال۔مشمولہ۔شیرازہ۔کلچرل اکادمی جے کے۔ص ۱۳۵

۸۔ نظم ''غبار رفتہ''، از پرتپال سنگھ بیتاب

۹۔ منیب الرحمٰن۔ریاست کی نئی اردو شاعری۔مشمولہ ''تعمیر''، محکمہ اطلاعات۔جموں وکشمیر میں اردو ادب نمبر۔ص ۱۱۰

۱۰۔ حامدی کاشمیری۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب۔ص ۱۶۲

۱۱۔ محمد یوسف ٹینگ، پیش لفظ، ''پس آشکار'' از احمد شناس۔ص ۵

پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول: حیات اور کارنامے

ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں*

دنیا میں ہر دور میں چند ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں کے ذریعہ ہر طبقے کے لوگوں کے دلوں میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں اور ہمیشہ تعظیم کے ساتھ انہیں یاد کیا جاتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول ان میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں صرف کی۔ ذاتی زندگی میں وہ ایک انسان دوست اور باشعور خاتون تھیں۔

پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کی پیدائش پرانے ڈھاکہ کے ایک مشہور مسلم خاندان میں ہوئی۔ انکے والد ماجد کا نام سید علی محمد (نواب چھوٹن) ہے۔ انہوں نے ۱۹۷۱ میں قمر النساء سرکاری اسکول سے SSC اور ۱۹۷۳ میں بدر النساء گورنمنٹ کالج سے HSC پاس کیا۔ ۱۹۸۱ میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے اردو میں بی اے آنرز (B.A.Honour's) کے امتحان میں آرٹس فیکلٹی کے طالبات میں اول آئیں تھیں۔ اور اس لئے انہیں Salikun Nisa Gold Madel سے نوازا گیا۔ ڈاکٹر کنیز بتول کو اردو زبان میں ایک خاص ملکہ حاصل تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول بڑی اچھی اردو لکھتی تھی۔ چونکہ نواب خاندان سے ان کا تعلق تھا لہذا لب ولہجہ اور گفتگو کے انداز میں نوابی شائستگی اور سنجیدگی تھی۔ انہوں نے "بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷ تا ۱۹۹۰)" کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۲۰۰۳ میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۸۷ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرار کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول ڈھاکہ کے کئی مشہور تنظیموں کے ممبر تھیں۔ ایشیاٹیک سوسایٹی آف بنگلہ دیش اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے تاریخی سوسایٹی آف بنگلہ دیش کی تاحیات ممبر تھیں۔

* پروفیسر، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

شعبہ اردو کی وہ ایک محسن تجربہ کار استاد تھیں۔ اس شعبہ میں وہ تاحیات پروفیسر کے منصب پر کار فرما تھیں۔ آپ ۶ جولائی ۲۰۱۵ میں ڈھاکہ میں اس دار فانی سے رحلت فرمائی ۔

پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول اپنی زندگی کے آخری دم تک اردو زبان کی تدریس اور تحقیقی کام میں مصروف تھیں۔ انہوں نے بنگلہ، انگریزی اور اردو زبان میں بہت سارے تحقیقی مقالات لکھیں ہیں جو ملک اور غیر ممالک کے عالمی اور معیاری جریدوں میں بہ بڑی اہمیت کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ وہ بڑی احتیاط اور سوچ سمجھ کر اپنے خیالات کو قلم بند کرتی تھیں۔ انہوں نے بنگلہ، انگریزی اور اردو یہ تین زبان میں ۴۱ تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ ان کے مضامین کو موضوع کے لحاظ سے نذرلیات، اقبالیات، بنگلہ دیش، بنگلہ دیش میں اردو میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ بنگلہ دیش کے قومی شاعر قاضی نذرالاسلام اور اقبالیات سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔

انہون نے اردو دانوں کے سامنے بنگلہ دیش کے قومی شاعر نذرالاسلام کو آشنا کرنے کے لئے نذرل پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ وہ یہ ہیں "اردو زبان میں نذرل کا چرچا)" اور "آتش وگل"۔

آتش وگل میں انہوں نے نذرالاسلام کی تخلیقات کے اردو تراجم کو مرتب کیا ہے۔

ان کتابوں میں ان کا انداز بیان، زبان کی سلاست اور سادگی، لفظوں کا استعمال اور جملوں کی ترتیب سب کچھ قابل تعریف ہے۔

قاضی نذرالاسلام کے بارے میں پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کے نظریات کے کچھ اقتباس پیش خدمت ہیں۔

> قاضی نذرالاسلام نے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے بنگلا شاعری کی روایتی اسلوب سے بھی بغاوت کی۔ انہوں نے اس میں عربی وفارسی لفظوں کا استعمال کثرت سے کیا۔ اس لیے قدامت پرستوں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کا اسلوب مقبول ہوکر ہی رہا۔ عربی وفارسی کے اوزان اور بحور کا استعمال حافظ اور عمر خیام کی نظموں کے ترجمے بنگلہ ادب میں غزل کی ترویج اور زبان کی ہیئت کی تبدیلی یہی چیزیں تھیں۔ جنہوں نے نذرالاسلام کو

اردو دان طبقے سے قریب کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے دل کھول کر ان کی تخلیقات کے اردو تراجم پیش کیے۔

(آتش وگل، ص ۷)

نذرالاسلام کی شاعری کو نوائے وقت کہا جاسکتا ہے۔ ان کا زمانہ سیاسی، سماجی اور اقتصادی لحاظ سے بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ لیکن آتش بیانی اور زہریلی بانسری بجانے کے لئے وہ فضا بڑی سازگار تھی۔ اور اسی میں ان کی مقبولیت کا راز پنہاں تھا۔ بنگلہ ادب کی عظیم المرتبت شاعر ٹیگور نے بھی اپنے ڈرامہ "بسنت" کو ان کے نام معنون کرتے ہوئے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ یہ دراصل اس بات کا اعتراف تھا کہ شاعری سے صرف حسن پرستی اور دماغی عیاشی کرنا مناسب نہیں۔ قوم کو غلامی کی زنجیروں اور سامراجیت کے پنجوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی ادب اور شاعری سے مفید تعاون حاصل ہو سکتا ہے اور اس مشن کے لیے گھن گرج والی شاعری کی ضرورت تھی جو مردہ جسموں میں زندگی کی روح پھونک سکتی۔

(آتش وگل، ص ۸)

ان کی کتابوں اور مقالوں کی فہرست حسب ذیل ہیں۔

کتابیں

۱۔ উর্দু ভাষায় নজরুল চর্চা (اردو زبان میں نذرل کا چرچا)
نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، مئی ۲۰۰۱

۲۔ آتش وگل

نذرل کے منتخب نظموں، گیتوں، ناول، افسانوں اور ڈراموں کے اردو تراجم،
نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، مئی ۲۰۰۱

۳۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷۔۱۹۹۰)

ساہتیہ وگویشنا کیندرا، ڈھاکہ سے یہ زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں بنگلہ دیش میں مقیم سو سے زیادہ اردو ادیبوں اور شاعروں کی حیات اور ادبی کارنامے پر بحث کی ہیں۔ اس کتاب سے بھی ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> قیام بنگلہ دیش کے بعد افسانہ نویسی کے میدان میں احمد سعدی کہنہ مشق افسانہ نویس تھے۔ غلام محمد اور زین العابدین کے نام ممتاز افسانہ نگاروں میں لئے جا سکتے ہیں۔ ایوب جوہر، شام بارک پوری، ایم نعیم، س۔م۔ ساجد، قاضی محی الدین معیاری افسانہ نگار ہیں۔ غلام محمد کے افسانوں کی جڑیں بنگلا دیش کی سر زمین میں پوست ہیں۔ زین العابدین نے کہانیاں کم لکھیں لیکن معتبر لکھیں۔ غلام محمد اور زین العابدین کے بیشتر افسانوں کا موازنہ بنیادی تخیل کے لحاظ سے شوکت عثمان کے بنگلا افسانوں سے ہوسکتا ہے۔
>
> (بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء) ص ۴۱۲)

مقالے

۱۔ اردو (بنگلہ دیش میں اردو زبان اور ادب کی ترقی: ابتدا سے ۱۹۴۷ تک)
بنگلہ پیڈیا، بنگلہ دیش کا قومی انسائیکلو پیڈیا

۲۔ علی نواب چودھری

۳۔ نواب شمس الدولہ، حیات اور کارنامے (۱۷۷۰ تا ۱۸۳۸)، ادب، ڈھاکہ کا سہ ماہی ادبی اردو رسالہ،

مئی ۲۰۰۰، صفحہ ۶-۸

۴۔ نوشاد نوری کی شاعری، روح اے ادب، مغربی بنگال کے سہ ماہی ادبی رسالہ، اردو اکاڈمی، کلکتہ، مارچ ۲۰۰۲

۵۔ فلسفہ اقبال، مثالی قوم کے لئے مثالی ماں، اقبال اسٹاڈیز، رسالہ علامہ اقبال سوسائٹی، بنگلہ دیش، جنوری ۲۰۰۱، صفحہ ۶۶-۷۶

۶۔ نوشاد نوری کی یاد میں، ادب، ڈھاکہ کا سہ ماہی ادبی اردو رسالہ، مئی ۲۰۰۳

۷۔ احمد سعدی: حیات اور کارنامے

''قاضی نذر الاسلام'' (قاضی نذر الاسلام کے منتخب نظمیں اور گیتیں کے اردو میں تراجم از احمد سعدی)، نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، مئی ۲۰۰۱

۸۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ: حیات اور کارنامے

''اتیہاش'' بنگلہ دیش کی تاریخی سوسائٹی کا رسالہ، ڈھاکہ ۱۴۱۰ بنگلہ سال، بنگلہ دیش، ص ۶۶-۷۶

۹۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب: ایک مختصر جائزہ

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، جنوری تا دسمبر ۲۰۰۴، صفحہ ۱۱۵-۱۲۰

۱۰۔ سید شرف الحسینی کی شاعری پر ایک نظر

روح ادب، مغربی بنگال کے سہ ماہی ادبی رسالہ، اردو اکاڈمی، کلکتہ، جولائی-دسمبر ۲۰۰۴، صفحہ ۵-۱۰

۱۱۔ بنگلہ دیش کی اردو شاعری میں مقامی خصوصیات کی عکاسی

تحقیقی رسالہ الماس، جلد ۷، ۲۰۰۲، شعبہ اردو، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور سندھ، پاکستان

۱۲۔ مولانا عبیداللہ سہروردی

اگر و پاتھیک، ماہوار بنگلہ مجلّہ، اسلامک فاؤنڈیشن، بنگلہ دیش، ۲۲ اکتوبر ۱۹۸۷، صفحہ ۳۵-۳۶

۱۳۔ اقبال کی نظر میں عورت

اقبال اسٹاڈیس، رسالہ علامہ اقبال سنگساد،

بنگلہ دیش، مارچ ۱۹۸۸، صفحہ ۲۶-۳۱

۱۴۔ اقبال: ایک کامل انسان

اقبال اسٹاڈیس، رسالہ علامہ اقبال سنکسد،

بنگلہ دیش، اپریل ۱۹۹۸، صفحہ ۷۴-۷۵

۱۵۔ ڈھاکہ شہر میں اردو اور فارسی ادب کا چرچا (۱۸۰۰-۱۹۴۷)

انسانیت کے ترقی یافتہ تحقیق کے مرکز

مقالے کا مجموعہ جلد نمبر ۵، ڈھاکہ یونیورسٹی،

جون ۱۹۸۹، صفحہ ۵۵-۷۸

۱۶۔ سرسید احمد اور ڈاکٹر اقبال

اقبال اسٹاڈیس، رسالہ علامہ اقبال سنکسد،

بنگلا دیش، اپریل ۱۹۸۸، صفحہ ۲۶-۳۱

۱۷۔ اقبال اور جمہوریت

اقبال اسٹاڈیس، رسالہ علامہ اقبال سنکسد،

بنگلا دیش، اپریل ۱۹۸۸، صفحہ ۵۸-۶۱

۱۸۔ نواب سید محمد آزاد

الاکبر، ڈھاکہ، اگست ۱۹۹۱، صفحہ ۴-۵

۱۹۔ بنگلہ دیش کا مایہ ناز مصور زین العابدین

شمسی گزٹ، اردو رسالہ، ڈھاکہ، دسمبر ۱۹۹۰، صفحہ ۳۶-۴۱

۲۰۔ علامہ اقبال کی شاعری میں معاصرین سیاست کے اثرات

بنگلہ دیش کی تاریخی سوسائٹی کا رسالہ، ڈھاکہ ۱۹۹۱، صفحہ ۱۲-۲۱

۲۱۔ خان بہادر علی نواب چودھری کی حیات اور کارنامے

بنگلہ دیش کی تاریخی سوسائٹی کا رسالہ، ڈھاکہ ۱۹۹۳، صفحہ ۳۴۸-۳۶۱

۲۲۔ نذیر احمد کی ناول کی روشنی میں عورتوں کی اصلاح

انفینٹی ویرائٹی، سماج اور ادب میں عورتیں، یونیورسٹی پریس لیمیٹڈ، ڈھاکہ، ۱۹۹۴، صفحہ ۱۹۵-۱۹۹

۲۳۔ احسن احمد اشک سے ایک گفتگو

فنون، سہ ماہی اردو رسالہ، لاہور، جنوری-اپریل، ۱۹۹۶، صفحہ ۱۱۰-۱۱۴

۲۴۔ ڈھاکہ کے فارسی گو شاعر سید محمد باقر طباطبائی

دانش، سہ ماہی رسالہ، سردی ۱۹۹۵، ثقافتی مشیر کے دفتر، اسلامی پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول: حیات اور کارنامے

مک ریپبلک آف ایران، اسلام آباد، پاکستان، صفحہ ۱۹۵-۱۹۹

۲۵۔ عبدالغفور شاہباز کی شاعری میں ہندوستانی ثقافت

روح ادب، مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ، مارچ-اکتوبر ۱۹۹۷، صفحہ ۴۳-۴۹

۲۶۔ بنگلہ دیش میں اردو افسانوں کی رفتار

بنگلہ دیش کی تاریخی سوسائٹی کا رسالہ، ڈھاکہ ۲۰۰۶

۲۷۔ اردو زبان میں نذرل کا چرچا

رسالہ نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، پیدائش نذرل کے سالگرہ کا رسالہ، دسمبر ۱۹۹۹

۲۸۔ سیدہ صغرا سبزاواری: حیات اور کارنامے

انکشاف، سہ ماہی ادبی اردو رسالہ، ڈھاکہ، جون-جولائی-اگست، ۱۹۹۹

۲۹۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب کا مختصر جائزہ (۱۹۴۷-۱۹۷۰)

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، سال-۱، جلد-۱، جنوری-دسمبر ۲۰۰۴

۳۰۔ ام عمارہ کی افسانہ نگاری

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، سال-۲، جلد-۲، جنوری-دسمبر ۲۰۰۵

۳۱۔ بنگلہ دیش میں اردو تحقیق و تنقید (۱۹۴۷ تا حال)' ان کا ایک اور عمدہ مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے

بنگلہ دیش میں اردو زبان کے تحقیقی وتنقیدی سفر کے آغاز اور ارتقا کی تاریخ کو قارئین کے سامنے آسان اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ یہ مقالہ ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو، سال-۳، جلد-۳، جنوری-دسمبر ۲۰۰۶ میں شایع ہوا ہے۔

۳۲۔ مباہلہ کی اہمیت

نیوز لیٹر، جلد-۲۹، ایشو:۶، نومبر-دسمبر ۲۰۰۶، ثقافتی مشیر کے دفتر، ایمبیسی آف دا اسلامک ریپبلک آف ایران، ڈھاکہ، بنگلادیش

۳۳۔ فاطمی کوثر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی رو

نیوز لیٹر، جلد-۲۹، ایشو:۴، جولائی-اگست ۲۰۰۷، ثقافتی مشیر کے دفتر، ایمبیسی آف دا اسلامک ریپبلک آف ایران، ڈھاکہ، بنگلادیش

۳۴۔ قتیل شفائی شخصیت اور فن

خیال، رسالہ اردو، جون ۲۰۰۸، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

۳۵۔ اقبال کا نیا زمانہ اور نیا جہان

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، جلد-۱، ۲۰۰۸، شعبہ اردو،

۳۶۔ اقبال کی شاعری میں انسانیت کا تصور

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، جلد-۲، ۲۰۰۹، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی

۳۷۔ ثقافت ڈھاکہ کے کئی پہلو

بنگلہ دیش کی تاریخی سوسائٹی کا رسالہ، دسمبر ۲۰۱۰، ڈھاکہ، ڈھاکہ یونیورسٹی

۳۸۔ اقبال کا نظریہ عشق

ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو، جلد-۳، ۲۰۱۰، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی

۳۹۔ ڈھاکہ کے گم شدہ خوراک

ڈھاکائی کھابار، بنگلہ دیش ایشیاٹک سوسائٹی، جون ۲۰۱۰، صفحہ ۲۴۹-۲۶۲

۴۰۔ ڈھاکہ کے خوراک پروسنے کا طریقہ
ڈھاکائی کھابار، بنگلہ دیش ایشیاٹک سوسائٹی، جون ۲۰۱۰، صفحہ ۲۶۳
۴۱۔ حسینی دالان (امام باڑا)
ڈھاکہ کوش، بنگلہ دیش ایشیاٹک سوسائٹی، جون ۲۰۱۲، صفحہ ۴۰۸

"علامہ اقبال کی شاعری میں انسانیت کا تصور" ان کا ایک عمدہ مقالہ ہے۔ جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ اقبال صرف ایک شاعر ملت ہی نہیں بلکہ وہ ایک شاعر انسان بھی ہیں۔ اقبال کا نیا زمانہ اور نیا جہان اس مقالے میں انہوں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال دنیا کی بے حسی سے بے قرار ہو کر نئی تخلیقی دور اور انقلاب کے خواہشمند تھے اور ایک مرد مومن کی تلاش میں تھے۔

ڈاکٹر کنیز بتول نے بڑی مہارت سے علامہ اقبال کے افکار، اردو زبان و ادب کی ترقی، مرزا غالب، اردو ناول، افسانہ نگاری وغیرہ پر روشنی ڈالی ہیں۔

علاوہ ازیں جن مشہور ادیب اور شاعروں پر انہوں نے اپنا قلم اٹھایا ہے ان میں مصور زین العابدین، ۔شاعر باقر طباطبائی، قاضی نذر الاسلام، نوشاد نوری، احمد سعدی، سر سید احمد، قتیل شفائی ،علامہ اقبال، نذیر احمد، نواب سید محمد آزاد، مولانا عبید اللہ سہروردی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان کے زیادہ تر مقالات سرزمین بنگلہ دیش کی بھولی بسرے اور گمنام ہستیوں سے متعلق ہیں۔ جن کے کارناموں کو اہل وقت نے فراموش کیا تھا۔ ڈاکٹر بتول نے ان شخصیات کو از سر نو اجاگر اور روشناس کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہے۔ جن میں احسن احمد اشک، علی نواب چودھری، نواب شمس الدولہ، عبد الغفور شہباز،

ام عمارہ، سید شرف الحسینی اور شائستہ اکرام ہیں۔

ان سب مقالات کے ذریعے انہوں نے اپنے لیے ایک الگ مقام بنالیا ہے۔

مأخذ

(۱) پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، آتش وگل، نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ، بنگلہ دیش

(۲) انجمن ادب بنگلادیش کا ترجمان، سہ ماہی ادب ڈھاکہ ۲۰۰۰ء

(۳) پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، بنگلادیش میں اردو ادب، بنگلہ، اردو ساہتیہ فاونڈیشن ۲۰۱۵ء

(۴) "ادبیات اردو میں بنگلا دیش کی خدمت" (بنگلہ زبان میں) ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، کامیاب پبلکیشن ڈھاکہ ۲۰۰۲ء

(۵) پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، نذرل چرچا، نذرل انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ بنگلادیش ۱۹۹۸ء

۶۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول کا ذاتی فائیل

۷۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب (۱۹۴۷ء تا ۱۹۹۰ء)، ساہتیہ وگویشنا کیندرا، ڈھاکہ، ۲۰۲۰

بنگلہ دیش میں اردو ادب کے خدمت گزار: جلالؔ عظیم آبادی

حفصہ اختر*

[خلاصہ: جلالؔ عظیم آبادی بنگلا دیش کے ادبِ اردو کی ایک منفرد اور مقدر شخصیت ہیں۔ وہ بالخصوص شاعر کی حیثیت سے عصر حاضر میں اردو ادب کی دنیا میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ جلالؔ عظیم آبادی کی پیدائش ڈھاکا میں ہوئی لیکن انکے اجداد ازبکستان کے مشہور شہر ترمذ سے وابستہ رکھتے ہیں۔ ۱۱۰۵ھ میں انکے قدیم آبائی دلی میں آئے پھر بہار اور پھر قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ میں منتقل ہو گئے۔ انکی مادری زبان اردو ہے۔ بی ایس سی پاس کرنے کے بعد وہ کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ انکی طبع میلان غزل نگاری کی طرف مائل ہونے کی باوجود وہ شاعری کے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ انکے اشعار میں حقیقت پسندی، صاف گوئی، انکی تجربات و مشاہدات کی ترجمانی، حسن، صداقت، زندگی کی تصویریں اور معاشرے کی جھلکیاں دیکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ملک اور بیرونی ممالک میں منعقد ہوئے ان گنت مشاعرے میں شعر خوانی کر چکے ہیں۔ انکی ادبی خدمات صرف انکی شاعری ہی تک محدود نہیں بلکہ وہ نثری ادب کی تخلیق میں بھی نمایاں کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک افسانہ نگار اور مدیر بھی ہیں۔ بنگلا دیش میں اردو ادب کی ترقی اور ترویج میں انکی سرپرستی اور سماجی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر مقالہ میں حیاتِ جلالؔ عظیم آبادی اور انکی ادبی کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔]

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

آزادی کے بعد بنگلہ دیش میں اردو کی شدید مخالفت کے باوجود جن ہستیوں نے اردو ادب و شاعری کے فن کو دل و جان سے اپناتے ہوئے اس کی آبیاری کو فرضِ اول سمجھا ان میں جلالؔ عظیم آبادی ایک اہم نام ہے۔ عصر حاضر میں وہ بنگلہ دیش میں اردو ادب کی مختلف اصناف کے حوالوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ شاعری، نثر نگاری اور صحافت ہر ایک میدان میں ان کی خدمات قابل توجہ ہیں۔ لیکن ان اصنافِ سخن میں سے انکی شناخت شاعری کے حوالے سے بہت خاص اور اہم ہے۔ شعر و ادب کا ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے۔ شاعری صرف انکا شوق ہی نہیں بلکہ فطرت بھی ہے۔ چنانچہ زیرِ نظر مقالہ میں جلالؔ عظیم آبادی کی زندگی اور انکی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی۔

پیدائش اور سلسلۂ نسب:

انکا پورا نام سید جلال الدین احمد ہے اور قلمی نام جلالؔ عظیم آبادی۔ انکے والد سید معیز الدین ایک تاجر تھے۔ آپ بنگلہ دیش کے ڈھاکہ ضلع کے پرانہ شہر، لال باغ علاقہ میں ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔

انکے اجداد مغل بادشاہ شاہ عالم کی دعوت پر ۱۸۰۲ء میں ازبکستان کے مشہور شہر ترمذ سے دلی آئے اور قاضی القضات عہدے کی زمہ داری نبھائی۔ جلالؔ کے دادا کے پردادا سید شجاع الدین کے ساتھ بادشاہ کی نواسی شہزادی گیتی آرا بیگم کی شادی ہوئی لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ انکو شاہی فرمان کے ذریعہ صوبہ بہار کے جاگر عطا ہوئی اور علی خان بہادر کے خطاب سے نوازے گئے۔[۱] ڈھاکہ کے مشہور شاعر نوشاد نوری نے انکے اجداد کے بارے میں لکھا ہے:

> ''بہار میں سید شجاع الدین کی دوسری شادی ہوئی اور اس سے نسل آگے بڑھی۔ صوبہ بہار کی معروف شخصیت ڈاکٹر سید رفیع الدین رئیس نالندہ انکے پوتے اور جلال عظیم آبادی کے دادا تھے..... بہار کی معروف شخصیتوں میں سید محمد حسین عہدِ انگلشیہ میں وزیر تعلیم اور مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ جلال عظیم آبادی کے والد کے پھوپھا اور سید سلیمان ندوی والد کے رشتے کے ماموں تھے۔ بہار کے مشہور افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی جلال صاحب کے ماموں ہیں۔''[۲]

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں جلالؔ کے والد صاحب مع اپنی بیوی بچے بہار چھوڑ کر ڈھاکہ آ گئے۔ اور یہاں جلالؔ پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۷ء میں انکے والد صاحب کا انتقال ہوا۔

تعلیم:

جلال عظیم آبادی کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے شروع ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لال باغ کے رحمت اللہ اسکول میں داخلہ لیا۔ اس اسکول سے انہوں نے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ پٹنہ چلے گئے۔ کیونکہ انکے والد صاحب کے انتقال کے بعد معاشی حالت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور چونکہ انکے خاندان کے ادھے لوگ پٹنہ رہتے تھے اور ابھی بھی وہاں آباد ہے اس لئے وہ پٹنہ میں منتقل ہو گئے۔ پٹنہ کے کمرس کالج سے مٹرک اور بی یم کالج سے اے۔ ان۔ سی پاس کر کے کشمیر چلے گئے۔ کشمیر کے سری نگر سے بی ایس سی پاس کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جلال عظیم آبادی اپنی تعلیم ختم کر کے ڈھاکہ واپس چلے آئے۔[۳]

شغل:

ملک آزاد ہونے کے بعد جلال نے تجارت کو اپنی ذریعہ معاش انتخاب کیا۔ آزادی کے ڈیڑھ سال بعد انہوں نے تالا کی ایک فیکٹری قائم کی اور یہاں سے انہیں کافی ترقی ملی۔ ۱۹۹۰ء میں وہ جاپان چلے گئے۔ جاپان میں کار کا کاروبار کرتے رہے۔ ری کنڈیشنڈ کار خرید کر بنگلہ دیش بھیجتے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں وہ ٹوکیو یونیورسٹی میں بحیثیت پارٹ ٹائم ٹیچر وابستہ رہے۔ وہاں تقریباً ۸۰ طلباء کو اردو بولنا سیکھاتے تھے۔ وہاں چھے مہینے وابستہ رہے۔ ۱۹۹۵ء کے اخر میں جلالؔ کو کسی ضرورت کی وجہ سے فوراً بنگلہ دیش واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد سے لے کر حالی تک بنگلہ دیش میں مختلف تجارت کے ساتھ منسلک ہیں اور دن کے دن اور بھی ترقی کر رہے ہیں۔[۴]

جلالؔ اردو ادب کی خدمات کے ساتھ ہی سماجی کاموں میں لازوال کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ امریکہ میں مقیم این جی او تنظیم ''فرنڈس آف ہیومنیٹی (Friends of Humanity) کی بنگلادیش برانچ کے چیئر مین ہیں۔ اس کے ذریعے غریب طلبا کی تعلیم مفت میں دینے کا کام کر رہے ہیں۔ اور ایک این جی او'' وباٹ ہلپارس (OBAT HELPERS BD) کے چیئر مین بھی ہیں۔[۵]

ازدواجی زندگی:

جلالؔ کی شادی ۱۹۷۴ء میں ڈھاکہ کے لال باغ میں رہائشی معزز خاندان کے مرحوم محمد احسان کریم کی صاحب زادی محترمہ بلقیس بیگم کے ساتھ ہوئی۔ جن کے بطن سے ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں اور وہ سب کے سب ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں۔ ۶ء

جلال عظیم آبادی کے ادبی کارنامے:

جلالؔ کی مادری زبان اردو ہے۔ انہیں اس زبان کے لئے بے انتہائی محبت ہے۔ جس کی وجہ سے ایک تاجر ہونے کے باوجود انہوں نے خود کو اردو ادب کی خدمت میں منسلک کیا۔ اور اردو ادب کی دنیا کو اپنے بہتر سے بہتر تخلیقی کارنامے سے روشناس کر رہے ہیں۔ اردو ادب کی طرف انکے اس قدر لگاؤ انہیں ورثے میں ملا ہے۔ جس کے بارے میں قارئین کو انکے سلسلۂ نسب سے اندازہ ہو چکا ہوگا۔ اس بارے میں مرحوم شاعر نوشاد نوری کا نظریہ یہ ہے:

> ''خاندان کے معاشرتی اور معاشی پس منظر کا اجمالی بیان اس لئے ضروری ہو گیا ہے تا کہ اس کی روشنی میں جلال عظیم آبادی کے افتادِ طبع اور انفرادی ذوق کا جائزہ لیا جا سکے۔'' ۷ء

بنگلہ دیش میں معروف اردو شعرا میں جلالؔ ایک قابل ذکر نام ہے۔ وہ شاعری کے زیادہ تر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ لیکن انکی طبع میلان غزل نگاری کی طرف ہے۔ جلالؔ کے اولین شعری مجموعہ ''کہکشاں'' کے نام سے پہلی مرتبہ ۲۰۰۲ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ کا چوتھا ایڈیشن ۲۰۱۸ء میں منظرِ عام پر آیا۔ ۱۲۳ صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں انکی ۱۳۳ غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور منقبت شامل ہیں۔ جن میں، ۷۱ غزلیں، ۱۸ نظمیں، ۱۵ قطعات، ۱۰ رباعیات، ۴ ثلاثیت، ۳ منقبت، ۴ نعت، ایک حمد اور ایک دعاء ہیں۔

جلالؔ کی شعر و شاعری کا سفر ایک طویل عرصے سے جاری ہے اور اس حوالے سے انہوں نے ہر جگہ بنگلہ دیش

کی مبسوط نمائندگی بھی کی ہے۔ جب وہ مٹرک کے طالب العلم تھے اس وقت سے شوق شعر و شاعری کا ظہور ہوا۔ لیکن انہیں مکمل شاعری نہیں کہی جاسکتی۔ ۱۹۶۶ء میں ایک جشن مشاعرہ کشمیر میں منعقد کیا گیا تھا اور جگناتھ آزاد نے اس مشاعرے کی صدارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ اس محفل مشاعرے میں جلالؔ نے اپنی شاعری کی پہلی غزل پڑھی تھی۔ ذیل میں انکی پہلی غزل سے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

چھپائے دل میں محبت کی آبرو رکھیو
نہ ہوگی پوری مگر دل میں آرزو رکھیو
چرا کے لے گئے وہ جانے پھر کہاں مجھ سے
ہر ایک دل میں مرے دل کی جستجو رکھیو
برا ہوں یا کہ بھلا پھر بھی میں تمہارا ہوں
خدایا حشر میں میری بھی آبرو رکھیو.....''۸

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکی غزلیں جدید رنگ میں انسانی جذبوں کے اظہار کا خوب صورت منظر نامہ پیش کرتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کو اپنے زاویۂ نظر سے دیکھا ہے، پرکھا ہے، برتا ہے، محسوس کیا ہے اور ان تجربات کی پیکر تراشی اپنی نظموں میں انتہائی سلیقے سے کی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا حمد، دعا و نعت سے ہوئی ہے۔ مثلاً:

تو قریب رہ کے جو دور ہے
کوئی راز اس میں ضرور ہے
تیرے رمز کو جو سمجھ سکے
کہاں کس میں اتنا شعور ہے۔۹

جلالؔ آسان لفظوں میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس میں بے ساختگی ہوتی ہے وہ فکر کو طویل ہونے نہیں دیتے بلکہ سادگی سے اپنی بات کہہ دیتے ہیں۔ انکی غزل کے زیادہ تر موضوعات محبت، محبوب، عشق، حسن، خفا، بے وفائی پر مبنی ہیں۔ محبت کے بارے میں جلالؔ کہتے ہیں: ''محبت وہ چیز ہے جو ہر شے

میں پائی جاتی ہے، دین ہو یا ملک محبت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتی۔'' ۱۰؎ عشق کے بارے میں انکی غزل سے ایک شعر بطور مثال پیش کرتی ہوں جہاں وہ پہلے تو عشق کی بندگی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''عشق ہی زندگی عشق ہی بندگی
عشق کی شمع ہر سو جلایا کرو'' ۱۱؎

اور پھر کہتے ہیں:

''حق پرستی یہاں جرم ہے جلالؔ
بات دل کی زباں تک نہ لایا کرو'' ۱۲؎

جلالؔ ایک حساس شاعر ہیں۔ وہ عام فہم لفظوں سے اپنے لطیف خیالات کو بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کے ذریعے اپنے احساسات کو اس طرح بیان کیا ہے جسے پڑھکر قارئین بھی وہی محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

''بندو ہ پرور مجھ پہ اب اتنا کرم فرمایئے
درد ہی بن جایئے یا پھر دوا بن فرمایئے
خود کو پردے میں چھپا کر دیکھتے ہیں مجھ کو آپ
آپ کو میری قسم ہے یوں نہ اب تڑپایئے
ہوش میں آتا نہیں ہے ٹھوکرے کھانے کے بعد
کس قدر نادان ہے دل آپ ہی سمجھایئے
کہکشاں تو ہم نے راہوں میں سجائی ہے مگر
آپ کی مرضی پہ ہے آپ آیئے نہ آیئے'' ۱۳؎

جلالؔ نے دلکش انداز و الفاظ میں اپنے جذبات کی ترجمانی کی کوشش کی ہے۔ انکی شاعری حقیقت پسندی اور صاف گوئی پر مبنی ہے۔ انکے خیالات میں کوئی الجھن نہیں، یہ سادگی اور صفائی سے اپنے جذبات قاری تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ محبوب کے جمال کو دیکھ کر جو محسوس کرتے ہیں اور ان کے لئے دل میں جو بے قراری ہوتی ہے اسے اس طرح سے بیان کیا ہے:

''عجب کیفیت ہے اب اپنے باتوں کی
کہیں جان لے لیں نہ نازک دلوں کی . . .
ذرا دیر تک تو کھولی رکھئے آنکھیں
ذرا پیاس بجھتی رہے مے کشوں کی
نظر چند ، سورج پہ جائے نہ ہرگز
اگر دیکھئے شکل ان مہہ وشوں کی . . .
جلالؔ ان کو دل میں چھپا کر ہی رکھنا
نظر لگ نہ جائے کہیں دشمنوں کی ''[۱۴]

عشق میں صرف مسرت ہی نہیں غم سے بھی دو چار ہونا پڑتا ہے۔ پیار محبت کے ساتھ ساتھ درد، غم، بے وفائی کے جذبات کی عکاسی بھی جلالؔ کی غزلوں کی اہم خصوصیات ہیں جہاں کچھ کھو جانے کا احساس اور درد انگیز فضا بھی ملتی ہے۔ مثلاً

''وفا کا یہ صلہ مجھ کو ملا ہے
میری آنکھوں میں دریا بھر دیا ہے'' [۱۵]

اور پھر ان غموں کو بھلا کر زندگی کو جاوداں بنانے کے لئے جلالؔ ارشاد کرتے ہیں:

''حسن کا بھروسہ کیا عشق کی نظر کب تک
آؤ چند لمحوں کو جاوداں بنا تے ہیں
سلسلہ محبت کا یوں جلالؔ چلتا ہے
وہ فریب دیتے ہیں ہم فریب کھاتے ہیں'' [۱۶]

انکی شاعری میں عشق، محبت، محبوب کے سوا اور بھی کئی موضوعات ابھار کر پیش آتے ہیں مثلاً زندگی کی تصویریں، معاشرے کی تصویریں، زمانہ کو لے کر لوگوں کی امیدیں، مایوسی، زندگی کے گوناگوں مسائل کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ تصدیق کے لئے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں:

''نئی صدی سے تھی وابستہ کتنی امیدیں
محرموں کو وداع کر کے آئیں گی عیدیں

ہم اپنے اور پرائے میں پیار بانٹیں گے
سکون پائیں گے سوئیں گے چین کی نیندیں
صدی تو بدلی مگر آدمی بدل نہ سکا
یہ قتل و خون کے چنگل سے بھی نکل نہ سکا
فریب و مکر و جفا میں ذرا کمی نہ ہوئی
محبتوں کا دیا ایک پل بھی جل نہ سکا ''۱۷

اس قسم کے اور ایک شعر دیکھئے:

''کچھ بولو اے سیاست کے علمبردارو
کتنے سر چاہئیں بزار جمانے کے لئے''۱۸

پھر انہوں نے کہا:

''دائرہ کھینچ دیا ہے مرے مستقبل کا
اور پھر شرط کہ اس حال میں رہنا ہوگا
زندگی ہے جو عطا پھر کوئی شکوہ کیسا
زندہ رہنا ہے تو ہر روپ میں ڈھلنا ہوگا'' ۱۹

جلال کی شاعری میں وطن پرستی کے جذبات کا اظہار بڑے مختلف دھنگ سے ہوا ہے۔ جلال کو اپنی مٹی سے پیار ہے۔ اس مٹی کو وہ محبوبہ کی طرح چاہتے ہیں۔ محبوبہ اور وطن میں وہ فرق نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی نظموں میں اپنی وطن کی سوندھی خوشبو ملتی ہے۔ وطن کی ہر شے اور ہر نظارے پر انکی نظر جاتی ہے۔ وہ وطن کی محبت میں سرشار ہو کر کہتے ہیں:

ہوائیں سرسراتی ہیں کہ گویا گنگناتی ہیں
فضائیں کیف کی مستی میں آکر جھوم جاتی ہیں
میں اس دھرتی کی ندیوں کو بھی گاتے گیت دیکھا ہے

مرا پیارا وطن جیسے کوئی جنت کا ٹکڑا ہے.....
مصیبت سے نہ گھبرانا حوادث سے بھی ٹکرانا
ہوائیں گر موافق ہوں تو لہروں سا مچل جانا
زمانے نے بہت کچھ میری دھرتی سے بھی سیکھا

مرا پیارا وطن جیسے کوئی جنت کا ٹکڑا ہے.....
نہیں ممکن مٹا دے کوئی بھی نام و نشاں اس کا
ہتھیلی پہ لئے ہے جان ہر ایک مدخواں اس کا
جلالؔ اس حوصلے کو بارہا دنیا نے پرکھا ہے
مرا پیارا وطن جیسے کئی جنت کا ٹکڑا ہے'' ۲۰

جلالؔ نے ہجرت کے دکھوں کا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ نیز ی ضرورت کی وجہ سے انہیں ایک طویل عرصے ملک سے باہر رہنا پڑا اس وقت بھی وطن کی یاد انہیں بہت ستاتی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

''بے وطن کر دیا مجھکو بھی ضرورت نے جلالؔ
ورنہ کیو خاکِ وطن تجھ سے کنارا ہوتا'' ۲۱

جلالؔ انسانی رشتوں کی بہت قدر کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی رشتوں کے احترام کے احساس کی خوبصورت تصویر دل کش انداز بیان کے ساتھ ملتی ہے جو قارئین کو سحر طاری کر دیتی ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ قریبی رشتوں میں جب کھٹاپن آ جاتا ہے تو اس سے جلالؔ کو بہت صدمہ پہنچتا ہے۔ اس احساس کو انہوں نے کچھ اس طرح سے بیاں کیا ہے۔

'' عزیز رکھنا ہے گر مجھ کو دوستوں کی طرح
کبھی ملا نہ کرو تم منا فقوں کی طرح
یہ کیسی دوستی کیسی رفاقتیں ہیں جلالؔ
سفر میں ساتھ ہو لیکن مسافروں کی طرح'' ۲۲

چونکہ جلال عظیم آبادی نے طویل عرصہ جاپان میں گزارا ہے اس لئے انکے مجموعہ میں جاپان کے موسم، حالات، حسن و جمال کے حوالے کئی نظمیں ملتی ہیں۔ ''ہدیۂ تہنیت'' کے عنوان سے ایک نظم ہے جو بہت خاص ہے۔ اس نظم کو بخدمت ولی عہد سلطنت جاپان و شہزادی مسا کو اووادا کی شادی کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ جو اب جاپان کے شاہی محل میں محفوظ ہے۔ شاعر مسا کو اووادا کی خوبصورتی، علم و ہنر کے بارے میں بیاں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'' شرم و حیا کی پیکر ہے یہ
مشرق کی ہر خو سے سجی ہے
علم و ہنر کی بات نہ پوچھو
مغرب کے زیور سے لدی ہے
ایسی جلوت ایسی عظمت
کس نے دیکھی کس نے سنی ہے''۔۲۳

جلال کی نظر میں عورت کا مقام بہت بلند ہے۔ اکثر معاشرے میں کردار نسوا کو کمزور سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اگر ایک عورت کی زندگی کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو یہ سامنے آئیگا کہ وہ مرد کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اعصاب کی مالک ہوتی ہے۔ ایک جانب عورت کسی باریک دھاگے کی طرح نرم و ملوک بھی ہے اس کے برعکس ضرورت پڑنے پر وہ پتھر کی طرح مضبوط بھی بن سکتی ہے۔ عورت ہی ہے جو اپنوں کے لیے بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کرنے سے بھی نہیں گھبراتی۔ عورت صرف عورت ہی نہیں ایک انسان بھی ہے۔ اوران خیالات کا ذکر جلال کی نظم میں ملتا ہے۔ مثلاً

''رہنمائی جو ملی ہے کبھی منزل کی طرف
پارساؤں کے لئے خطرۂ ایمان بھی ہو
ہم تو لغزش کو ادا جان کے چپ رہتے ہیں
کیونکہ عورت ہی نہیں ہو کوئی انسان بھی ہو''۲۴

جلالؔ عظیم آبادی مصرح کولیکر کاریگری نہیں کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود فن کے اعتبار سے ان کی شاعری بہت اہم ہے۔ انکی نظمیں شیریں الفاظ کے استعمال، موسیقیت اور غنائیت، دلکش تراکیب، تشبیہات کے خلاقانہ استعمال، پیکر تراشی، منظر نگاری اور مختلف ہیئتوں کے موزوں استعمال کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہیں۔ لفظوں کے استعمال، بحروں کے انتخاب، خیال کی اتار چڑھاو اور معاملہ بندی میں وہ خاص خیال رکھتے ہیں۔ مثلاً:

''آنسو بہاؤں راہ تکوں روز و شب گنوں
وہ جاتے جاتے مجھ کو یہی کام دے گئے
بدنام شہر میں ہوں میں اب انکے نام سے
میری وفا کا مجھ کو یہ انعام دے گئے''۲۵

جلالؔ یہ تو کہتے ہیں کہ وہ ایک شاعر عشق و محبت ہیں لیکن زندگی کے مختلف شے انکی شاعری کے موضوع بن کر قارین کے سامنے آچکا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تصوف کی جھلک بھی جگہ جگہ در آتی ہے۔ تصدیق کے لئے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

'' ہم مسافر تھے ذرا چین تو لینے دیتے
زندگی دینے کا احسان جتانے آئے'' ۲۶

''پالیا ہے رموز حقیقت
عشق کی آگ میں میں نے جل کے'' ۲۷

''دنیا کی تصویر یہی ہے
نفرت زیادہ پیار بہت کم ''۲۸

''انسانیت سے عاری ہے انسان کا وجود
کس کو شریف جانیں کسے معتبر کہیں'' ۲۹

عالمی مشاعرے میں شرکت:

جلال عظیم آبادی نے ملک اور بیرونی ممالک میں منعقد ہوئے ان گنت مشاعرے میں شعر خوانی کر چکے ہیں۔جن میں ۲۰۱۸ء میں امریکہ کے چھے اسٹیٹ میں، اسی سال کلکتہ میں، ۲۰۱۷ء میں دہلی، ۲۰۱۱ء اور ۲۰۱۲ء میں پاکستان میں منعقدہ عالمی مشاعرے میں انکی شرکت قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ بنگلور، کشمیر، پٹنہ، جمشید پور، حیدر آباد، جدّہ، سعودی عرب میں بھی انہوں نے شعر خوانی کر چکے ہیں اور وہاں بنگلہ دیش کی نمائندگی کی ذمہ داری آدا کی۔۳۰ عالمی مشاعرہ میں شرکت کو لے کر انکے ساتھ ایک دردناک حدصہ ہوا تھا۔ ۲۲، مارچ ۲۰۱۱ء کو کراچی کے عالمی مشاعرہ میں شرکت کے دوان مشاعرے پر گولی چلی تھی۔اس وقت وہ اسٹیز پر بیٹھے ہوے تھے۔اسصدصہ کو یاد کرتے ہوئے جلال آج بھی کانپ اٹھتے ہیں۔اس واقعہ کی یاد میں جلال کہتے ہیں:

''سنسناتی ہوئی گولیوں کی صدا
ہر طرف زخمیوں کی ہے آہ و بکا
لاش ہی لاش دیکھی تو گھبرا گئے
سوچتے ہیں کہاں سے کہاں آگئے۔۔
خون ناحق کبھی رائیگاں جائے گا؟
قتل کرکے بھی قتل تو پچھتائے گا
بھائیوں کے مظالم سے شرما گئے
سوچتے ہیں کہاں سے کہاں آگئے'' ۳۱

افسانہ نگاری:

نثر نگاری میں صنف افسانہ کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔جلال عظیم آبادی شعر و شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنی مہارت کا ثبوت دے رہے ہیں۔اب تک انکے دو اردو مختصر افسانے شائع ہو چکے ہیں۔وہ ہیں:

ا۔ناکردہ گناہی

۲۔ درد دل کے واسطے۔۳۲

دونوں افسانے بہت سبق آموز اور دلکش ہیں۔ بنگلہ دیش کے مشہور مترجم ہیکل ہاشمی نے جلال کے دونوں افسانوں کو بنگلا زبان میں ترجمہ کیا جو ہیکل کی کتاب ''بنگلہ دیشیر اردو چھوٹو گلپو'' (বাংলাদেশের উর্দু ছোটগল্প) میں شامل ہیں۔ یہ کتاب ۲۰۱۹ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوئی ہے۔۳۳

مدیر:

جلالؔ نے سہ ماہی رسالہ ''ادب'' ڈھاکہ سے جاری کیا تھا۔ وہ اس رسالہ کے مدیر تھے۔ جس کا پہلا شمارہ اگست ۲۰۰۴ء کو منظور عام پر آیا۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل ''ادب'' کا پہلا شمارہ میں کئی مضمون، نظمیں، کہانی اور غزلیں شامل ہیں ۔۳۴ یہ رسالہ بنگلہ دیش میں اردو ادب کو فروغ دینے کا ایک اہم ذریعہ بنا۔ لیکن چند شماروں کے بعد نا مساعد حالات کی بنا پر رسالہ بند ہو گیا۔

جلال ایک وجدانی شاعر ہیں۔ وہ اردو ادب کو فروغ دینے کے لئے کام کر رہے ہیں۔ گرچہ اردو ادب کے کئی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کرتے ہیں لیکن انکا طبعی میلان شعر و شاعری کی طرف ہے۔ نوشادؔ نوری نے جلالؔ کے کلام کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

> ''انکی غزلوں کے بارے میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ جدید میلان رکھنے کے باوجود روایت شکن اور قدامت دشمن نہیں ہیں اس کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انکی نسبت اس نسل اور مراشر سے ہے جہاں آبائی قدامت اور روایت گراں مایہ تہذیبی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس عقیدے نے ان کی غزل نگاری کے اسلوب و اظہار کو نکھار دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انکی شاعری میں روایت شکنی کہیں نہیں ملتی بلکہ قدیم ادبی روایت کی خصوصیات اور انفرادیت سے انہوں نے تخلیقی روایت سازی کی ہے۔''۳۵

ابوزر ہاشمی نے کہا ہے:

''جلال بنگلہ دیش میں اردو کی شدید مخالفت کے باوجود اس کی شجر کاری کا ذمہداری قبول کی ہے۔ ڈھاکے سے اردو زبان کا ایک پرچہ 'ادب' نکالتے ہیں۔ شاعری انکا شوق نہیں فطرت ہے۔ وہ اگر شعر نہیں کہیں گے تو خود پر ظلم کریں گے۔''۳۶

آخر میں کلکتہ کے پروفیسر علقمہ شبلی کی ایک رائے بخدمت قارئین پیش کرتی ہوں:

''جلالؔ عظیم آبادی ایک حساس شاعر ہیں۔ تجربات و مشاہدات کی ایک نئی دنیا ان کے سامنے ہے۔ انکی سلیقہ مندی اور خوش گفتاری سے یہ توقع بے جا نہیں کہ مستقبل میں مزید فتوحات سے ہم کنار ہوں گے اور نئی نئی منزلیں سر کریں گے۔''

ہم بھی پروفیسر صاحب سے متفق ہیں۔ اور دعا کرتی ہوں اللہ انہیں نیک حیات عطا فرمائے تا کہ اگے چل کر وہ بنگلہ دیش میں اردو ادب کی دامن کو اپنی تخلیقی کاموں کے ذریعے مالا مال کر سکے۔

حوالہ جات:

۱۔ جلالؔ عظیم آبادی، کہکشاں، دیباچہ، جوئیل فوٹو کاپی کارنر، ڈھاکہ، ۲۰۱۸ء، ص۔۳،۴

۲۔ نوشاد نوری، کہکشاں، جلالؔ عظیم آبادی اور روایتِ غزل، جوئیل فوٹو کاپی کارنر، ڈھاکہ، ۲۰۱۸ء، ص۔۴

۳۔ ایضاً، ص۔۵

۴۔ جلالؔ عظیم آبادی سے ایک گفتگو، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

۵۔ نوشاد نوری، جلالؔ عظیم آبادی اور روایتِ غزل، ص۔۳

۶۔ جلالؔ عظیم آبادی سے ایک گفتگو، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

۷۔ نوشاد نوری، جلالؔ عظیم آبادی اور روایتِ غزل، ص۔۵

۸۔ جلالؔ عظیم آبادی، کہکشاں، ص۔۲۲

۹۔ ایضاً، ص۔۱۱

۱۰۔ جلالؔ عظیم آبادی سے ایک گفتگو، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

۱۱۔ جلالؔ عظیم آبادی، کہکشاں، ص۔۴۹

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ایضاً،ص۔۵۵

۱۴۔ایضاً،ص۔۶۲

۱۵۔ایضاً،ص۔۱۲۳

۱۶۔ایضاً،ص۔۳۹

۱۷۔ایضاً،ص۔۱۱۱

۱۸۔ایضاً،ص۔۲۴

۱۹۔ایضاً،ص۔۱۱۸

۲۰۔ایضاً،ص۔۱۰۱،۱۰۲

۲۱۔ایضاً،ص۔۳۷

۲۲۔ایضاً،ص۔۸۱

۲۳۔ایضاً،ص۔۱۱۲

۲۴۔ایضاً،ص۔۱۰۶

۲۵۔ایضاً،ص۔۱۱۷

۲۶۔ایضاً،ص۔۳۸

۲۷۔ایضاً،ص۔۸۳

۲۸۔ایضاً،ص۔۸۸

۲۹۔ایضاً،ص۔۹۱

۳۰۔جلالؔ عظیم آبادی سے ایک گفتگو، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

۳۱۔ایضاً،ص۔۹۹

۳۲۔جلالؔ عظیم آبادی سے ایک گفتگو، ۲۷ ستمبر ۲۰۱۹ء

۳۳۔ہیکل ہاشمی، بنگلہ دیشیر اردو چھوٹو گلپو، گلپوکار، ڈھاکہ، ۲۰۱۹، ص ۱۴

۳۴۔سہ ماہی 'ادب'، جلال عظیم آبادی، برقی آرٹ پریس، ڈھاکہ، اگست ۲۰۰۴

۳۵۔نوشاد نوری، جلالؔ عظیم آبادی اور روایتِ غزل، ص۔۳

۳۶۔ابوزر ہاشمی، جلالؔ عظیم آبادی، کہکشاں، ص۔۱۲۴

شاہ حکیم محمد اختر ؒ اور ان کی اصلاحی شاعری

ڈاکٹر رشید احمد*

شاہ حکیم محمد اختر کا اصل نام محمد اختر ہے اور مکمل تعارفی نام شیخ العرب والعجم عارف باللہ شاہ حکیم محمد اختر ہے۔ اصل نام کے ساتھ جوڑے ہوئے سارے الفاظ ان کے القاب ہیں۔ 'حکیم' لقب ان کی حکمت دانی یعنی علم طب کی حیثیت سے ہے اور باقی القاب درحقیقت ان کے اوصاف حمیدہ کی بنا پر انہیں دئے گئے ہیں۔ نام کے ساتھ القاب جوڑنے کا یہ کام ان کے اساتذہ؟ کرام اور محبین نے انجام دیا ہے۔ در اصل شاہ صاحب تھے بھی ویسے ہی!۔ شاہ صاحب ایک سلیم الطبع انسان تھے۔ آپ فطری طور پر ایک پاکیزہ اخلاق بندہ ثابت ہوئے تھے۔ بچپن ہی سے آپ سارے گناہ کے کاموں اور منکرات سے متنفر تھے۔ آپ انسانی سماج میں قیامِ انسانیت کے لئے کوشاں تھے، خصوصا انہوں نے نوجوان نسل کو ماحول کی بگڑی ہوئی حالتوں کی خرابیوں اور شرور سے حفاظت کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ آپ نے بچپن ہی سے طالب علمی کے ساتھ ساتھ شعروشاعری بھی شروع کردی تھی اور بلاشبہ آپ بیسویں اور اکیسویں صدی کے ایک مایۂ ناز شاعر ہیں۔ آپ کا موضوعِ کلام اخلاقیت، اصلاح انسانیت اور تصوف تھا، آپ اپنے کلام میں تصوف کا صحیح مفہوم ومطلب اجاگر کیا ہے۔ چنانچہ یہاں شاہ محمد حکیم اختر ؒ اور ان کی اصلاحی شاعری ہمارا موضوعِ کلام ہیں۔ ذیل میں ان کی زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

ذاتی حالات

شیخ العرب والعجم عارف باللہ شاہ حکیم محمد اختر ؒ کی ولادت باسعادت مشترکہ ہندوستان کے صوبۂ یوپی کے ضلع پرتاب گڑھ میں ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ والد صاحب کا نام محمد حسین ہے۔ آپ کے گاؤں کا نام

---

* ایسوسیٹ پروفیسر اور چیئرمین، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

اٹھیہہ ہے، اس زمانے میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، اسی گاؤں کو اتنی بڑی شخصیت کی پیدائش گاہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ قدرت کا معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے! آپ کی عمر کا زیادہ تر حصہ چونکہ کراچی میں گزرا ہے اس لئے آپ '' حضرت والا کراچی '' سے مشہور ہیں۔ آپ کی وفات ۲۳/ رجب ۱۴۳۴ھ بمطابق ۲/ جون ۲۰۱۳ء میں گلشن اقبال کراچی میں ہوئی۔[۱]

علوم اور فنون کی تحصیل اور تکمیل

شاہ صاحب کی ابتدائی تعلیم ضلع سلطان پور میں ہوئی جہاں ان کے والد محترم ایک تحصیل میں ملازمت کے سلسلے میں قیام فرما تھے۔ چوتھی جماعت تک اردو سیکھنے کے بعد حضرت نے اپنے والد صاحب سے درخواست کی کہ مجھے دارالعلوم دیوبند بھیج دیں، والد صاحب نے نہ سنی اور انہیں مڈل اسکول میں داخلہ کرادیا۔ لیکن حضرت کا دل دنیوی تعلیم سے نہیں لگ رہا تھا، اور اسی دوران اپنی نابالغی ہی کے زمانے میں ذاتی طور پر آپ نے فارسی بھی سیکھنا شروع کردیا۔ چنانچہ آپ خود ایک جگہ فرماتے ہیں .." دور نابالغی ہی میں مثنوی شریف سے شغف شروع ہوا اور فارسی کی تعلیم مثنوی شریف سمجھنے کے لیے شروع کردی۔" اور درجۂ ہفتم کے بعد آپ نے فارسی کی تعلیم مکمل کی۔ حضرت کی فارسی کی یہ تعلیم صرف اور صرف خداوند باری تعالیٰ کی عشق و محبت کے لئے وقف تھی، جیسا کہ حضرت کے بچپن کا ایک شعر ہے جو آپ اکیلے میں بیٹھے آسمان کی طرف تکتے ہوئے پڑھتے تھے اور وہ یہ ہے:

اپنے ملنے کا پتا کوئی نشاں
تو بتادے اے مرے ربِّ جہاں[۲]

درجۂ ہفتم یعنی ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد آپ کو اپنے والد ماجد کے حکم بجا آوری کے لئے طبیہ کالج الٰہ آباد میں داخلہ لینا پڑا، چنانچہ وہیں سے آپ نے فن حکمت کی تکمیل کی یعنی حکیم بنے، اس دوران آپ اپنی پھوپی کے گھر قیام فرما تھے، یہاں ایک مسجد تھی، جو جنات کی مسجد کے نام سے مشہور تھی، حضرت کبھی کبھی اس مسجد میں تشریف لے جاتے تھے اور بالکل یکجہتی کے ساتھ دیر تک اللہ تعالیٰ کی یاد میں

مشغول رہتے تھے۔[۳]

حضرت والا نے عربی درسیات کی تعلیم اپنے شیخ یعنی پیر و مرشدِ اول شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر اعظم گڑھ میں حاصل کی اور حضرت پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ سے بخاری شریف کے چند پارے برکت کے لیے پڑھے، دینی تعلیم آپ نے بڑی محنت ولگن سے حاصل کی، چنانچہ درس نظامی کے آٹھ سالہ نصاب کو آپ نے صرف چار سال میں طے کیا۔[۴]

درس وتدریس؛

جہاں تک درس وتدریس کا تعلق ہے شاہ حکیم محمد اخترؒ کسی ادارہ کے ساتھ بطورِ موظف منسلک نہیں ہوئے۔ ملک اور بیرونی ممالک کے سارے دینی تعلیمی اور عام اداروں کے اساتذہ، طلبہ اور مؤظفین حضرات آپ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ حال زمانہ کی عالمی اسلامی شخصیت برصغیر کی مایۂ ناز ہستی جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی بھی حضرت والا کی زیارت کے لئے آپ کے یہاں تشریف لیجاتے تھے اور فیض صحبت سے مستفیض ہوتے تھے۔[۵]

روحانی ولادت یعنی بیعت و ارادت؛

حضرت اقدس شاہ حکیم محمد اخترؒ کا انداز عبادت بچپن ہی سے قابل رشک تھا۔ آپ کی آبادی سے نسبتاً فاصلہ پر واقع جنگل میں ایسی ایک مسجد میں جا کر رات کے وقت عبادت کرتے تھے۔ کم عمری ہی سے آپ کو گناہوں سے فطری نفرت تھی۔ کم سنی ہی کے عالم میں خواتین سے پردہ کا اہتمام شروع کر دیا تھا۔ آپ کی نوجوانی نہایت ہی پاکیزگی کے ساتھ کٹی، نوجوانی کی عمر میں عام لوگ جن گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں حضرت والا ان جنسی گناہوں سے کوسوں دور تھے اور بالکل عالمِ شباب میں اپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ مولانا شاہ محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تین سال تک رہے۔ کچھ عرصہ بعد حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوری رحمۃ اللہ

علیہ سے شرف بیعت حاصل کیا، اس وقت حضرت والا کی عمر صرف ۱۷ برس تھی۔ حضرت والا کراچی رحمۃ اللہ علیہ اپنے پروردگار کے سامنے تسلیم و رضا کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ آپ کی تمام عمر ایسے زبردست مجاہدہ میں گزری کہ عام آدمی کے لئے اس کا تصور بھی محال ہے۔ آپ کو کبھی عزیز و اقارب کی جانب سے ستایا گیا تو کبھی شیخ کی صحبت میں رہتے ہوئے حاسدین کے ہاتھوں مصائب برداشت کئے اور کبھی خدام و مریدین کی طرف سے ناخوشگوار حالات اور ایذا رسانیوں پر خدائے تعالیٰ کی رضامندی کی خاطر صبر کیا۔ حضرت شیخ پھولپوری کے انتقال کے بعد حضرت والا کراچی حکیم الامت حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور زمانہ خلیفہ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے رجوع فرمایا، چنانچہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی آپ کو اپنی خلافت سے نوازا۔

دینی اداروں کا قیام

شاہ حکیم محمد اخترؒ نے دنیا بھر میں اصلاحی پروگراموں کے ساتھ ساتھ بہت سارے دینی ادارے بھی قائم کئے، جن میں سے قابل ذکر چند یہ ہیں: گلشن اقبال کراچی میں ایک مدرسۂ درس نظامی 'اشرف المدارس' کے نام سے قائم فرمایا۔ جس میں بڑے اہتمام کے ساتھ دینی تعلیمی خدمات انجام دی جارہی ہیں۔ اس کے بعد ایک اور عظیم الشان دینی ادارہ جامعہ اشرف المدارس کراچی کے نام سے سندھ بلوچ سوسائٹی، گلستانِ جوہر، کراچی میں قائم کیا۔ ڈھاکہ کے موجودہ زمانہ کا قابل فخر دینی ادارہ مدرسہ بیت العلوم، ڈھاکا کانگر، گنڈاریا، ڈھاکہ بھی حضرت والا کا قائم کردہ دینی ادارہ ہے، ان سارے اداروں کے سرپرست تاحیات حضرت والا خود رہے۔

شاہ حکیم محمد اخترؒ کا ذوق شعر و سخن

شاہ صاحب اس صدی کے بہت ہی اونچے پایہ کے شاعر تھے۔ آپ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کی تھی۔ حضرت والا طبعی شاعر تھے، اپنے بچپن ہی سے آپ نے شاعری شروع کی۔ ان

کا عام موضوع عشقِ حقیقی یعنی اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی عشق و محبت اور اصلاحِ امراضِ باطنیہ ہے۔ آپ اصلاحِ امراضِ جسمانیہ پر اصلاحِ امراضِ باطنیہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں نہ گل و بلبل کے فضول قصے ہیں، نہ شراب و کباب میں بیخود عاشقان و معشوقانِ فانی کی لچر داستانیں، بلکہ آپ کا کلام حسنِ فانی و عشقِ مجازی اور بدنظری کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ آپ کے مطابق اس دورِ عریانی و فحاشی میں اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے کا سب سے بڑا حجاب و رکاوٹ اور سب سے بڑا حائل یہی حسنِ فانی اور اس کے لئے شہوت رانی ہے۔

حضرتؒ اپنے چند اشعار کے ذریعہ اوپر کی باتوں کو واضح فرماتے ہوئے کہتے ہیں:

مرقد میں ہم نے دیکھا اختر ہزار کیڑے
چپٹے ہوئے تھے اُن کو کل تک جو مہ جبیں تھے

جمالِ سیرت و معنیٰ سے جو تابندہ ہوتا ہے
تو لطفِ زندگی بھی اُس کا پھر پائندہ ہوتا ہے

شبِ زفاف کی لذّت کا شور سنتے تھے
گذر کے تھی وہ شبِ منتظر بھی افسانہ

بزیرِ سایۂ غض بصر ہے چین اسے
نگاہِ عشق حسینوں سے اور مضطر ہے[8]

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہلاک ہونیوالا حسنِ ظاہری کے عاشقوں اور پاگلوں کے بارے میں مزید فرماتے ہیں کہ "حسنِ فانی کے عاشقوں کی بہار چند روزہ ہوتی ہے"۔ اس سلسلے میں ایک شعر بھی ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

بہارِ حسنِ صورت سے جو زندہ ہوتا ہے
وہ تبدیلِ بہارِ رنگ سے شرمندہ ہوتا ہے[9]

اس کے بالمقابل حسن حقیقی کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے حضرت والا فرماتے ہیں:

وہ شاہِ دوجہاں جس دل میں آئے
مزے دونوں جہاں سے بڑھ کے پائے[10]

شاہ صاحبؒ اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

سوائے ذکر خدا اور اولیاء کے تئیں
کسی نے چین نہ پایا کبھی زمانے میں
تم جس کو دیکھتے ہو گناہوں سے شادماں
زیر لب خنداں ہیں ہزاروں الم نہاں
یاد کرنا تھا کسے کس کو کیا
کام تیرے قبر میں آئے گا کون؟[11]

ترتیبات اور تصنیف وتالیفات:

آپ کے نظم ونثری کلام کے طبع شدہ مجموعے سو سے زائد ہیں، جن میں سے ہر ایک مجموعہ اپنے موضوع پر نہایت جامع اور نوعِ انسانیت کے لئے نہایت ہی کارآمد ہے۔ شاہ صاحب کی شاعری پر "آئینۂ محبت" اور "فیضانِ محبت" نامی دو مجموعۂ کلام ہیں اور دونوں شائع شدہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات میں سے بعض یہ ہیں:

۱۔ محبتِ الٰہیہ
۲۔ تکمیل الاجر بتحصیل الصبر (عربی مع شرح اردو)
۳۔ صدائے غیب
۴۔ دستورِ تزکیۂ نفس
۵۔ معارف المثنوی

۶۔ خزائن القرآن

۷۔ خزائن الحدیث

۸۔ خزائن شریعت وطریقت

۹۔ خزائن معرفت ومحبت

۱۰۔ معارفِ ربانی

۱۱۔ مواہب ربانیہ

۱۲۔ معارف شمس تبریز

۱۳۔ درسِ مثنوی

۱۴۔ فغانِ رومی

۱۵۔ روح کی بیماریاں اور ان کا علاج

۱۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں دنیا کی حقیقت

۱۷۔ تربیتِ عاشقانِ خدا (تین جلدوں میں)

۱۸۔ ارشادات دردِ دل

۱۹۔ پردیس میں تذکرۂ وطن

۲۰۔ براہینِ قاطعہ

۲۱۔ کشکولِ معرفت

۲۲۔ سفرنامۂ حرمین شریفین

۲۳۔ سفرنامۂ رنگون وڈھاکہ

۲۴۔ باتیں ان کی یاد رہینگی

۲۵۔ معارف الابرار

۲۶۔ مجالس ابرار

۲۷۔ گلستانِ معرفت ومحبت

۲۸۔ مواعظ دردِ محبت (مطبوعہ مجموعہا ئے مواعظ وبیانات) جو دس ضخیم جلدوں میں شائع شدہ ہیں۔ اس

کے علاوہ اور بھی مجموعے نکالے جا رہے ہیں۔

۲۹۔آفتابِ نسبت مع اللہ

۳۰۔ایک منٹ کا مدرسہ وغیرہ۔

اوپر مذکورہ کتابوں کے علاوہ حضرت کی پانچ کتابیں اور ہیں اور وہ یہ ہیں ا۔معرفت الٰہیہ ۲۔معیت الٰہیہ ۳۔صراطِ مستقیم ۴۔براہینِ قاطعہ اور ۵۔شراب کی حرمت کا ثبوت قرآن پاک سے، یہ پانچ کتابیں شاہ صاحب کی ترتیبات ہیں۔انہوں نے اپنے شیخ اول حضرت اقدس حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھول پوری کی سولہ سالہ رفاقت میں جو علوم ومعارف سنے تھے ان کو ترتیب دیتے ہوئے یہ کتابیں آپ کے قلم سے وجود میں آئیں اور بقیہ خود ان کی تصنیفات ہیں[۱۲]

شاہ صاحب کے کلام کے خصوصی عنوانات:

الف۔عشقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اصلی عشقِ رسول اتباعِ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پوشیدہ ہے، قرآنِ کریم میں ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ[۱۳]

یعنی اے نبی آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو ضرور میری اتباع کیا کرو تب اللہ تعالیٰ بھی تمہیں اپنے پیار میں رکھیں گے۔

اور رسول کریم نے فرمایا: من احب سنتی فقد احبنی ومن احبنی کان معی فی الجنۃ[۱۴]

یعنی جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں رہیگا۔

قرآن وحدیث کے اسی حکم کے پیش نظر حضرت کا مشہور شعر ہے:

مومن جو فدا نقش کفِ پائے نبی ہو
ہو زیرِ قدم آج بھی عالم کا خزینہ
گر سنتِ نبوی کی کرے پیروی امت

طوفاں سے نکل جائے گا پھر اس کا سفینہ
نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے
جس کے چہرے پر نہ ہو آہ! نبی کی سنت
کیسے معلوم ہو مؤمن کا مسلماں ہونا [۱۵]

آپ اور کہتے ہیں:

یہ صبح مدینہ یہ شام مدینہ
مبارک تمہیں یہ قیامِ مدینہ
ہو آزاد اختؔر غمِ دوجہاں سے
جو ہو جائے دل سے غلامِ مدینہ [۱۶]

ب۔اصلاحِ عمل:

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ عاشقین مجاز کے لئے افشائے راز کے طور پر اور عشقِ مجازی کے دھوکے کے بارے میں نہایت ہی پراثر انداز میں تنبیہ وآگاہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حسینوں کا جغرافیہ میرؔ بدلا
کہاں جاؤگے اپنی تاریخ لے کر
یہ عالم نہ ہوگا تو پھر کیا کروگے
زحل مشتری اور مریخ لے کر [۱۷]

یعنی نوجوانوں کی نوجوانی جب ختم ہوجائے گی، بڑھاپے جب آجائے گا، تب تو کوئی حسینہ جمیلہ عورت منہ موڑ کر بھی نہیں دیکھے گی تو پھر تم کیا کروگے؟ چنانچہ اس وقت بے فائدہ افسوس کرنے کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس وقت نہ زندگی کو سدھارا جاسکتا اور نہ کسی قسم کا تدارک ممکن، لہذا وقت ہوتے ہوئے اس کی قدر کرنا ہی عقلمندی کا کام ہے۔

ج۔اصلاحی اور تربیتی مجلسوں کا خاص انداز

شاہ حکیم محمد اختر ؒ کا انداز اصلاح بہت ہی نرالا تھا۔آپ بطور سنت نبوی اپنے مریدین کے ساتھ ہنسی اور مزاح بھی فرماتے تھے،تاکہ احباب کے لئے دلکشی برقرار رہے اور ان کی دل شکنی نہ ہو۔چنانچہ اسی سلسلے میں ایک جگہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ خود فرماتے ہیں: "میں لوگوں کو ہنسا ہنسا کے پھنساتا ہوں اور اللہ تعالیٰ تک پہنچاتا ہوں"۔[۱۸]

آپ کے یہاں روزانہ تقریباً پانچ مجلسیں ہوا کرتی ہیں ایک بعد فجر، ایک صبح ۱۱ بجے، ایک بعد عصر، ایک بعد مغرب اور ایک بعد عشاء۔ پہلی مجلس ذکر وتلاوت کی ہے۔ درمیانی تین مجلسوں میں حضرت والا کے اشعار اور اصلاحی باتیں ہوتی ہیں اور آخری مجلس جو بعد نماز عشاء منعقد ہوتی ہے اس میں ہنسی اور دل لگی کی باتیں ہوتی ہیں۔البتہ سب کا مقصد اصلاح ہی ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ساری مجلسوں میں عام طور ان پانچ اعمال کی تلقین ہوتی ہے جس سے ایک انسان بالکل آسانی سے اللہ والا بن سکتا ہے۔ عام طور پر انسان کا سوچ یہی ہوتا ہے کہ تقویٰ یعنی پرہیزگاری کوئی ہلکی سی چیز ہوگی ہے، اگر کسی بندے کو وہ حاصل ہو تو اچھا اگر حاصل نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔یعنی تقویٰ حاصل ہو تو بہتر، نہ ہو تو کچھ نقصان نہیں۔حالانکہ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق "بندہ کی ہدایت کے لئے حصولِ تقویٰ اس کی اولین شرط ہے، بلا حصولِ تقویٰ کسی انسان کی ہدایت یابی ناممکن ہے۔ اسی بات کو شاہ صاحب نے بالکل آسان اور مختصر عبارت میں یوں بیان فرمایا ہے۔

ایک عبادت چوبیس گھنٹے کی ہے، وہ ہے تقویٰ کا اہتمام[۱۹]

حضرت اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔

تقویٰ محافظ نورِ سنت ہے۔[۲۰]

حضرت والا بلا تقویٰ دعویدارانِ محبت خداوندی کے لئے نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے:

'محبت بلا خشیت بے ادبی ہے'۔[۲۱]

بسا اوقات انسان دوسروں کی اصلاح کا درپے ہوتا ہے اور اپنے کو بھول جاتا ہے۔ انکے لئے حضرت والا ایک شعر خاص طور پر نصیحت آمیز ہے اور وہ یہ ہے:

نامناسب ہے اے دلِ ناداں
اک جذامی ہنسے زکامی پر[۲۲]

د۔ حصولِ تقویٰ کا آسان طریقہ

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ پانچ کام کیا کرو ان شاء اللہ اس کی برکت سے بالکل آسانی سے تقویٰ والی زندگی نصیب ہوگی۔ اور وہ پانچ کام یہ ہیں:-

۱۔ روزانہ قرآن کریم کی تلاوت

۲۔ مردوں کو ٹخنے کے اوپر (نصف ساق) کرتا، پاجامہ اور تہبند پہننا

۳۔ ڈاڑھی تینوں جانب سے یعنی دائیں بائیں اور نیچے کی جانب سے کم از کم ایک مٹھی رکھنا، اس سے کم نہ کتروانا

۴۔ آنکھوں کی حفاظت کرنا، اور یہ بہت ہی اہم ہے، بلکہ سب سے اہم ہے۔ کیونکہ آنکھ انسانی بدن کے لیے سرحد جیسی ہے۔ اسی راہ سے انسانی بدن کے پایۂ تخت قلب پر شیطانی حملے ہوتے رہتے ہیں، اگر آنکھوں کی حفاظت کی جاسکے، تو انسانی قلب بھی محفوظ ہوجاویگا، ورنہ غیر محفوظ ہی رہے گا۔ چنانچہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

" الا ان فی الجسد لمضغة اذاصلحت صلح الجسد كله و اذ فسدت فسدالجسد كله ، الا وهی القلب "۔ یعنی انسانی بدن میں گوشت کا ایک لتھرا ایسا ہے کہ اگر وہ درست ہوجاویگا تو پورا بدن درست ہوجاویگا، لیکن خدانخواستہ وہ خراب ہوجاویگا، تو پورا بدن خراب و برباد ہوجاوے، یادرکھو! وہ انسانی قلب ہے۔[۲۳] اس لیے قلب کی حفاظت کے لیے آنکھوں کی حفاظت لازمی ہے۔

۵۔ قلب کی حفاظت، یعنی قلب کو پرانے برے خیالات سے باز رکھنا، آئندہ کے لیے دل میں گناہ کا

کوئی پروگرام نہ بنانا۔[۲۴]

بس ان باتوں پر عمل کرنے والوں کے لئے اللہ والا بننا بالکل آسان ہے، اور یہ تجربہ شدہ بات ہے، خدائے پاک اپنے ہر ایک بندے کو اس کی توفیق بخشیں اور اپنا پیارا بنالیں۔

خداوند کریم ہر زمانے میں اپنے بندوں پر رحم کھاتے ہوئے ان کی ہدایت اور اصلاح کے لئے اپنے خاص خاص بندوں سے کام لیتے ہیں۔ ہر صدی میں ہر ایک خطۂ زمین میں اس جیسے مصلحین آتے رہتے ہیں اور اپنے تجدیدی واصلاحی کام انجام دے جاتے ہیں۔ عام انسان کو چاہئے کہ وہ ان کو ڈھونڈیں اور ان کی پیروی کریں اسی میں ان کی دنیا و آخرت کی بھلائی پوشیدہ ہے۔

حوالہ جات وتوضیحات:

۱۔ سہ ماہی فغانِ اختر کراچی، شمارہ ۲، فروری تا اپریل ۲۰۱۴ء، اشاعتِ خصوصی بیادِ شیخ العرب والعجم عارف باللہ مجدد زمانہ حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، کور اِیز (کوور صفحہ نمبر ۲)۔

۲۔ گلستانِ معرفت ومحبت (مجدد زمانہ رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر تصنیفات، تالیفات وترتیبات کا خوبصورت مجموعہ)، حصۂ ترجمۃ المصنف یعنی آپ بیتی، کتب خانہ مظہری، کراچی، تاریخ اشاعت اکتوبر ۲۰۱۵ء ص ۷، ۱۱ و ۱۷

۳۔ الاختر (یادگار)، شعبۂ نشر واشاعت، مدرسۂ بیت العلوم، ڈھال کانگر، ڈھاکہ، رجب ۱۴۳۸ھ مطابق اپریل ۲۰۱۷ء، ص ۴۲

۴۔ الاختر، ص ۳۴

۵۔ راقم الحروف کا چشم دید واقعہ

۶۔ گلستانِ معرفت ومحبت، ص ۱۸ و ۱۹

۷۔ الاختر، ص ۱۴

۸۔ عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحبؒ، روح کی بیماریاں اور ان کا علاج، کتب خانہ مظہری، ذوالحجہ ۱۳۹۹ھ ص ۸۴ و ۸۵

۹۔ روح کی بیماریاں اور ان کا علاج، سابق، ص ۸۴

۱۰۔ روح کی بیماریاں اور ان کا علاج، سابق ص ۸۴

۱۱۔ گلستانِ معرفت و محبت، ص ۱۳

۱۲۔ روح کی بیماریاں اور ان کا علاج، سابق ص ۸۴

۱۳۔ القرآن الکریم

۱۴۔ حدیث شریف

۱۵۔ عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحبؒ، فیضان محبت ص ۴۲؛ گلستانِ معرفت و محبت، سابق، حصہ: پیارے نبی کی پیاری سنتیں ص ۶۔۷؛ الاختر، ص ۴۹

۱۶۔ فیضان محبت، سابق، ص ۳۵

۱۷۔ فیضان محبت، سابق، ص ۲۴۴

۱۸۔ الاختر، ص ۵۳

۱۹۔ الاختر، ص ۵۳

۲۰۔ الاختر ص ۵۳

۲۱۔ براھینِ قاطعہ ص ۹۸

۲۲۔ اروح کی بیماریاں اور ان کا علاج، سابق ص ۶۱۲

۲۳۔ حدیث شریف

۲۴۔ گلستانِ معرفت و محبت، سفرنامۂ لاہور، ص ۲۴

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی اردو خدمات

ڈاکٹر محمد رضاء الکریم*

بنگلہ دیش میں اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں جن ادیبوں کا نام ذہن میں آتا ہے۔ان میں سے ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کا نام سرفہرست ہے۔وہ بیک وقت بنگلا دیش کے اردو ادیب، محقق، معلم، مترجم اور مدیر کی حیثیت سے ہمارے سامنے جلوہ گر ہوتی ہیں۔ان کی ہمہ گیر پرکشش و جاذب شخصیت کے گہرے نقوش بنگلا دیش کی اردو اور فارسی محفلوں میں محسوس کی جاتی ہے۔ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر اکیسویں صدی کی اردو اور فارسی ادبی دنیا میں ایک لازوال شہرت یافتہ نام ہے۔وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے بعد شعبہ زبان و ادبیات فارسی میں تقریباً چار دہائی سے بھی زیادہ عرصے تک درس و تدریس کے ساتھ منسلک ہیں۔۱۹۷۱ء کے آزادی کے بعد یعنی قیام بنگلا دیش کے بعد، سب سے پہلے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی سے کلثوم ابوالبشر نے اردو اور فارسی ادبیات میں ایم، اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔۱

اب تک سولہ تالیفات، تراجم اور فرہنگ کی کتابیں لکھیں۔اسکے علاوہ انکے اشاعت پذیر علمی ادبی اور تحقیقی مقالات کے تعداد (۶۳) تریسٹھ ہیں۔انہوں نے بہت ساری قومی اور بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی۔جن کی تعداد باسٹھ ہے یہ مضامین مختلف ریسرچ جرنل میں شائع ہوئے ہیں۔۲

ان کا اصل نام کلثوم ہے۔موصوف ۱۱ فروری ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے مشہور شہر ممبائی میں پیدا ہوئیں۔ان کا آبائی وطن بنگلا دیش کے نواکھالی ضلع کے مشہور گاؤں چاٹ کھیل ہے۔ان کے والد ماجد کا نام راجا میاں اور والدہ صاحبہ کا نام شاہدہ خاتون ہے۔انکے والد ماجد ۱۹۴۴ء میں اپنا آبائی وطن نواکھالی چھوڑ کر ممبائی چلے گئے۔ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر آٹھ بھائیوں اور چار بہنوں میں سے چھٹے نمبر پر ہے۔ایک بہن شمیم بانو

ایسوسی ئٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی کے انسٹیوٹ آف ماڈرن لینگویزیز (IML) میں فارسی زبان کے پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے ۱۹۶۳ء میں پونہ بورڈ مہاراشٹر ہندوستان سے میٹرک امتحان میں فرسٹ ڈیویزن حاصل کیا۔ اسکے بعد ممبائی یونیورسٹی ہندوستان ۱۹۶۵ء میں انٹرمیڈیٹ (H.S.C) امتحان درجہ دوم سے پاس کیا۔ اور اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں بی۔اے آنرز (تاریخ) کی ڈگری حاصل کی۔ اسکے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں شعبہ اردو اور فارسی سے اردو میں فرسٹ کلاس میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے فارسی میں بھی اسی شعبہ سے ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں انہوں نے ایران کی مشہور فردوسی یونیورسٹی (مشہد) سے فارسی میں پری ڈاکٹریل پاس کیا۔ ۱۹۷۷ء میں موصوفہ نے ممبائی یونیورسٹی کے نامور محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے زیر نگرانی پی۔ایچ۔ڈی ڈگری حاصل کی۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات اور کارنامے'' ہے۔ یہ مقالہ ۱۹۹۲ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ جو چار ابواب پر شامل ہے۔ اس کتاب کے مقدمے میں مصنفہ موضوع کے انتخاب کی وجہ بتاتے ہوئے فرماتی ہیں۔

> ''میری تحقیق کا مقالہ میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کی زندگی اور انکی تمام نثری تصانیف اور تالیفات اور انکے کلام شاعری کو پیش کیا گیا ہے۔ انکی حیات کے ساتھ متنوع حیثیت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر شادانی کی مختلف حیثیتوں کو اجاگر کرنے والی یہ پہلی کتاب ہے۔''

محترمہ کی اس کتاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ تعریف کرتے فرماتے ہیں

> ''ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی کتاب ''ڈاکٹر عندلیب شادانی: حیات اور کارنامے'' میری نظر سے گزری ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں ڈاکٹر عبدلیب شادانی کی حیات شخصیت، انکی شاعری اور تنقید نگاری پر تحقیقانہ روشنی ڈالی ہے۔ میرا خیال ہے یہ کتاب پورے برصغیر کے اردوداں طبقے کے لئے بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوگی۔''

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے ۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۳ء تک اردو معاون استاد کی حیثیت سے موتی جھیل سرکاری گرلز ہائی اسکول میں نوکری کی تھی۔ اسکے بعد وہ لکچرار کی حیثیت سے ۱۹۷۳ء سے شعبہ اردو اور فارسی میں استخدام پذیر ہوئیں۔ ۱۹۸۱ء میں وہ اس شعبہ میں اسسٹنٹ پروفیسر اور ۱۹۸۹ء میں اسوسیٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ اسکے بعد ۱۹۹۳ء میں پروفیسر بنی۔

محترمہ ۲۰۰۷ تک شعبہ اردو اور فارسی کے استاد تھیں۔ جب ۲۰۰۷ میں شعبہ اردو اور فارسی کے نام سے دو نئے علاحدہ شعبہ بن گئے تھے تو موصوفہ شعبہ فارسی میں چلی گئی۔ یکم جولائی ۱۹۸۲ء سے ۳۰ جون ۱۹۸۵ء پہلی بار اور یکم جولائی ۱۹۹۷ء سے ۳۰ جون ۲۰۰۰ تک دوسری بار ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو اور فارسی کے چیئرمین تھیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے ماڈرن لنگویز میں موقتی پروفیسر کے عہدہ پر بھی فائز ہیں۔

موصوفہ ۲۰۰۲ سے ۲۰۱۲ تک شعبہ اردو اور فارسی کے طلبا کی مشاور (Student Advisor) تھیں۔ ۲۰۰۲ سے ۲۰۰۸ تک بنگلہ دیش بیتار (ریڈیو) میں بطور اعزازی آرٹیسٹ کام کیا۔ ذیل میں ڈاکٹر کلثوم ابو البشر کی اردو زبان وادب کے متعلق شائع شدہ تحقیقی اور علمی کارنامے پیش خدمت ہیں:

اردو میں مطبوعہ کتابیں اور مقالات

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی تالیفات، تراجم اور فرہنگ کی سولہ کتابیں شائع ہوئیں اور۔ تریسٹھ (۶۳) تحقیقی مقالات منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل کتابین قابل ذکر ہیں:

۱۔ **آسان اردو:** یہ ایک نصابی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اردو ادب کے نامور ادیب اور شاعر فرحت اللہ بیگ، منشی پریم چند، میر امن دہلوی، علامہ اقبال، میر تقی میر، میر انیس اور اسد اللہ خان غالب وغیرہ کے ادبی کارناموں کو پیش کیا ہے۔ بنگلہ دیش نشنل کاریکولام اور ٹیکسٹ بوک بورڈ ڈھاکہ نے اس کتاب کو بطور نصاب نہم اور دہم کلاس کے لئے شامل کیا۔ ۲۸۸ صفحات پر لکھی ہوئی یہ کتاب ڈھاکہ ٹیکسٹ بورڈ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کی۔

۲۔ **ثلاثہ غسالہ**: یہ کتاب اسلام آباد میں مقیم ڈاکٹر عارف نوشاہی کی سرپرستی میں دسمبر ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی۔ یہ بنگال کی اردو، فارسی اور عربی تصانیف کی فہرست ہے جسے حکیم حبیب الرحمٰن نے اردو زبان میں لکھا تھا۔ اس کتاب کا قلمی نسخہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے لائبریری میں اب تک موجود ہے۔ اس کتاب کے متعلق کلثوم ابوالبشر نے بنگال کی فارسی اور عربی تصانیف کی فہرست ثلاثہ غسالہ ایک تعارف کے عنوان سے ایک تحقیقی مقالہ ۱۹۸۵ء میں پاکستان کے مشہور شہر اسلام آباد کے ''دانش'' جرنل میں شائع ہوا۔

۳۔ **ڈاکٹر عندلیب شادانی کی حیات اور کارنامے** کے عنوان سے اردو زبان میں تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی ڈگری حاصل کی۔ جو ۱۹۹۲ء میں کتابی شکل میں ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ ۴ وہ بنگلا دیش میں اردو ادب کے نام سے ۲۰۱۵ء میں اور ایک کتاب لکھی ہے جو بنگلہ اردو شاہتیہ فاؤنڈیشن ڈھاکہ سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کتاب میں موصوفہ نے بنگلا دیش میں اردو ادب سے وابستہ گیارہ ادبی علمی اور تحقیقی مضامین کو شامل کیا ہے۔ جس میں مصنفہ کے بنگلا دیش میں اردو ادب اور یہاں کی ثقافت کی پروان چڑھانے اور اردو کی بقا اور سرپرستی کے لیے جن ادیبوں نے خدمات انجام دی تھی۔ انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بنگلا دیش کے مایہ ناز نقاد ڈاکٹر حنیف فوق قریشی کے عنوان سے ایک مقالہ ہے۔ اس مضمون کے آغاز میں انہوں نے بنگال میں اردو ادب کی حیثیت کو بڑی چابکدستی سے اجاگر کیا ہے۔ دوسرے مضمون کا عنوان ''بنگلہ ادب میں سعادت حسن منٹو''۔ یہاں بنگال میں اردو ادب کا تذکرہ اور سعادت حسن منٹو کے افسانون کے بنگالی مترجم کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مندرجہ ذیل عنوانات سے اور بھی مضامین ہی۔

مشرقی بنگال میں اردو ادب کا بتدریج ارتقا، ڈھاکہ میں اردو ادب۔ بنگلا دیش میں اردو ادب کا مختصر جائزہ، مشرقی بنگال کے چند اہم اردو جرائد، بنگلا دیش میں اردو ادب کے مسائل اور امکانات، بنگال کی فارسی اردو اور عربی تصانیف کی فہرست۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ فہرست، فورٹ ولیم کالج کا نادر مخطوطہ ہندوستان کے مسلمان مورخین، تاریخ شعبہ فارسی واردو ڈھاکہ یونیورسٹی۔، بنگلا دیش میں اردو کے مسائل اور امکانات شامل ہیں

''ہندوستان میں مسلم مورخین'' مقالہ میں کلثوم ابوالبشر نے اپنے استاد ڈاکٹر عندلیب شادانی کو شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور محقق کے ساتھ ساتھ ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے اس مقالے میں بڑی تفصیل سے شادانی کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کی دو کتابیں 'تحقیقات' اور 'تحقیق کی روشنی میں' جو اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ فورٹ ولیم کالج کا ایک نادر نسخہ مضمون میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات کو پیش کیا ہے۔ ان کی تصنیف شدہ مقالات سے اردو ادیبوں اور محققوں کو بنگلا دیش میں اردو ادب کے بارے میں ایک نظر میں ہی بہت آسانی سے معلومات حاصل ہونگی۔

مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ موصوفہ نے اپنے محترم استاد **ڈاکٹر عندلیب شادانی کی غیر مطبوعہ بیاض (ڈائیری)** مرتب کی ہے۔ اس کتاب کو بنگلہ اردو شاہتیہ فاؤنڈیشن نے ستمبر ۲۰۱۷ء میں شائع کیا۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے بہ حیثیت مرتب اس کتاب پر پیش گفتار قلمبند کیا۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر عندلیب شادانی کے تعارف اور انکی قدر منزلت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے متعلق موصوفہ کی یہ دوسری کتاب ہے۔ یہ کتاب محترم شادانی مرحوم کی غیر مطبوعہ اشعار اور یادداشتوں پر مشتمل ڈائیری ہے۔ اس کتاب میں شامل ڈاکٹر شادانی کی وہ یادداشتوں ہیں جن کی اشاعت سے سابق مشرقی پاکستان میں اردو ادب کی ایسی بہت ساری باتوں سے قارئین کو آشنا ہوں گے جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کتاب میں عندلیب شادانی کی ان کی بہت غزلیں ہیں جس کا شہرہ پورے برصغیر میں ہوا۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر کی یہ کتاب بنگلا دیش میں اردو شعری ادب کے سرمائے میں ایک بیش بہا اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اردو ادب کے ناقدین اور محققوں کے لیے یہ کتاب ڈاکٹر عندلیب شادانی کی زندگی، انکی شخصیت اور انکی شاعری اور مقالات کے نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔[۱۸]

مقالات:

۱۔ **تواریخ خاندان کشمیریہ**، تحقیقی مقالہ ہے۔ جن میں انہوں نے ڈھاکہ میں مقیم نوابان کاشمیری خاندان کی تعلیم وتہذیب اور ادبی کارناموں پر بحث کی ہے۔ یہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں محفوظ شدہ ایک نادر قلمی نسخہ ہے۔ یہ مضمون ستمبر ۱۹۸۷ء میں ہندوستان کے مشہور شہر حیدرآباد کے مجلّہ ''سبرس'' میں شائع ہوئے۔[۱۹]

۲۔ **مثنوی جہان شاہ: جہاں بانو**۔ یہ بھی ڈھاکہ یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ایک اہم نادر قلمی نسخہ ہے۔

اس نسخے کی اہمیت اور اس کے ادبی قدر و قیمت سے متاثر ہو کر کلکتہ سے اس نسخہ کی اشاعت ہوئی۔ ''مجلسِ ڈھاکہ'' کے نام سے ایک جرنل میں یہ مقالہ شائع ہوا تھا۔ ۲۰

۳۔ **بنگلا دیش میں سرسید احمد خان کے معاصر رہنما**، مضمون میں انہوں نے سرسید احمد خان کے افکار اور ڈھاکہ میں ان کے معاصرین مولوی عبید اللہ عبیدی سہروردی، نواب عبدالغنی، نواب سلیم اللہ اور نواب علی چودھری کے افکار اور کارناموں پر بحث کی ہے۔ ان کے اس مضمون میں اسلامی تعلیم کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔

یہ مضمون ۱۹۸۹ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سرسید احمد خان اکاڈیمی کے ایک سمینار میں پڑھا گیا تھا۔ جو بعد میں سرسید بازیافت رسالہ میں شائع ہوئی۔ ۲۱

۴۔ ''**ڈاکٹر عندلیب شادانی ہندوستان کے مسلم مورخ**'' مقالے میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کی حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر بحث کی گئی ہیں۔ یہ مضمون ۱۹۹۰ء میں نوائے ادب انجمن اسلام اردو ریسرچ جرنل ممبائی سے شائع ہوا۔

۵۔ ''**تاریخ شعبہ فارسی اور اردو ڈھاکہ یونیورسٹی**''، یہ ایک اہم تحقیقی مقالہہے۔ اس مقالہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کی شعبہ اردو اور فارسی کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ مقالہ شعبہ اردو اور فارسی نے اپنی ۷۵ سالہ سالگرہ کے موقع پر شائع ہوا۔ (رسالہ یادگار)

۶۔ **بنگلہ ادب میں سرسید احمد خان**، ماہنامہ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہند اکتوبر ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔،

۷۔ **چھوٹا خدا**: (ایک تنقیدی جائزہ) سالانہ: دستک، ڈھاکا، بنگلا دیش، جنوری ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔

۸۔ **ڈاکٹر عندلیب شادانی کی نصابی اور ترجمہ شدہ کتابیں**، ماہنامہ قومی زبان، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، دسمبر ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔

۹۔ **بیسویں صدی میں بنگلا دیش میں اردو صحافت نئی دہلی**، انڈیا، فروری ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔

۱۰۔ **غالب کی شاعری کا ایک رخ، غم دوا**: ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف فارسی اور اردو شمارہ ڈھاکہ سے جنوری، دسمبر ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ **مثنویات امیر خسرو**، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو شمارہ، اول جون ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔

کلثوم ابو البشر نے بنگلہ زبان میں چھ اور انگریزی زبان میں چار مقالات لکھے ہیں جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ان میں حسب مقالات قابل ذکر ہیں:

۱۔بادشاہ ڈھاکہ :دانشور حکیم حبیب الرحمٰن فاونڈیشن، اکتوبر ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا۔ (بنگلا زبان)

۲۔ڈاکٹر عندلیب شادانی اور انکی غزل، دی ڈھاکہ یونیورسٹی اسٹڈیز، ڈھاکا، دسمبر، ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔

۳۔منشی پریم چند۔ برستہ ترین رماں نویس، زبان ہندی، ڈھاکہ یونیورسٹی، جنوری ۲۰۱۲ء میں شائع ہوا۔

۴۔ ۱۹۹۸ء فرہنگ بنگالی۔انگلیسی نامی ایک فرہنگ ادارے تحریر کے ساتھ لکھی ہے اور ۲۰۱۵ء میں خانہ فرہنگ ایران ڈھاکہ سے اشاعت پذیر ہوئی۔

موصوفہ نے باسٹھ بین الاقوامی سمیناروں میں شرکت کی اور وہاں تحقیقی مقالے بھی پڑھے۔اب تک وہ بنگلا دیش ہندوستان اور پاکستان کے ۸۰ پی۔ایچ۔ڈی اور ایم۔فیل کے طلباء کے ممتحن رہیں۔اور بنگلا دیش کے دس ایم فیل اور گیارہ پی۔ایچ۔ڈی طلبا ان کی نگرانی میں مقالہ سپرد قلم کیا۔علاوہ ازیں تحقیقی۔ادبی اور علمی کارگزاریوں کی بنا پر اٹھارہ انعامات، جائزے کریسٹ اور تمغہ طلائی سے نوازا گیا موصوفہ کو۔ ان میں سے حسب ذیل انعامات، کریسٹ، تمغہ طلائی قابل ذکر ہیں۔

ڈھاکہ یونیورسٹی ایوارڈ (۱۹۷۱) میں ایم۔اے اردو میں سرفہرست آنے پر کتابیں ایوارڈ میں ملی۔

(۲۰۰۲) میں حکیم حبیب الرحمٰن فاؤنڈیشن کریسٹ (۲۰۰۶) اسلامک ری پبلک آف ایران سے کریسٹ اور مادرِ فارسی کا خطاب (۲۰۰۶) جی سی، یونیورسٹی لاہور سے کریسٹ، (۲۰۱۴) ابوریحان، بیرونی فاؤنڈیشن سے کریست (۲۰۱۰) سرگودھا یونیورسٹی سے کریسٹ۔

کلثوم ابو البشر نہ صرف ایک ادیب ہیں بلکہ وہ بنگلہ دیش اور بیرونی ممالک کے بہت سے مشہور ادبی اداروں کے ساتھ بھی منسلک ہیں۔ان میں حسب ذیل قابل ذکر ہیں:

۱۔ممبر آف ایشیاٹیک سوسائٹی آف بنگلہ دیش۔

۲۔لائف ممبر بنگلہ اکاڈمی ڈھاکہ

۳۔صدر۔اردو مجلس بنگلہ دیش۔ ۱۹۸۰ء تا ۱۹۰۰ء

۴۔ممبر امیر خسرو سوسائٹی، سیکاگو ۱۹۸۷ء

۵۔بورڈ آف گورنرز، انیسٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ، ڈھاکہ یونیورسٹی کی ممبر

۶۔ممبر، بورڈ آف گورنرز انیسٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز، یونیورسٹی آف ڈھاکہ۔(۱۹۸۲ء۔۱۹۸۵ء)
(۱۹۹۷ء۔۲۰۰۰ء)

قومی اور بین الاقوامی اردو ریسرچ جرنل کے ساتھ بھی ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے منسلک تھیں۔

۱۔مدیر یادگار۔شعبہ فارسی اور اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

۲۔ممبر مجلس ادارت دس مسلم خواتین۔امدادیہ لائبریر ڈھاکہ

۳۔مدیر۔ڈھاکہ، یونیورسٹی جرنل آف اردو اور فارسی

۴۔ممبر (مجلس ادارت) دی ڈھاکا یونورسٹی جرنل آف اردو اور فارسی۔

۵۔ممبر (مجلس ادارت) دی ڈھاکہ یونیورسٹی اسٹڈیز: جرنل آف آرٹس

۶۔ممبر ڈھاکا یونیورسٹی جرنل آف اردو

۷۔مشاور دانش، جرنل آف ایران پاکستان، انیسٹیوٹ آف پرشین اسلام اور اسلام آباد، پاکستان۔

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے بنگلا دیش میں اردو زبان وادب کی ترقی میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔اردو زبان میں انکے تحقیقی مقالات، رسالوں اور کتابوں کی وجہ سے بنگلا دیش میں اردو کی بہت ترقی ہوئی۔انکی تحریروں اور تحقیقوں نے ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ بنگلا دیش کی نئی نسل اردو کی طرف راغب ہو رہی ہے۔انہوں نے اگر چہ فارسی ادب کی طرف زیادہ توجہ دی ہے، تاہم اردو ادب کی ترقی میں بھی وہ اپنی جگہ برقرار ہیں۔وہ اردو زبان وادب سے بے حد محبت رکھتی ہیں۔فی الحال ڈھاکہ یونیورسٹی میں سپر نیومیراری پروفیسر کے بعد آنریری پروفیسر کے عہدے پر مقرر ہیں۔اردو ادب کی ترقی میں ان کا نام ہمیشہ زندہ جاوید رہے گا۔

حوالہ جات:

۱۔ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، بنگلہ دیشے اردو ساہتیہ، ڈھاکہ، کامیاب، پروکاشن ۲۰۰۴ء ص: ۸۸

۲۔ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر، ڈاکٹر عندلیب شادانی کی غیر مطبوعہ بیاض، بنگلہ اردو شاہتیہ فاؤنڈیشن ۲۰۱۷ء، ص: ۷

۳۔ڈاکٹر جعفر احمد بھویاں، بنگلہ دیشے اردو ساہتیہ، ص: ۸۸

۴۔ایضا۔ص:

۵۔ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر،ڈاکٹرعندلیب شادانی (حیات اورکارنامے) ڈھاکہ برقی آرٹ پریس ۱۹۹۲ء ص:۹

۶۔ایضا۔ ص ۹۔۱۰

۷۔ ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردوادب، بنگلہ اردوشاہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکہ ۲۰۱۵ء ،ص:۷

۹۔ایضا، ص، ۷

۱۰۔کلثوم ابوالبشر کے ساتھ گفتگو

۱۱۔ ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر،ڈاکٹرعندلیب شادانی کی غیرمطبوعہ بیاض،ص:۷

۱۲۔ ڈاکٹرجعفراحمد بھویاں، بنگلہ دیش میں اردوادب، ص:۸۹

۱۳۔ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر، بنگلہ دیش میں اردوادب، ص ۱۱

۱۴۔ایضا، ص۔:۱۱

۱۵۔ایضا، ص:۱۰

۱۶۔ایضا، ص۱۱

۱۷۔ایضا، ص:۱۱

۱۸۔ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر،ڈاکٹرعندلیب شادانی کی غیرمطبوعہ بیاض، ص:۷

۱۹۔ ڈاکٹرجعفراحمد بھویاں، بنگلہ دیش میں اردوادب، ص:۹۱

۲۰۔ایضاً، ص:۹۱

۲۱۔ ایضاً،

۲۲۔ایضاً

۲۳۔ڈاکٹرکلثوم ابوالبشر کی Personal Information

اکیسویں صدی میں اردو ادب کے
منتخب خودنوشت: ایک تجزیاتی مطالعہ

سارہ بتول*

خودنوشت سوانح حیات میں مصنف اپنی داستانِ حیات، واقعات، روداد، حادثاتِ زندگی کی کہانی خود بیان کرتا ہے۔ وہ ماضی قریب و ماضی بعید اور شعور و تحت الشعور میں پوشیدہ یادوں کو تازہ کرتے ہوئے واقعات و حالات زندگی کو ترتیب کے ساتھ صفحہ قرطاس پر اُتارتا ہے۔ زندگی، نشیب و فراز اور تلخ و شیریں یادوں، سوز و غم اور مسرّت و شادمانی کے لمحات، یاس و حسرت، جستجو اور جہد مسلسل کے مجموعے کا نام ہے۔ انسانی ذہن انقلاب پسند ہوتا ہے۔ زندگی میں انقلاب و تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور یہ تغیر اور تبدّل زندگی کا جزء لاینفک ہوتا ہے۔ انسان ہر نئی اور بہترین چیزوں کو حاصل کرنے اور نئی و بلند منزل پر پہنچنے کا خواہاں رہتا ہے۔ جدید زندگی کی لوازمات اختیار کرتا ہے لیکن روایت سے انحراف بھی نہیں کرسکتا۔ اس لیے وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے حال اور مستقبل کی تعمیر و تکمیل کے لئے اقدامات اٹھاتا ہے۔

آج ہم اکیسویں صدی میں جی رہے ہیں۔ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے دور میں ایسی نئی نئی ایجادات اور اختراعات رونما پزیر ہو رہے ہیں۔ جس سے عقل انسانی حیران ہو کے رہ جاتی ہے۔ تیز رفتار زندگی میں لوگ اپنی ذات اور خود پرستی کی حد تک ہی سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ کسی کو اتنی فرصت میّسر نہیں کہ وہ دوسروں کی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرے نہ اس کی کوئی ضرورت محسوس کی جاتی ہے مگر اس کے باوجود ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ دوسروں کی زندگی کو پڑھنے میں دلچسپی دکھاتے ہیں۔ لوگ کامیاب شخصیات کی داستان حیات کو پڑھتے ہیں تاکہ ان کی جانکاری میں اضافہ ہو اور اس بات سے بھی

* پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد، بھارت

واقفیت حاصل ہو کہ انھوں نے کامیابی حاصل کرنے کے لئے کن کن راستوں کو اختیا کیا، ان راستوں میں کن کن مشکلات کا سامنا کیا اور کیسے انہیں حل کیا۔ اردو ادب میں اکیسویں صدی میں متعدد خودنوشت سوانح حیات منظر عام پر آچکی ہیں۔ زیرِ نظر مقالے میں ''اکیسویں صدی میں اردو ادب کے منتخب خودنوشت: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان کے چند تحت منتخب خودنوشت کو لیا گیا ہے۔ راقمۃ الحروف نے ان خودنوشت کے انتخاب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ خودنوشت نگاروں کا تعلق بے شک کسی بھی شعبہ ہائے زندگی سے ہو مگر ادب سے ان کا واسطہ ضرور ہو۔

'' آئینہ در آئینہ ''

اردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے خالق حمایت علی شاعر ہیں۔ یہ کتاب سال 2001ء میں ''دنیائے ادب'' کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ 400 صفحات پر مشتمل اس طویل منظوم خودنوشت میں مصنف نے اپنی سوانح حیات کو نظم اور غزل کی ہئیت میں قلمبند کر کے اردو ادب میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے اس لئے اپنی سرگزشتِ حیات، واقعات و روداد، حالات و کوائف، ماضی کی تلخ و شیریں یادوں اور اپنی شخصیت کو منظوم انداز میں پیش کیا ہے۔ حمایت علی شاعر اپنی کتاب کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے ''حرف اول'' میں لکھتے ہیں:

> ''آئینہ در آئینہ'' ایک طرح سے میری منظوم خودنوشت سوانح حیات کا ''حرفِ آخر'' ہے۔ جو میں نے اب سے پندرہ بیس سال پہلے ایک نظم کی صورت میں لکھ دیا تھا'' ۱

وہ لکھتے ہیں کہ صہبا لکھنوی نے ان سے مخاطب ہو کر ایک بار کہا ''تم جو مختلف نظموں میں اپنی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے رہتے ہو۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ باضابطہ اپنی سوانح حیات لکھ ڈالو''۔ اس طرح حمایت علی شاعر نے صہبا لکھنوی کی باتوں سے حوصلہ پا کر منظوم انداز میں لکھنے کا فیصلہ کیا جو بقول نکہت بریلوی ''شعری ادب میں پہلا تجربہ ہوگا'' اور جو واقعتاً پہلا اور کامیاب تجربہ ثابت ہوا۔ انھوں نے Voice Of America کو دئے گئے ایک انٹرویو میں اپنی کتاب کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''آئینہ در آئینہ'' میری منظوم سوانح حیات ہے۔اردو میں سوانح حیات نہیں لکھی گئی ۔چھوٹی موٹی کہانیاں ٹوسٹوری ٹائپ چیزیں تو لکھی گئیں،لیکن پوری زندگی قلم بند کرنا مشکل ہے۔جس میں زندگی کی مشکلات،اور باقی تمام مسائل بھی ہیں،یہ پہلی بار میں نے لکھا اور میری ہمیشہ ایک آرزو رہی کہ کوئی ایسا کام کروں جو میرے نام سے منسوب رہے''[۲]

حمایت علی شاعر کو شعر وسخن میں بڑی قدرت حاصل ہے۔اپنے اطراف وجوانب میں درپیش مسائل،تاریخی واقعات کی صداقت،انسانی زندگی اور بدلتے ہوئے زمانے کے کرب،انسانی رشتوں میں بدلاؤ،قدیم وجدید زندگی کے تضاد وتقاضوں یعنی بیرونی وخارجی زندگی کے علاوہ خود مصنف کی ذاتی وداخلی زندگی کے تمام مسائل ووجوہات،حالات وکیفیات،نازک ومعصوم جذبہ ہو یا اعتماد وحوصلہ کی بلندی،غرض گردش جہاں کو انھوں نے الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر شاعری کا جامہ پہنایا ہے۔ڈرامائی نظم ہو یا افسانوی نظم یا ثلاثی انھوں نے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔''آئینہ در آئینہ'' اردو کی پہلی منظوم خودنوشت سوانح حیات ہے اس سے قبل بیانیہ منظوم یا داستانیں لکھی جاتی تھیں مگر منظوم خودنوشت سوانح حیات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔حمایت علی شاعر نے پہلا تجربہ کیا ہے۔اس بات کا اعتراف خود شاعر موصوف کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''نثر میں خودنوشت سوانح حیات بہت لکھی گئی ہیں مگر نظم میں یہ ''پہلا تجربہ'' ہے،میں اسے پہلا تجربہ اسلیئے کہہ رہا ہوں کہ اس میں واقعات،تاریخی حوالوں کے ساتھ مرتب ہوئے ہیں۔اس میں دکھ درد (ہمارے) مشترکہ دکھ درد ہیں اور میری ہیں اور میری خوشیاں،میری بھی ہیں ایک طرف آپ کی بھی۔شاعری کا کمال یہی ہے کہ وہ فرد کی معرفت ''اجتماعی انسان'' کی ترجمان ہوتی ہے''۔[۳]

کتاب کا انتساب ''پاکستان کی نئی نسل کے نام'' کرتے ہوئے ابتداء غالب کے مندرجہ ذیل شعر سے کی ہے

بامن میاویز ائے پدر ،فرزندِ آزر رانگر
ھر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نہ کرد'' ٤

اور مزید اپنے اس شعر کے ساتھ تخلیقی کاروائی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ مری بات
خوشبو کی طرح اڑ کے ترے دل میں اتر جائے [۵]

یہاں سے قارئین اُس شاعر کی صلاحیت، لیاقت، ذوق وشوق، اسلوب وانداز بیان اور حُسنِ تحریر اور کمال فن کے قائل ہو جاتے ہیں اور مزید اس منظوم خودنوشت کے مطالعہ کا اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔

حمایت علی شاعر کو اردو شاعری میں صنف ثُلاثی کے مُوجد ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اردو میں تین مصروں والی صنف شاعری کو لکھنے کا تجربہ حمایت علی شاعر نے کیا ہے۔ جسے بعد میں گلزار صاحب نے اپنی کتاب ''بات پشمینے کی'' میں ثُلاثی کے بجائے ''ترویٰنی'' کا نام دیا ہے۔ حمایت علی شاعر کی ایک ثُلاثی ''یقین'' کے عنوان سے ملاحظہ کیجئے:

دشوار تو ضرور ہے، یہ سہل تو نہیں
ہم پر بھی کھل ہی جائیں گے اسرارِ شہرِ علم
ہم ابنِ جہل ہی سہی، بوجہل تو نہیں [۶]

حمایت علی شاعر کا تعلق ہندوستان کے ایک تاریخی اور اساطیری شہر اورنگ آباد سے تھا۔ ابتدائی زندگی یہاں گزاری۔ اس شہر کو مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے جانا گیا ہے۔ یہاں کے تاریخی مقامات، اجنتا ایلورا، بی بی کا مقبرہ اورنگ زیب کا مقبرہ خصوصاً یہاں کی تہذیب، دیومالائی، تمثیلی واقعات اور فن سنگ تراشی وغیرہ مشہور ہیں۔ خودنوشت نگار نے بہت خوبصورتی سے تاریخی واقعات ومقامات کی تصویر کشی کی ہے، جس سے ان کی منظر نگاری، تاریخ پر عمیق نگاہ، کمال مصوری کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ 1951ء میں ہجرت کر کے پاکستان گئے اور حیدر آباد سندھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ آزادی کے چار سال بعد وہ پاکستان گئے لیکن وہاں کی صورتِ حال خصوصاً مہاجروں اور پناہ گزیروں کی بدحالی اور کسمپرسی وہی تھی۔ جس کا تذکرہ 1947ء میں ہجرت کرنے والوں نے لکھا ہے۔ انھوں نے ایک نظم

''مہاجر بستیاں'' کے عنوان سے لکھی ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو:

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مسکن سے نکل آتا ہے لاشوں کا ہجوم
مادرِ پاک کے خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل، مجہول، نگہ گور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم ۷

مصنف نے اپنی نجی زندگی، گھریلو مسائل، ذاتی و دلی کیفیات، شادی و غمی کے جذبات، مجبوریوں و محرومیوں، ضروریات، معاشی تنگدستی و بدحالی غرض ہر ایک پہلو کے بارے میں متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی مسلسل جدوجہد، محنت اور قربانیوں کا صلہ ہے کہ ان کی اولاد پڑھے لکھے اور عملی زندگی میں اچھے مقام پر پہنچے ہیں۔ جب وہ ہجرت کر کے گئے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مال جائیداد اور گھر بار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے تن تنہا ایک نوزائیدہ ملک میں روشن اور آسودہ مستقبل کے خواب لے کر گئے تھے۔ اس وقت ان کے پاس علم کی دولت اور شاعری کے فن، یہ دو قیمتی اثاثے ہی محض ان کا کل سرمایہ تھا۔ بس اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا لیکن چونکہ وہ ایک رجائیت پسند شخصیت کے مالک تھے اس لئے انھیں ہجرت اور مختلف مقامات میں رہنے اور مختلف پیشے اختیار کرنے میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

''اپنا گریباں چاک'' ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ کتاب 2003ء میں منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال شاعر مشرق علامہ اقبال کے فرزند ہیں۔ اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے خاندانی پس منظر کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کی زندگی، کلام اقبال، فلسفہ اقبال کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میرے والد تو شاعر مشرق تھے۔ انھیں خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی تھی۔ رات کو خواب میں مولانا رومی کے ساتھ سفر کرتے تھے اور خدا کے ساتھ انسانی زندگی و بشری مسائل کو لے کر لڑتے تھے۔ جنھوں نے شکوہ جواب شکوہ جیسی شاہکار نظمیں لکھی ہیں۔

جب جاوید اقبال 14 برس کے ہوئے تب علامہ اقبال اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد انکی رہنمائی و سرپرستی کرنے کے لیے کوئی اپنا موجود نہیں تھا۔ تعلیم و تربیت دینے کے لیے ایک جرمن عورت دورس تھیں مگر زندگی میں صحیح اور غلط کی تربیت دینے کے لیے کوئی نہیں۔ بقول مصنف عہد بلوغیت میں پہنچتے پہنچتے ان کی فطرت میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوئیں مگر بہت جلد انھیں اس بات کا احساس ہو گیا اور وہ ایسے امور سے احتراز کرنے لگے۔ اس کے بعد اپنی تعلیم پر توجہ دی اور اپنے والد کی تقلید کرتے ہوئے انھوں نے بھی آکسفورڈ و کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامی فلسفہ اور اسلامی شریعت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ والد کی پیروی کی مگر وہ مقام و مرتبت جو علامہ اقبال کو نصیب تھا وہ انھیں حاصل نہیں ہو سکا۔ انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ انھیں اپنے والد سے ورثے میں بہت کچھ ملا ، وکالت پیشہ، اسلام اور فلسفہ، اسلامی ممالک کے اندرونی مسائل کا مطالعہ مگر ایک چیز جس سے جاوید اقبال محروم رہے وہ ''شاعری'' تھی۔ اس میدان میں ان کی کوششوں کے باوجود بھی اپنا کوئی مقام نہ بنا پائے۔ والد کے فن، اسلوب، خیالات اور افکار کو اپنا کر بھی وہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے والد کی نگاہ سامنے کی چیزوں سے نہیں بلکہ غائبانہ چیزوں سے دوچار ہوتی تھیں۔ وہ کائنات کی حقیقت اور خالق کائنات کو آشکار کرنے کی جستجو میں رہتے تھے۔ جاوید اقبال نے اپنے لیے مستقل طور پر الگ راہ اختیار کی اور ڈرامہ نویسی اور افسانہ نگاری میں اپنا جوہر دکھانے کی سعی کی مگر بقول مصنف انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ اپنے پیشے میں البتہ انھیں مقبولیت حاصل رہی۔ سپریم کورٹ میں جج کے عہدے پر فائز رہے مگر وہ اس سے بھی مطمئن نظر نہیں آتے ہیں۔ وہ خود کو فرزندِ اقبال ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان کی اپنی شناخت اور کارناموں کا عوام کی نظروں میں جگہ نہ بنا پانے پر ناخوش اور زیر لب احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ انھیں لگتا ہے اقبال کی شخصیت نے انھیں Over Shadow کر دیا۔ ان کا اپنا وجود اور کارنامے بس پشت ہو کر دبنے لگے۔ یہاں ان کے اندر کی انسانی فطرت کے وہ پہلو عیاں ہو جاتے ہیں جسے عرف عام میں رشک کہتے ہیں:

''میرے والد علامہ محمد اقبال' ایک عظیم شاعر' فلسفی اور تصور پاکستان کے خالق سمجھے

جاتے ہیں۔ان کے فرزند ہونے کی حیثیت سے زندگی کے مختلف ادوار میں میرا ردِّعمل مختلف رہا۔بچپن میں باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو میں نے برا نہیں مانا۔کیونکہ مجھے علم ہی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔جوان ہوا تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا۔یہ میرے لیپرم سلطان بود کی بنا پر فخر کا مقام تھا۔زندگی میں اچھا برا اپنا مقام پیدا کیا' تب بھی باپ کے حوالے سے پہچانا گیا تو مجھے بُرا لگا۔یہ میری ''انا'' کی نشوونما میں مداخلت تھی۔اب بوڑھا ہو چکا ہوں' تب بھی باپ کے حوالے سے میری شناخت ہوتی ہے۔[۸]

اس خودنوشت میں مصنف نے اپنے دور میں درپیش مسائل خصوصاً پاکستان اور اسلامی ممالک ،مختلف اسلامی ممالک میں ہونے والی مذہبی، سیاسی، سماجی اقتصادی تبدیلیوں اور معاشی حالات اور صورتِ حال پر روشنی ڈالی ہے۔اسلامی آئین، شریعت، فقہ وحدیث، اسلامی فلسفہ اور مشرقی فلسفہ کے بارے میں مصنف کے افکار ونظریات اور انکی گہری علمی کا اندازہ ہوجاتا ہے۔وہ بے شک پاکستان کو اسلامی جمہوری (Islamic Republic) ملک بنانے کے حامی تھے لیکن رجعت پسند بھی نہیں تھے۔جدید ترقی اور آسودہ زندگی کے خواہاں نظر آتے ہیں۔عوامی غربت، مفلسی، بے روزگاری، سماجی برائیوں، قدامت پسندی اور عورتوں پر ہوتے ظلم واستحصال کے خلاف کھل کر لکھا ہے۔اس کتاب میں تقسیم ملک کی داستان، پاکستان بننے کے بعد اس نوزائیدہ قوم کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کو مفصلاً بیان کیا ہے۔

مصنف کو تخلیقی صلاحیت و ہنر ورثے میں ملی۔انھوں نے مختلف صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی۔اس خودنوشت میں انھوں نے خودنوشت سوانح کے فنی لوازمات کو ملحوظِ نظر رکھ کر اپنی شخصیت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔سلیس عام فہم زبان کا ہی استعمال کیا ہے۔وہ اپنے واقعاتِ زندگی کو بیان کرتے وقت بعض اوقات متذبذب دکھتے ہیں۔مگر واقعہ کے بیان کو ادھورا نہیں چھوڑتے۔زیرِ نظر خودنوشت سوانح حیات میں سچائی، فن اور شخصیت تینوں بنیادی عناصر کے تئیں مصنف انصاف کرتے نظر آتے ہیں۔

''بڑے گھر کی بیٹی'' ڈاکٹر حبیب ضیا کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔یہ کتاب 2006ء میں سنگ میل پبلی

کیشنز حیدرآباد دکن سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔ مصنفہ نے کتاب کا انتساب اپنی ساس کے نام کیا ہے ۔بقول مصنفہ کتاب کا عنوان بھی اپنی ساس کی طرف سے طنزیہ طعنوں میں ملا ہوا نام ہے۔ مشرقی گھرانوں میں ساس بہوؤں میں نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔ اس کتاب میں مصنفہ ابتداء سے آخر تک اپنی ساس کے برتاؤ، بہو کے ساتھ انکے سلوک اور گھریلو انتشار کے کارناموں کی داستان بیان کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر انھوں نے تمام ناموافق حالات میں اپنے گھر کو بچانے کے لیساس کے ساتھ ہمیشہ حسن سلوک روا رکھا۔ چونکہ وہ پڑھی لکھی تھیں اسلیئے اپنے گھر کے ماحول کو بہتر بنانے اور بچوں کی تربیت صحیح کرنے کے لئے ہمیشہ ساس کے ساتھ محبت وعزت کے ساتھ رہیں۔ مشرقی خواتین کو بھی وہ اس راہ پر چلنے کی ہدایت دیتی ہیں۔ مصنفہ نے خواتین کے لئے سبق آموز باتیں بتائی ہیں۔ مصنفہ خود ملازمت کرتی تھیں۔ معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے گھر کے آدمی کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی گھر سے باہر اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرنے کے لئے زور دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مصنفہ نے مختلف سماجی برائیوں، فرسودہ رسم ورواج، غیر ضروری سنگھار، جہیز، دعوتِ طعام میں غیر ضروری اہتمام، رشتہ طے پانے سے قبل لڑکی دیکھنے کی رسم، شادی کے جوڑے اور جواہرات بنوانے کا رسم ،چہلم و برسی پر لنگر لگانے کی رسم، دیگر معاملات میں فضول خرچی کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ اور ان تمام برائیوں کو سماج سے دور کرنے کو ہر شہری کا اولین فرض قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر حبیب ضیا نے اپنی داستانِ حیات، زندگی کے نشیب وفراز، حسرتوں وخواہشوں، مجبوریوں ومحرومیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں غرض تمام پہلوں پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور ذمہ دار عورت تھیں اس لئے سماج کو اپنی نظر سے دیکھتی ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے مسائل وامورِ خانہ داری کے بارے میں وہ عورتوں کو اپنی زندگی کی روشنی میں اہم باتیں اور نصیحتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ عورتوں کی صورتِ حال اور سماج میں ان کے ساتھ کئے جانے والے استحصال سے وہ دل برداشتہ دکھائی دیتی ہیں:

> ''عورت سے ناانصافی کی خبریں اخبار میں پڑھتی ہوں۔ مختلف لوگوں سے ایسے واقعات آئے دن سننے میں آتے ہیں۔ روزانہ کئی عورتیں، کم عمر لڑکیاں سسرال والوں

کے ظلم کا نشانہ بن رہی ہیں۔عموماً مزید جہیز کے مطالبہ کو پورا نہ کرنے پر کیا جارہا ہے۔اس میں ہندو مسلم سبھی گھرانے شامل ہیں۔کیروسین چھڑک کر عورت کو آگ لگانا عام بات ہوگئی ہے۔''[۹]

اس طویل خودنوشت میں مصنفہ نے اپنے خاندانی پس منظر، اباواجداد، گھریلو ماحول، تعلیمی زندگی ،ازدواجی زندگی ، ملازمت اور تخلیقی سفر کو بیان کیا ہے۔اپنی ذات ،داخلی کیفیات ،اپنے گھر کے مسائل و حالات کے ساتھ ساتھ خارجی مسائل ،سیاسی وسماجی ،معاشی واقتصادی ،تہذیبی ومعاشرتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔اپنے مشاہدات وتجربات کو بیان کرتے ہوئے وہ اپنی ہم وطن بہنوں کو سبق آموز باتیں بتاتے ہوئے اپنے تجربات زندگی میں شریک کرتی ہیں۔

اس خودنوشت میں مصنفہ نے گھریلو مسائل ،خواتین طبقے کے مسائل وصورتِ حال ،عورتوں کے جذبات واحساسات کو بیان کیا ہے۔ان کے نزدیک سماج کی تعمیر وترقی میں مرد کے ساتھ ساتھ خواتین کا بھی برابر کا رول ہے۔سماج کی تعمیر کے لئے ایک بہترین شہری کے طور پر بچوں کی تربیت کرنے میں ایک ماں کا ہی رول ہوتا ہے۔کیونکہ گھر اولاد کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے۔اگر ماں میں سلیقہ نہیں ہوتو اس کی اولاد زندگی میں غلط راہ پر جاسکتی ہے۔مصنفہ کا تعلق حیدرآباد دکن سے ہے اس لئے اس خودنوشت میں حیدرآبادی تہذیب ،رسم ورواج اور حیدرآبادی پکوان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔خودنوشت میں فصیح زبان کا استعمال کیا گیا ہے۔ساتھ ہی ساتھ دکنی اردو کے الفاظ بھی بکثرت مستعمل ہیں جس سے زبان میں ایک انوکھی دلکشی پیدا ہوتی ہے۔

''گھنگھرو ٹوٹ گئے'' یہ آپ بیتی اردو کے مشہور شاعر قتیل شفائی کی سوانح حیات ہے۔ جو 2008ء میں دہلی سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی۔96 ابواب 654 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اپنی زندگی کے واقعات وحوادثات کے علاوہ اپنی شاعری اور فن پر بھی گفتگو کی ہے اور اپنے عہد کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔مصنف نے اپنی داستان حیات ،داخلی ونجی زندگی ،انفرادی مسائل ،شاعری وفن ،نفسیاتی کیفیات کے علاوہ اپنے خاندانی پس منظر ،آبائی وطن ،گردوپیش کے مسائل ،دوست و

احباب اور خود اپنے کردار، اخلاق، طرزِ زندگی، ادبی کارناموں، فطرت اور دیگر مصروفیات اور مشاغل کو بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ قتیل شفائی کا تعلق ہری پور پاکستان سے تھا۔ ''ہندکو'' ان کی مادری زبان ہے۔ اس لئے اس کتاب میں بھی 'ہندکو' اور 'پنجابی' زبان کے اثرات نمایاں ہیں۔ انھوں نے جب ہوش سنبھالا اور عملی زندگی میں قدم رکھا تو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بے روزگاری سے نجات پانے کے لئے مختلف شعبوں میں کام کیا مگر فطرتاً شاعر ہونے کے سبب کہیں مستقل طور پر نہ رہ سکے۔ پھر صرف شاعری اور قلم کو روزگار کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی رو میں متعدد جگہوں پر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ نوجوان ادیبوں کو ادب میں اپنا مقام بنانے کے لئے وقت لگتا ہے۔ سفر زندگی میں مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے بزرگ ادیبوں کی خوشنودی و خوشامدی کرنی پڑتی ہے۔ قتیل شفائی فلمی دنیا سے بھی وابستہ رہے۔ فلموں کے لئے کئی گیت لکھے۔ تقسیم ہند کے بعد بھی ان کی کئی غزلیں و گیت ہندی فلموں کی زینت بنتے رہے۔ وہ آخری عمر تک ادب، زبان، تہذیب و ثقافت، اور محبت و انسانیت کی خدمات انجام دیتے رہے۔

قتیل شفائی نے اپنی آپ بیتی میں اپنی زندگی میں وقوع پذیر تمام حالات و حوادثات اور نصف صدی میں برِصغیر میں رونما ہونے والے حالات و واقعات، تاریخی حقائق، انسانی معاشرہ اور سماج میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کیا ہے۔ تقسیم ہند کے المیہ سے نہ صرف انسانی زندگی اور رشتے متاثر ہوئے بلکہ ہندوستان کی دو ہزار سالہ پرانی تاریخ بکھر گئی۔ ہماری مشترکہ تہذیب، ثقافت، زبان اور ادب پر بھی گہرا اثر پڑا۔ آزادی سے قبل ادباء و شعراء کے درمیان تبادلہ خیال اور مکتوبات اور مراسل کا ایک سلسلہ رہتا تھا، وہ بھی بند ہو گیا۔ تقسیم کے دوران اولادِ آدم وحشی بن کے اپنے ہی بھائی کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے۔ اس سیاہ تاریخ کو یاد کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں:

> ''ان دنوں جبکہ انسان وحشی بن چکا تھا، ہم نے دیکھا جس طرح یہاں کچھ مسلمان نے انسان بن کر غیر مسلموں کی مدد کی اسی طرح انڈیا میں بھی کچھ ہندوؤں، سکھوں نے انسان کی حیثیت سے مسلمانوں کی مدد کی۔ ایسے ہی انسانوں میں ایک کنور مہندر سنگھ

بیدی تھے۔ تقسیم کے زمانے میں وہ دہلی میں مجسٹریٹ تھے۔ وہ شاعر تھے اور میرا ایمان ہے کہ جس شخص کا شعر و ادب کے ساتھ ذرا سا بھی تعلق ہوگا وہ گداز طبیعت کا مالک ہوگا اور منصف مزاج ہوگا۔ اس کی نظر میں مذہب، ملت بعد میں آئیں گے' انسانیت پہلے آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بغیر تمام ادبی محفلیں نامکمل سمجھی جاتی ہے۔''[۱۰]

زیرِ نظر خودنوشت میں مصنف نے متعدد جگہوں پر اپنی غزلوں اور گیتوں کو درج کیا، جس سے ان کی تحریر اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ہندی اور پنجابی زبان کے الفاظ اور محاورے کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں شائستگی کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ تلمیحات و استعارات کے پیرائے میں اپنے گرد و پیش پر روشنی ڈالی ہے۔ ہندو پاک کی مشترکہ تہذیب و ثقافت، ادب اور زبان اور آپسی محبت و بھائی چارگی قتیل شفائی کا ایمان تھا۔ انھوں نے اس خودنوشت میں اپنے تجربات و مشاہدات اور یادوں کی روشنی میں بے شمار ایسے واقعات بیان کئے ہیں جس سے ان کی انسان دوستی، سکیولر سوچ، وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔

''جستجو کیا ہے؟'' برصغیر ہند و پاک کے معروف فکشن نگار انتظار حسین کی خودنوشت ہے۔ جو 2011ء میں لاہور سے شائع ہو کر منظر عام پر آئی۔ انتظار حسین کا تعلق ڈھبائی بلند شہر اتر پردیش سے تھا۔ تعلیم میرٹھ سے پائی۔ ابتدائی زندگی میرٹھ کے گردنواح میں گزاری۔ تقسیم کے بعد وہ بھی اس پار جانے والے ایک قافلے کے ساتھ بے خواب، بے سمت نکل گئے۔ لاہور میں کرشن نگر نامی محلّہ میں قیام کیا اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پاکستان پہنچ کر روزی روٹی کا مسئلہ درپیش آیا۔ اس لئے مختلف اخباروں سے منسلک رہے۔ ''ادبِ لطیف''، ''خیال''، ''آفاق''، ''جنگ'' کی ادارت سنبھالتے رہے اور انگریزی اخبار ''The Dawn'' میں مستقل طور پر کالم نویسی کرتے رہے۔ ان کے کئے افسانوی مجموعے اور ناول ''بستی'' منظر عام پر آئے ہیں اور کئے افسانوں کا ہندی اور انگریزی میں Leaves کے عنوان سے ترجمہ ہوا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ادبی کارناموں اور تخلیقی سرمایے کے بارے میں اس خودنوشت میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے لئے مختلف و منفرد تخلیقی راستہ اختیار کیا، نہ وہ ترقی پسند تحریک سے اور نہ حلقہ

ارباب ذوق سے وابستہ رہے بلکہ انھوں نے اپنے اسلوب، تخلیقی صلاحیت، ذہنی ونفسیاتی گوشوں، فنی کامل اور تفکرات کو منفرد وجداگانہ راہ پر گامزن کیا اور انھیں وہ شہرت ملی جس کے وہ مستحق ہیں۔

''اس خودنوشت میں مصنف نے اپنی سرگزشتِ زندگی، داخلی و خارجی زندگی، رودات و حوادثات کو مکمل طور پر بیان نہیں کیا بلکہ مختصراً روشنی ڈالی۔ واقعات کی ترتیب وتاریخ کے تعین بھی صحت مند طریقے سے نہیں اپنایا۔ وہ 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان گئے۔ ڈھابی اور میرٹھ کے گردنواح میں زندگی کا ایک پڑاؤ گزارا۔ یہاں کی تلخ وشیریں یادوں، وہ گھر میں واحد لڑکا تھا، والدین اور بہنوں، دوست و احباب، محلّہ، قصبہ اور ان تمام یادوں کو چھوڑ کے تن تنہا پاکستان کا رخ کیا تھا مگر دل ہمیشہ وطن کے لئے تڑپتا رہا۔ ان کے دل میں وطن کی یادیں خلش بن کے چبھتی رہیں۔ انھوں نے اپنے درد وکرب کو کھل کر اس خودنوشت میں بیان کیا ہے۔ خودنوشت کا آغاز مصنف کے اپنے ماضی کی بازیافت سے ہوتا ہے۔ وہ ایک لمبے عرصے کے بعد ہندوستان لوٹ کر آتے ہیں۔ اس محلّہ میں جہاں ان کا بچپن گزرا تھا پہنچ کر اپنے تاثرات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''آخر کے تئیں میں نے اپنی گمشدہ بستی کو پالیا۔ زمانے کی گردش نے اس کی تو شکل و صورت ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کے صورت۔ مگر پھر بھی کوئی در، کوئی کوئی دیوار اسی طرح کھڑی تھی اور میں جیسے صدی بعد نہیں بلکہ صدیوں بعد زمانے کے تھپیڑ کھاتا کھاتا گرتا پڑتا وہاں کسی نہ کسی طور پر آپہنچا ہوں۔ زمانے کی گرد بہت پڑ گئی تھی۔ پھر بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ کوئی کوئی در کھڑا رہ گیا ہے اور کوئی کوئی ٹھیا جیسا چھوڑ کر گیا تھا ویسا ہی قائم ہے۔ اس کے طفیل اب میرے لئے کتنا آسان ہوگیا ہے کہ یہاں سے زقند لگاؤں اور ان گلیوں، بازاروں میں پہنچ جاؤں جہاں میں نے کتنی خاک اُڑائی تھی اور پھر جلدی سے آگے بڑھ کر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاؤں۔''[۱۱]

اس خودنوشت کا خاصا بڑا حصہ موصوف کے ہندوستان کے اسفار کے تذکروں پر مشتمل ہے

۔اس لئے یہ سفرنامہ نما خودنوشت لگتی ہے۔قاری بعض اوقات تذبذب میں گرفتار ہوجاتا ہے کہ اس کتاب کو کس صنفِ ادب کے زمرے میں رکھا جائے لیکن جب مصنف کی رائے پڑھتے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ کتاب خودنوشت سوانح حیات ہے۔البتہ انھوں نے اپنی مکمل زندگی کا احاطہ نہیں کیا بلکہ ان واقعات کو قلمبند کیا ہے جس نے موصوف کی زندگی اور شخصیت پر اثر چھوڑا ہو۔انھوں نے ہندوستان کی مختلف ادبی محفلوں ونشستوں میں شرکت کی۔یہاں کے ادیبوں وشاعروں کے ساتھ گزارے لمحات ویادوں،مختلف یونیورسٹیوں میں پیش آئے واقعات،اردو و ہندی ادیبوں کے ساتھ کیئے بحث ومباحثوں،ہندی اردو ساجھی وراثت کی باتوں اور مذاکرات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اپنی یادوں،گذشتہ شب و روز کی مصروفیات،روداد وواقعات،مشاغل زندگی،تجربات وتاثرات غرض تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔بقول مصنف انھوں نے ادبی محفلوں میں شرکت کرنے کی غرض سے دنیا کے دیگر ممالک کا سفر کیا لیکن ہندوستان کا سفران کے لیئے سب سے خاص رہا ہے۔وہ جرمنی وجاپان کے دعوت نامے رد کر کے ہندوستان تشریف لاتے تھے۔یہ ان کی اپنی مٹی سے محبت کا جذبہ،ہندوستانیوں کے تئیں محبت وخلوص اور عشق کا نتیجہ ہے۔ہندوستان میں انھیں ساہتیہ اکادمی کی طرف سے ''پریم چند فیلوسشپ'' سے نوازا گیا۔مختلف ادبی دوروں پر انھیں ہندوستان کے مختلف شہروں،قصبوں اور ریاستوں میں بطور سرکاری مہمان گھومتے ہوئے مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں میں جانے کا موقعہ ملا۔اپنی یادوں کو دہراتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''لو صاحبو پریم یاترا تمام ہوئی۔پورپ،پچھم،اتر،دکھن،ہندوستان کی ساری وشاؤں کو چھو آیا۔آج یہاں کل وہا۔کلکتہ سے زقندی بھری راجستھان میں جا اترا۔جمنا ندی کو پار کر کے چلا اور کاویری کنارے پر جا کر دم لیا اور زرا ان پوتر استھانوں کو دھیان میں لاؤ' کاشی' متھرا' ورنداون' سو کتنے گھاٹوں کا پانی پیا اور کس کس نگر کی خاک پھانکی۔''[۱۲]

یہاں ہمیں مصنف کی اپنے آبائی وطن سے محبت،جڑوں سے رفاقت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔انسان نقل مکانی کر کے کسی بھی اجنبی مقام میں کتنا بھی آسودہ حال کیوں نہ رہے۔مگر عمر کے ساتھ

انھیں اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی ہے اور یہی دعا نکلتی ہے کہ مرنے سے پہلے اگر وہ تمنا پوری نہیں ہوئی تو مرنے کے بعد میرا جسم وطن کی خاک میں جا ملے۔

اس خودنوشت میں مصنف نے فلش بیک تکنیک اور افسانوی تکنیک اختیار کی ہے۔ چونکہ وہ بنیادی طور افسانہ نگار ہیں اس لئے افسانوی رنگ غالب ہے۔ اسلوب، فن اور زبان و بیان میں بھی افسانے کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ جذبات نگاری کے بڑے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، جنھیں پڑھ کر قاری کو افسانہ اور ناول دونوں اصناف کا یکساں لطف ملتا ہے۔ انتظار حسین کی خودنوشت نگاری سے متعلق محمد شہباز یوں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک انتظار حسین کے اسلوب کا تعلق ہے تو بلاشبہ ان کا اسلوب بڑا جاندار اور توانا ہے۔ ان کا تمثیلی لب و لہجہ پر مبنی اسلوب، جس میں تلمیحات، قصص الانبیاء، اسلامی تاریخ کے واقعات، مذہبی روایت، اقوال زرین، ملفوظات، بزرگانِ دین، اساطیری دیومالائی کردار اور سیرت ساگر کتھاؤں کی دنیا میں آغاز و انجام قاری بند مٹھی میں تتلی کی طرح ان کی گرفت میں رہتا ہے۔'' اوپر سے اس کا داستانوی اسلوب سونے پر سہاگہ ایسا کام کرتا ہے۔ ان کے یہاں گھن گرج رکھنے والے الفاظ کی بجائے دھیمے اور ملائم الفاظ ہی جگہ پاتے ہیں۔''[۱۳]

اس خودنوشت میں ہندی الفاظ کو واقعات و کیفیات کے اظہار کے لئے کچھ اس مہارت سے پیش کیا ہے کہ جملے کی ساخت میں کوئی نمایاں تبدیلی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ خالص ہندوستانی زبان کا احساس ہوتا ہے اور جملے کی حسن و نزاکت کو دوبالا کر دیتی ہے۔

مجموعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی میں برصغیر ہندو پاک میں اردو میں خودنوشت لکھنے کا سفر جاری و ساری ہے بلکہ دیگر اصنافِ ادب کے ہمدوش، زبان، انداز و بیان، اسلوب اور فن میں نت نئے تجربات کے ساتھ یہ بھی تیز رفتاری سے ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ سچائی، فن اور شخصیت یہ تین بنیادی عناصر ہیں جس پر خودنوشت کی عمارت کھڑی ہے، متذکرہ بالا منتخب خودنوشتوں کے حوالے سے دیکھا جائے

تو ان میں مصنفین ان تینوں عناصر کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان، نئے اسلوب و انداز، خارجی دنیا کے مسائل میں دلچسپی، عالمی سیاست، تہذیب وثقافت سے باخبری، خودکشائی اور خودانکشافی میں بے باکانہ انداز ان تمام خودنوشت نگاروں میں نمایاں اور منفرد ہیں۔ روزمرہ کے زبان میں ادبی چاشنی پیدا کی گئی ہے۔ ان خودنوشتوں میں نئے نئے اسلوب اور انداز اپنائے گئے ہیں۔ شاعری ومنظوم انداز میں تحریر کردہ خودنوشت ہو یا افسانوی وناول کے طرز میں لکھی گئی سرگزشت سب کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان میں گذشتہ صدی وروان صدی کے تمام صورت سحالات وواقعات کی عکاسی کی گئی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تاریخی، سیاسی، سماجی، ادبی، تہذیبی ومعاشرتی زندگی کی گوناگوں پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ آئینہ در آئینہ۔ 2011ء۔ حمایت علی شاعر۔ ص:8

۲۔ اردو ادب کی قد آور شخصیت: حمایت علی شاعر، از مدیحہ انور۔ ہفت روزہ ادبستان، پاکستان، 9 جولائی 2011)

۳۔ آئینہ در آئینہ۔ حمایت علی شاعر۔ 2011۔ ص 12

۴۔ آئینہ در آئینہ۔ ص۔ 4

۵۔ آئینہ در آئینہ۔ ص۔ 6

۶۔ حرف حرف روشنی۔ 1986ء۔ حمایت علی شاعر۔ ص۔ 15

۷۔ آگ میں پھول۔ 1981ء۔ حمایت علی شاعر۔ ص:133

۸۔ اپنا گریباں چاک از جاوید اقبال۔ 2003ء۔ ص:8

۹۔ بڑے گھر کی بیٹی۔ ڈاکٹر حبیب ضیا۔ 2006ء۔ ص 180

۱۰۔ گھنگھرو ٹوٹ گئے، قتیل شفائی۔ 2008ء۔ ص:107

۱۱۔ جستجو کیا ہے؟۔ انتظار حسین۔ 2012ء۔ ص:15

۱۲۔ جستجو کیا ہے؟۔ انتظار حسین۔ 2012ء۔ ص:259

۱۳۔ رسالہ بازیافت، لاہور

جرمنی میں اردو

سرور غزالی*

جرمنی کا دنیا کی دوسری تہذیبوں کے ساتھ رابطہ بہت قدیم عرصے سے ہے۔ اٹھارویں صدی میں ایک جرمن شاعر، مصنف اور فلسفی گوئٹے کی عربی زبان، قرآن اور فارسی زبان سے دلچسپی اور خاص کر حافظ کی شاعری کا مطالعہ ہمیں اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جرمن قوم اور خصوصاً جرمن ادب وفلسفہ کو دوسری اقوام کے ادب وفلسفہ سے بہت زیادہ دلچسپی اور لگاؤ رہا ہے۔

ہم یہاں برصغیر کے حوالے سے اردو زبان کے تناظر میں بات کرتے ہیں۔

جرمنی میں اردو زبان کو کون لیکر آیا یہ تو بتانا مشکل ہے اور یقیناً علامہ اقبال سے پہلے بھی کئی لوگ جرمنی آئے مگر اردو زبان کے بولنے والوں میں یہی گمان غالب ہے کہ اقبال کی جرمنی میں آمد سے اردو کو بہتر طور پر متعارف ہونے کا موقع ملا۔ جرمنی میں ہائیڈل بیرگ میں اقبال کے قیام ان کے روابط اور ان کی شاعری پر جرمن زبان کی شاعری کے اثرات ثبت ہیں۔ اور جرمن اردو زبان میں اب بھی گہرا رابطہ ہے۔

اقبال نے ۱۹۰۵ اور ۱۹۰۷ کے درمیان جرمنی میں قیام کیا اور یہاں سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے اور اس دوران ادب و لٹریچر سے گہرے رابطے اور مطالعے نے ہی اردو کو جرمنی میں متعارف کرایا۔

اقبال نے اپنے جرمنی کے شہر ہائیڈل برگ میں قیام کے دوران جرمن زبان، تہذیب اور جرمن ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اقبال نے جو ادبی فلسفہ اور قومی شعور پیش کیا اس میں جرمن ادبی اور قومی شعور سے انسپائیریشن ضرور موجود ہے۔ دوسری جانب اردو ادب کو بھی انہوں نے جرمنی میں متعارف کرایا۔

اقبال نے خود لکھا ہے کہ ,پیامِ مشرق, دراصل گوئٹے کے دیوان مغرب کا جواب ہے۔[1]

---

* لکچرار، شعبہ تدریس ایشائی اور افریقی زبانیں، ہمبولڈ یونیورسٹی، برلن، جرمنی

جرمنی کے شہر ہائڈل برگ اور میونخ میں اقبال کا کنندہ نام اردو زبان سے جرمن قوم کی دلچسپی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔

ہائیڈل برگ شہر کی جامعہ میں اقبال چیئر کا اجراء، یہاں کا شعبہ اردو اور جرمنی کی دیگر جامعات میں اردو کی تعلیم اس رابطے کی مستند کڑیاں ہیں۔

اقبال کے بعد اردو کو جرمنی میں متعارف کروانے اور دونوں تہذیبوں میں رابطے قائم کرنے کی سب اہم کڑی کی صورت میں اینی میری شمل کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے ۔ آ ننے میری شمل Annemarie Schimmel ہی دراصل وہ اہم شخصیت ہیں جن کے سر، اردو کو آج کے جرمنی صحیح معنوں میں متعارف کرنے کا تاج رکھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

محترمہ آ ننے میری شمل، جرمنی کے شہر ایرفورٹ کے ایک نہایت اعلیٰ تہذیبی اقدار کے حامل متوسط طبقے کے ایک گھرانے میں ۷ اپریل ۱۹۲۲ء پیدا ہوئیں۔ان کے والد پاؤل محکمہ ڈاک میں ملازم تھے۔جبکہ والدہ کا تعلق ایک بحری تاجر گھرانے سے تھا۔گرچہ انکا تعلق کسی ادبی گھرانے سے نہیں تھا، مگر پھر بھی انہیں بچپن ہی سے شعروشاعری سے دلچسپی تھی۔

ہاورڈ یونیورسٹی سے جرمنی لوٹ کر آپ نے اپنی بقیہ عمر شہر بون میں گزار دی۔سن ۲۰۰۳ میں آپ کا انتقال ہوگیا۔انہیں اسلامی ادب اور تہذیب سے دیرینہ لگاؤ تھا مگر آپ ساری زندگی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہیں۔انہوں نے پچاس سے زائد کتابیں اور سو سے زائد مقالے اسلامی ادب وتہذیب اور صوفیانہ کلام پر شائع کروائے اور فارسی ،اردو،عربی، سندھی اور ترکی زبانوں میں لکھیں گئیں نظموں کا ترجمہ انگریزی اور جرمن زبانوں میں کیا۔بلی سے خصوصیت کے ساتھ پیار کی وجہ سے انہوں نے ایک کتاب ''بلی کا اسلامی ادب میں مقام'' پہ ایک کتاب لکھی۔صوفیانہ طرزِ زندگی سے اپنی دلچسپی کے سبب انہوں نے ہندسی علامات کی مختلف تہذیبوں میں روایت پر بھی ایک کتاب تحریر کی۔لیکن ان کی دلچسپی کا سب سے اہم موضوع صوفی ازم ہی رہا، اسلام کی رہبانیت کی ایک شاخ۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے صوفیوں نے تسلیم کیا کہ آپ

اسلامی تاریخ اور صوفی طرزِ زندگی کی ماہر تھیں۔[۲]

ہائیڈل برگ کی جامعہ میں اب بھی اردو زبان پر کافی کام ہو رہا ہے۔ اور یہاں شعبہ ہندی کے ساتھ اردو کا شعبہ بھی فعال ہے۔ یہاں اردو کی تعلیم باقاعدگی سے دی جا رہی ہے۔ اور اس کی شعبہ جاتی سربراہ کرسٹینا اوسٹر ہولڈ خود ایک اردو داں ہیں اور نہایت تندہی سے اردو کی خدمت کر رہی ہیں۔ آپ نہایت شستہ اردو بولتی ہیں اور انکا شعبہ تواتر کے ساتھ اردو ادب کے پروگرام کراتا رہتا ہے۔ پاکستان سے مندوبین بلائے جاتے ہیں۔

کرسٹینا اوسٹر ہولڈ کا تعارف اردو کے ہمعصروں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہیں۔ لیکن دور دراز سے مدعو مندوبین کے لئے عرض کرتا چلوں کہ آپ نے اردو میں ایم اے کیا، پھر قرۃ العین حیدر پر ڈاکٹریٹ کیا اور شعبہ اردو کی سرپرست کے طور پر ہائیڈل بیرگ کی جامعہ سے منسلک ہوئیں۔ آپ، بے شمار تراجم، تحقیق اور تحریر سے اردو زبان کی خدمت کر رہی ہیں۔ آپ نے عصرِ حاضر کے اردو کے عظیم شاعر فیض پر خصوصیت سے کام کیا۔[۳]

اس کے علاوہ برلن کی فری یونیورسٹی کے انڈولوجی ڈیپارٹمنٹ کے سابق سربراہ جناب ہیلمٹ نسپٹل کا نام بھی اردو کی جرمنی میں ترقی کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ نہ صرف روانی سے اردو بولتے تھے بلکہ لکھنے کے بھی ماہر تھے۔ برلن میں اردو کی ترویج میں پروفیسر نسپٹل کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ آپ اردو زبان سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنے طلباء کی اردو زبان سیکھنے کے سلسلے میں بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔[۴]

اردو زبان جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں جرمنی کی مختلف جامعات میں باقاعدگی سے پڑھائی جاتی ہے۔ جن میں فی الوقت، جرمنی کے شہر ائرفورٹ میں ائرفورٹ یونیورسٹی، ہائیڈل برگ کی یونیورسٹی، ڈیپارٹمنٹ برائے ساؤتھ ایسٹ ایشیا اور برلن کی ہمبولڈ یونیورسٹی کے شعبہ ایشین اور افریقن اسٹڈیز، یہاں مختلف مدارج کے کورسز پڑھائے جاتے ہیں۔ ان میں شائید سب سے زیادہ کورسز اور ان کورسز میں تنوع بھی یہیں

ملے گا۔ ہائیڈل برگ کی جامعہ میں اردو کے مختلف مدارج کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ جو جرمن طلباء میں بہت مقبول ہیں۔ بنیادی کورس میں طلبا کو بولنے، پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اور بنیادی گرامر بھی سکھائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں ثانوی کورس بھی کروایا جاتا ہے۔ جس میں اردو کو جدید بہتر طریقے اور گہرائی سے سکھایا جاتا ہے۔

عام بول چال کے مروجہ اصول سکھائے جاتے ہیں اور جدید لسانی تعلیم کے تمام اصولوں کے تحت اردو زبان سکھائی جاتی ہے۔

اردو زبان کی نئی بستیاں، یورپ اور دیگر ممالک جن میں برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور کینڈا وغیرہ سرِ فہرست ہیں، میں اردو بولنے اور اردو کا دم بھرنے والے افراد نے ہی بسائی ہیں۔ ان ممالک میں ہندوستان اور پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے اردو بولنے والے افراد نے اردو کی شمع جلائی اور اب اردو زبان ان ممالک میں نا نظر انداز کی جانے والی زبان کے طور پر ان معاشروں کا حصہ ہیں۔

دیگر ممالک کی طرح ہی، مگر اوپر بیان کردہ خصوصیات کے ساتھ اردو زبان، جرمنی میں بھی اپنی حیثیت منوا رہی ہے۔ جرمنی میں اردو کو جہاں یہ فوقیت حاصل ہے کہ، یہ وہ ملک ہے جس شاعر مشرق کے فلسفے کو جلا، اور شاعری کو اعلی مدارج بخشا، وہیں یہ مسلہ درپیش ہے کہ یہاں اردو بولنے والے افراد کی بہت ہی کم تعداد قیام پذیر ہے۔

اردو بولنے افراد کی اس کمی کی وجہ سے یہاں اردو کی ترویج کا کام خاصا مشکل ہے۔ تاہم یہاں اردو کی شمع روشن ہے اور اردو کے پروانے یہاں اردو کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔

یہ بھی کہنا ذرا مشکل ہے کہ جرمنی میں سب سے پہلا رسالہ کب اور کہاں سے نکلا تھا۔

مگر میری تحقیق کے مطابق سن اسی کے اوئل میں فدوی نے جو رسالہ ہاتھ سے لکھ کر فوٹو کاپی کی صورت میں نکالا تھا، وہی برلن میں، موجودہ دور کا اول اول رسالہ تھا۔ اس رسالے کو کاوش کا نام دیا گیا تھا۔ جو بعد میں کاوش آن لائن کر دیا گیا تھا۔ اس رسالے کو فدوی اور رسالے کے مدیر برادرِ خورد انور رہبر رہبر سن ۸۸ سے سن ۲۰۰۰ تک نکالتے رہے ہیں۔ جبکہ آن لائن کاوش سن ۲۰۰۶ تا ۲۰۰۸ تک صرف فدوی تنہا نکالتا رہا۔

اس رسالے کا حوالہ عشرت معین کی کتاب، جرمنی میں اردو میں ملتا ہے تاہم موصوفہ نے درست حوالہ نہیں دیا چونکہ وہ اس وقت جرمنی میں تشریف نہیں لائیں تھیں اور ماخذ کا ذکر بھی نہیں ہے۔ [۵]

یقیناً اس ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جرمنی کے ریڈیو ''ڈوچے ویلے'' کی اردو سروس کا رسالہ بھی کافی عرصے قبل سے نکل رہا ہے۔

مگر خالص ادبی رسالے کا درجہ اس کو نہیں دیا جاسکتا ہے۔

اردو کی ترویج میں ڈوچے ویلے کا کردار خاصا اہم ہے۔ اس کی اردو نشریات اور اردو ویب سائیٹ جرمنی میں اردو کو متعارف کرانے میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔

اس وقت جرمنی میں جو کام ہو رہا ہے اس کا مرکز، ہائیڈل برگ کی جامعہ، کولون سے ڈوچے ویلے کے ساتھ ساتھ دو بڑے شہروں یعنی برلن اور فرینکفرٹ سے بھی جوڑا جاسکتا ہے۔ ان دونوں شہروں میں اردو پر کافی کام ہو رہا ہے۔ یہاں باقاعدگی سے اردو مذاکرے، مشاعرے اور شامِ افسانہ منعقد کرائے جاتے ہیں۔ یہاں مقیم چیدہ چیدہ شاعر اور لکھاری اردو کی آبیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنا اپنا کلام اور افسانوں کا مجموعہ شائع کرایا ہے۔

اسوقت جرمنی کے سب سے عمر رسیدہ شاعر، نقاد اور افسانہ نگار حیدر قریشی صفحہ اول کے لکھاری ہیں، آپ فرینکفرٹ کے علاقے آخن باغ سے جدید اردو نامی رسالہ بھی نکالتے رہے ہیں، اور پھر بعد میں یہ آن لائن رسالہ بن گیا تھا۔ وہ اب بھی آخن باغ میں رہتے ہیں اور گاہے بگاہے اپنی تحریر نذر قارئین کرتے رہتے ہیں۔

مرحوم منیر الدین بھی ہمبرگ سے خاصے عرصے تک اردو کی خدمت میں لگے رہے ہیں اور انہوں نے افسانہ نگاری اور مضمون نویسی کو اپنایا ہوا تھا۔ [۶]

اسوقت بزرگ ادیب، شاعر اور افسانہ نگار عارف نقوی جرمنی کے ادبی منظر نامے میں ایک درخشندہ ستارے کی مانند چمک رہے ہیں۔ آپ کی شاعری کمال کی ہے اور بہت اچھے افسانے بھی لکھ رہے ہیں۔ وہ

اسوقت تک لگ بھگ بارہ کتابوں کے خالق ہیں اور سوانح عمری اور ماضی کے اوارق پلٹنے میں بھی ماہر ہیں۔
برلن شہر سے اسوقت ایک آن لائن اخبار پاکبان بھی نکل رہا ہے، جو کہ خالص ادبی تو نہیں مگر اس کے ادبی صفحات پر اس کے مدیر اعلی ظہور احمد صاحب مختلف ادبی سرگرمیاں اور ادبی شہ پارے شائع کرتے رہتے ہیں۔ ۷

اس کے علاوہ ایک ادبی رسالہ ''احساس'' بھی جرمنی سے نکلتا ہے۔ جسے شفیق مراد فرینکفرٹ جرمنی سے نکال رہے ہیں۔

افسانہ نگاری میں درج ذیل افسانہ نگار اس وقت جرمنی میں فعال ہیں:

حیدر قریشی، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی کتابوں میں، قصے کہانیاں، روشنی کی بشارت، افسانے، ایٹمی جنگ، میں انتظار کرتا ہوں، میری محبتیں اور سوئے حجاز شامل ہیں۔ ۸

عارف نقوی، نے بھی بے شمار افسانے لکھیں ہیں اور کئی ایک افسانوی مجموعے کے مصنف ہیں۔
فدوی سرور غزالی کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، عشرت معین سیما کا ایک افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے ''گرداب اور کنارے''، ہما فلک نے بھی اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''روح دیکھی ہے کبھی'' پیش کیا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''سندیسے'' زیر طبع ہے وحید قمر کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام ہے'' ستاروں سے آگے'' فوزیہ مغل کے افسانوں کا مجموعہ بنام ''مائن کنارے'' شائع ہو چکا ہے۔ انور ظہیر رہبر اور سلمان حمید متعدد خوبصورت افسانے کشیدہ کر کے افسانہ نگاروں کی صف میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔
مختلف شہروں میں مختلف افراد، ذاتی اور اجتماعی طور پر فروغ اردو کے لیے کوشاں ہیں۔ ظاہر ہے اس میں سے زیادہ تر تنظیمیں اس مقصد کے تحت وجود میں آئیں کہ دیار غیر میں کچھ تو تھوڑا بہت وطن اور یادِ وطن کی سوغات میسر ہوں۔ جرمن کے ادبی دھارے میں شامل ہونا یا جرمنی کے ادبی حلقے میں اردو زبان کو متعارف کرانا تھوڑا مشکل اور وقت طلب کام بھی ہے۔
اور اب اردو کی نئی بستیوں میں لندن، شکاگو، ٹورنٹو کے ساتھ ساتھ جرمنی کے ان دونوں شہروں کو بھی نئی

بستیوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

ہمبرگ میں بھی اردو پر کافی کچھ کام ہو رہا ہے۔

کسی بھی ملک و معاشرے سے رابطے اور اس ملک معاشرے یا تہذیب کے خدوخال کو سمجھنے اور اس سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے اس کے ادب کا ترجمہ کیا جائے۔ وہاں کے ادبی حلقے سے رابطہ رکھا جائے اور ادبی سرگرمیوں کا تبادلہ کیا جائے۔ جرمنی سے رابطہ رکھنے اور اس ملک سے تہذیبی اور ثقافتی رابطہ رکھنے سے دونوں ملکوں اور معاشرے کو فائدہ پہنچے گا۔ سائنسی، سیاسی، معاشرتی اور شعوری طور پر جرمنی نے بہت ترقی کی ہے۔ ہمیں اپنی ایسی ترقی کی منازل طے کرنے میں جرمنی سے مدد لینی چاہیئے اور اس کے لئے ادبی رابطہ اور ادبی رابطوں کے لئے تراجم ناگزیر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ادبی سرگرمیوں کا حلقہ بھی وسیع کرنا ہوگا۔ دوسری طرف جرمن معاشرہ جواز خود دوسرے معاشرے اور ان کے تہذیبی خدوخال سے آگاہی کا متمنی ہے اسے بھی اس کا فائدہ ہوگا۔ جرمن معاشرے میں ادب کا مقام ہمارے معاشرے سے قطعی مختلف ہے۔ ادب کا حلقہ بھی ہمارے رجحان کے برعکس نہایت وسیع ہے۔ اور اخبارات یا رسائل جو صرف کرنٹ افیئر سے متعلق ہوتے ہیں کو چھوڑ کر لکھی جانے والی ہر چیز ادب کے زمرے میں آجاتی ہے۔ ہمارے یہاں تو سری ادب کو بھی ادب تسلیم کرنے انکار کیا جاتا ہے مگر جرمنی میں سری ادب، ادب کا نہایت اہم ستون ہے۔

لکھاری جرمن معاشرے میں معاشی طور پر نہایت مستحکم ہوتا ہے۔ مصنف ہونا زندگی گذارنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ شوقیہ کوئی نہیں لکھتا۔

جرمنی میں اردو کے ادبی حلقے سے کراچی سے چھپ کر لندن سے شائع ہونے والے رسالے پرواز میں۔ دسمبر ۲۰۱۲ کے شمارے میں میں نے ان تمام ساتھیوں کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے جو کسی نہ کسی طرح جرمنی میں اردو پر کام کر رہے ہیں۔

اردو زبان کے دو اہم مسائل کی جانب احباب کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ پہلا مسئلہ تو صرف یورپ اور اردو کی دیگر نئی بستیوں کا ہے۔ اور اس میں بھی مجھے صرف یورپ کی حالات سے آگاہی ہے دیگر براعظموں میں اس

کی کیا حالت ہے اس سے دیگر دوست ہمیں آگاہ فرمائیں۔ یورپ میں مقیم اردو بولنے والے احباب کے بچوں کی اردو زبان سے آگاہی اسکی تعلیم، یہاں آباد تمام لوگوں کا مسئلہ ہے اور اس سے اردو کے مصنفین اور اردو کے خیر خواہ بھی آگاہ ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو زبان سیکھانے کا ہم سب کو شوق ہے۔ اِلا ماشااللہ کوئی اردو بولنے والا ہوگا جو اس بات کو ضروری نہ جانتا ہو۔ مگر اس کا عملی جامعہ پہنچانا بہت ہی مشکل کام ہے۔ چھوٹی عمر میں اگر بچوں کو مادری زبان سیکھانے کی طرف توجہ نہ دی جائے تو یہ اور بھی کٹھن ہے کہ بچے کبھی اردو زبان سے شد بدھ حاصل کر سکیں۔

جس طرح ہم بچوں کی اسکول کی تعلیم پر ہم توجہ دیتے ہیں اسی طرح ضروری ہے کہ بچوں کی اردو زبان کی تعلیم پر توجہ دی جائے۔ تمام والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کم عمری سے ہی اردو زبان سیکھائیں اور اس کے لئے بچوں سے اردو زبان میں ہی گفتگو کرنی چاہیئے۔ بچوں کو ان کی علاقائی زبان میں گفتگو سے بات کرنے سے ہماری اپنی تو علاقائی زبان کو سہارا ضرور مل جاتا ہے مگر اس سے بچوں پر ان کی اپنی زبان، ان کے والدین اور جدامجد کی زبان کے سیکھنے کا راستہ مسدود ہو جاتا۔

زبان اردو سیکھانا اگر آپ کے لئے مشکل ہے تو پھر دیکھئے کہ آپ کے قریب و جوار یا دور رہنے والے کون سے دوست احباب اس ذمہ داری کو بخوبی نبھانے کی اہلیت اور شوق رکھتے ہیں، پھر ان سے ان کی خدمات حاصل کریں۔ اس سلسلے میں ایسے دوست احباب کی حوصلہ افزائی تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ اپنے بچے یا بچوں کو باقاعدگی سے لانے لے جانے کا اہتمام کریں۔

ہمارے بہت سارے دوست اور خود ہمارے بچے اردو بول لیتے ہیں تو ہی ہم بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو بچے زبان بولنا تو جانتے ہی ہیں۔ لیکن یہ ٹھیک نہیں نہ ہی کسی زبان کی بقا کے لئے یہ کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ انٹرنیٹ اور فیس بک پر ایک ہجوم ہے ایسے اردو بولنے والوں کا جو لاطینی حروفِ تہجی میں اردو لکھتے ہیں اور اپنا مطمع نظر صرف ساٹھ سے ستر فیصد تک ہی واضح کر پاتے ہیں۔ لاطینی حروفِ تہجی کا سہارا لیکر اردو زبان میں لکھنا نہ صرف سنگین رجحان ہے بلکہ نہایت افسوناک بات ہے۔ اردو زبان ایک نہایت وسیع زبان ہے۔ اپنی تہذیبی و تمدنی ورثے اور ادب کے ذخائر کے سبب اس کا شمار بڑی زبانوں میں ہوتا ہے۔ اسے کسی

''بولی'' تک محدود نہ کیجئے۔ ترکی زبان کو اسی طرح اس کے ماخذ سے جدا کر دیا گیا تھا۔ کیا اب اردو کی باری ہے؟

حوالہ جات

۱۔ ایم اے ایچ ہو یو ہوم، محمد اقبال اینڈ جرمنی www.iqbal.com.pk، عالمی اقبال مجلس

۲۔ اشاعتِ روزنامہ گارڈین ۶ فروری ۲۰۰۳

https://www.theguardian.com/news/2003/feb/06/guardianobituaries.obituaries1

۳۔ بائیوگرافی کرسٹینا اوسٹر ہولڈ، ویب سائٹ ہائیڈلبرگ یونیورسٹی

https://www.moneyhouse.ch/de/list/person/oesterheld-christian

۴۔ اردو ہندی ڈکشنری برائے فعل، پروفیسر نسپٹل، پشتِ ٹائیٹل

https://www.geni.com/people/Prof-Dr-Helmut-Nespital/6000000002974436781

۵۔ عشرت معین سیما جر، منی میں اردو، رہبر پبلی کیشنز، جرمنی، ۲۰۱۸ء، ص ۲، ۸، ۱۰

۶۔ ویکی پیڈیا

https://en.wikipedia.org/wiki/Haider_Qureshi

۷۔ پاکبان انٹرنیشنل ڈاٹ کام www.pakbanint.com

۸۔ شفیق مراد، اردو لٹریری جرنل، جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء، سرورق

سید پور میں اردو ادب کی سرگرمیاں اور چند قلمکار

ڈاکٹر محمد سمیع الاسلام*

برصغیر میں اردو ادبی و ثقافتی سطح پر سید پور کا ایک قابلِ ذکر مقام ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ مقام پستی کا شکار ہے۔ سید پور میں بنگلہ زبان بولنے والوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان بولنے والے بھی موجود ہیں۔ جن کی تعداد تقریباً ۱۷ فیصد ہے۔ اِس سَرزمین کی فضا اردو کے حق میں ہمیشہ خوش گوار اور سازگار رہی ہے۔ اِس لئے اردو تہذیب و ثقافت کی جڑیں اِس کے ہر گوشے میں پیوست ہیں۔ اِس کی خاک سے اردو کے ایک سے بڑھ کر ایک ادیب، شاعر، دانشور اور فنکار ابھرے جنہوں نے ادبی دنیا میں اپنا نام روشن کیا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اور پاکستانی دورِ اقتدار میں پرائمری اسکولوں، ہائی اسکولوں، کالجوں اور مکاتیب کے علاوہ دینی درسگاہوں میں اردو تعلیم و تدریس کا مشغلہ تھا وہ اپنی یادگار آپ ہے۔ فی الحال تعلیم و تدریس کے وہ مشاغل ناپید ہو چکے ہیں۔ اردو لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ کی بجائے کمی آ رہی ہے۔ مادہ پرستی کے غلبہ اور دیگر مقامی رکاوٹیں اردو کی درس و تدریس کی راہ کا پتھر بنی ہوئی ہیں۔ ایک سچی بات یہ کہ یہاں کے مشہور ادیب و شاعر کی اولادیں بھی اردو سے نہ صرف ناآشنا ہیں بلکہ انہیں اِس سے کچھ رغبت بھی نہیں۔ ۱۹۷۱ سے پہلے سید پور میں اردو کو بنگلہ زبان کی طرح سرکاری حمایت حاصل تھی۔ بعدازاں اردو زبان کو یہاں کی پہچان سے متصادم سمجھا گیا۔ آزادی کے بعد اردو شعر و ادب کا چرچا اُسی مقام پر لوٹ آیا جہاں سے ۱۹۴۷ میں اس نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ یہ سماجی انتشار اور قدروں کی پامالی کا دور تھا۔ اردو بولنے والوں کی اپنی شناخت چھن گئی تھی اور زمین سے ان کا رشتہ سب سے بڑا سماجی اور سیاسی مسئلہ بن گیا تھا۔ گزشتہ چار پانچ دہائیوں میں سید پور میں نئے سرے سے نثری ادب کا کوئی نیا قابلِ قدر شخصیت کا جنم نہیں ہوا۔

---

* ایسوسیٹ پروفیسر، شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بلکہ جو پہلے سے موجود تھے وہ دھیرے دھیرے ترکِ وطن کر گئے یا دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ شعروشاعری کے میدان میں بھی یہی حال نظر آتا ہے۔ تاہم اس شعبے میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ ابھی بھی ادبی محفلوں کو روشن رکھنے کی حتی المقدور کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس مقالے میں سید پور کی ادبی سرگرمیوں کا ایک عمومی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

سید پور کی ادبی سرگرمیوں کا پس منظر:

آزاد خودمختار بنگلہ دیش کی اپنی ایک الگ زبان وثقافت ہے۔ مگر یہاں مختلف نسلیں بھی آباد ہیں۔ اور شروع ہی سے یہ ملک مخلوط ثقافتوں کی آماجگاہ تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف نسلوں اور گروہوں کے لوگ یہاں آتے رہے۔ ماقبل اسلام اور مابعد اسلام عرب کے تجّار، تجارت کی غرض سے اور پیرومشائخ تبلیغِ اسلام کے لئے یہاں داخل ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ سید پور میں کوئی سید صاحب آ بسے تھے ان ہی کے توسط سے اس شہر کا نام بھی سید پور ہو گیا۔1 یہاں اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ سید پور میں برطانوی حکومت نے 1870 میں ریلوے کارخانہ قائم کیا۔ جو آج بنگلہ دیش کا سب سے بڑا ریلوے کارخانہ کہلاتا ہے۔ برطانوی حکومت نے ریل کو چلانے کے لئے ہندوستانی ریل ملازمین کو یہاں لے آئی۔ اگرچہ وہ اپنے وطن اور اپنے بھائی بندوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر برطانوی سرکار نے ریلوے نظام کو متحرک رکھنے کے لئے انہیں بنگال آنے پر مجبور کیا۔ اس طرح ان کے اہل وعیال دو حصوں میں بٹ گئے۔ یہ قافلہ خواتین سمیت تقریباً سات ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ جنہوں نے ترکِ وطن کیا اور سرزمینِ بنگال کو آباد کیا۔ یہی لوگ خصوصاً ریلوے کے مختلف شعبوں سے منسلک رہے۔ اور بخیر وخوبی اپنے فرائض منصبی انجام دیتے رہے۔ پھر جب تقسیمِ ہند کے نتیجہ میں قتل وغارت گری اور دنگا فساد ہوا، اُس سے لوگ بہت دل برداشتہ ہوئے۔ اُس حالات نے ہندوستانی ریلوے ملازمین کو از سرِ نو ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔

مہاجروں کی تعلیم وتربیت کے لئے سرکار کی وساطت سے اردو اسکولوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ ان میں قائدِ

اعظم ہائی اسکول اور مسلم ہائی اسکول قابلِ ذکر ہیں۔ ان اسکولوں میں بیت بازی کا مقابلہ، بحث ومباحثہ کی مجالس، مشاعرہ اور مکالمہ کا اہتمام وغیرہ ادبی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ ہر اسکول اور کالج میں شعراء و ادباء کی کچھ نہ کچھ تعداد بہر حال موجود تھی۔ لائق اساتذہ کی رہنمائی میں طلباء میں شعری ذوق پیدا ہوا۔ مکالمہ اور مقالہ نویسی میں بھی دل چسپیاں پیدا ہوئیں۔ ان دونوں اسکولوں کے مدرسین شعراء میں جناب عزیز الرحمن، ذہین رضوی، واقف بلیاوی، ظفر کوکب، مولانا عبدالستار فائق قاسمی اور محمد یوسف سیفی کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔

مسلم ہائی اسکول سید پور سے دو میگزین بھی نکلے تھے۔ جن میں خصوصاً مسلم ہائی اسکول کے طلبا مع سابق طلباء کی تخلیقات شاملِ میگزین ہوا کرتی تھیں۔ دارالعلوم رُوح الاسلام (1926ء) سید پور کا قدیمی مدرسہ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد مدرسہ جامع عربیہ جس کے بانی مولانا متین ہاشمی تھے۔ یہ دونوں مدرسے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اصل میں مدرسے کا ذریعۂ تعلیم بھی اردو ہی تھا۔

سید پور کی ادبی فضا ہمیشہ سے خوش گوار رہی ہے۔ سن 1947 کے بعد جب تعلیم یافتہ طبقہ ہجرت کر کے سید پور میں آباد ہوا۔ تو یہاں کی ادبی فضا اور بھی رنگ لائی۔ سید پور میں چند مشہور ادبی ادارے تھے۔ شاہن کلب اور انجمنِ ترقی اردو کی ذیلی شاخ، خصوصاً یہ دونوں فعال اور متحرک ادبی ادارے تھے۔2 اس کے علاوہ فدا علی انسٹی ٹیوٹ اور مرتضیٰ انسٹی ٹیوٹ کی لائبریریوں میں ہزار ہا اردو کتابیں موجود تھیں۔ اور باذوق لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے۔ یہ ریل محکمہ کی لائبریریاں تھیں۔ اس کے علاوہ قاضی ہاٹ اور چند نگر میں بھی پبلک لائبریری قائم تھی۔ محلّہ قاضی ہاٹ کے لوگوں کا پیشہ کپڑا بننا تھا اور یہی ان کا ذریعۂ معاش بھی تھا۔ یہاں کے لوگ اپنے گھروں میں بھوج پوری زبان بولتے ہیں، جو اردو ہی کی غیر ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس کے باوجود ان کو اردو سے اتنی رغبت تھی کہ نہ صرف اپنے محلّہ میں لائبریری قائم کی بلکہ اکثر و بیشتر نعت خوانی، قوالی، مشاعرے اور ادبی محفلوں کا انعقاد کرتے تھے۔ اور خوبی کی بات یہ ہے کہ ادبی لوگوں کی مہمان نوازی کے ساتھ ساتھ انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔

سید پور کی ادبی خدمات میں ایک بڑی خدمات یہ بھی ہے کہ ایک بڑے پیمانے پر سید پور جناح میدان

(فی الحال ریلوے میدان) میں سن 1964 میں کل پاکستان اردو بنگلہ مشاعرہ اور ادبی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) اور مغربی پاکستان کے پائے کے شعراء وادباء نے شرکت کی۔ جوش ملیح آبادی، واقف عظیم آبادی، ماہر القادری، اقبال صفی پوری، ارم لکھنوی، جسیم الدین، جی ایم بدرالدین، قمر جلالوی، ریاض انوار، ظریف جبلپوری، حمایت علی شاعر، صہبا اختار، شاعر لکھنوی اور محسن بھوپالی وغیرہ اردو اور بنگلہ کی مشہور شخصیتیں شریکِ بزم ہوئیں۔

سید پور کے ادبی ادارے اور رسالے:

سن 1971 کے فسادات کے بعد مہاجروں کی جو بچی کھچی تعداد تھی سمٹ سمٹا کر سید پور میں اکٹھی ہوگئی۔ حالات جب کچھ سازگار ہوئے تو خستہ حالی کے باوجود کچھ ادبی شخصیتیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اور اس طرح کئی ادبی ادارے وجود میں آئے۔ جن میں منزلِ ادب، حلقۂ احباب، بزمِ ادب، اور مرکزِ تخلیقِ ادب سرگرمِ عمل رہے۔ منزلِ ادب کی جانب سے "صدائے زنداں"، "صدائے جرس"، "صدائے منزل"، "صدائے آگاہی" یہ چند جریدے منظرِ عام پر آئے۔ اور مرکزِ تخلیقِ ادب کی جانب سے بنام "انتخاب" پانچ شمارے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ منظرِ عام پر آئے۔ سید پور سے اس پایہ کے ادبی رسالہ نکالنا ذاکر عزیری کی بس کی بات تھی۔ اس رسالے کو جاری رکھنے کے لئے ذاکر عزیزی کے ساتھ احمد سعدی نے بھی انتھک کوششیں کیں۔ ان رسالوں کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

برسوں بعد سن 1997 میں ایک ادبی ادارہ "بزمِ اقبال" وجود میں آیا۔ بزمِ اقبال کی طرف سے "ارمغانِ طیبہ" (نعتوں کا مجموعہ)، کاروانِ ادب" (منقبتوں، مرثیوں اور نوحوں کا مجموعہ) اور ایک رسالہ "ترجمان" شائع ہوا۔ پھر 1998 میں شمس الحق فاونڈیشن کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس ادارے کی جانب سے بھی وقتاً فوقتاً مشاعرے اور ادبی نشستیں ہوتی رہتی ہیں۔ اس ادارے نے ادبی شخصیتوں کو اسناد سے بھی نوازا ہے۔ اس کے علاوہ اس ادارے کی فلاحی وسماجی خدمات بھی قابلِ قدر ہیں۔ شمس الحق فاونڈیشن کی طرف سے چند ادبی جریدے "پیغام" کے نام شائع ہوئے۔ اور فی الوقت "ہمارا ادب" وقفہ وقفہ سے نکلتا رہتا ہے۔

1971 کے سانحہ کے بعد یہاں سے متعدد شعراء و ادباء پاکستان ہجرت کر گئے اور جو رہ گئے انہیں بے شمار سماجی، معاشی اور ثقافتی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سن 1971 کے بعد اردو قلمی رسالوں اور وال میگزین کے ذریعے ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ سید پور سے عابد حسین نے "روشنی" کے نام سے قلمی پرچہ نکالا۔ سن 75 میں حصیر نوری نے حلقۂ فکر و دانش کی جانب سے قلمی رسالہ "تماشا" نکالا۔ اسی سال سید پور سے حافظ مقبول نظر نے "حلقۂ احباب" کے زیرِ اہتمام قلمی رسالہ "نئی روشنی" نکالا۔3 مشرقی بنگال کے اس چھوٹے سے شہر سے روزنامہ اخبار بھی شائع ہوتے تھے۔ سلمان عثمانی کی ادارت میں "میزان" ایک اخبار 1954 سے شائع ہوتا تھا۔4

سید پور سے شائع شدہ رسالوں، اخباروں اور مدیروں کے نام کچھ اس طرح ہیں:

صدائے زنداں (حبیب سحر، 1977)، صدائے بازگشت (معراج العارفی، 1978)، صدائے جرس (حبیب سحر، 1978)، صدائے آگہی (معراج العارفی، 1979)، منزل (نیک محمد عبرت، 1982)، انتخاب (ذاکر عزیزی، فروری 1984)، قلم کار (حاجی ایم اے صدیق، 1987)، ترجمان (نصیر الدین فہمی، 2009)، پیغام (اشرف الحق بابو، 2009)، ہمارا ادب (اشرف الحق بابو، --)

مہاجرین شعراء و ادباء جو ہندوستان سے سید پور آئے:

تقسیمِ ہند کے بعد بنگلہ دیش میں مہاجرین کی آمد شروع ہوئی۔ ان لوگوں کی آمد سے یہاں اردو کے شعری ادب کو بڑا فروغ ہوا۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے آنے والوں میں اردو کے افسانہ نگار، تنقید نگار، صحافی اور درس و تدریس سے وابستہ افراد بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد ڈھاکہ، چاٹگام، کھلنا اور سید پور میں آباد ہوئی، جس کے سبب یہاں کے نئے ادبی اور شعری ماحول میں اردو ادب اور اردو شاعری کو نئی جلا ملی۔ تارکینِ وطن میں شعراء کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں اساتذہ بھی تھے اور ان کے تلامذہ بھی۔ اساتذہ شعراء میں شاغل فریدی، ماہر فریدی، توحید عالم ہمدم، ریاض الدین حیدر ریاض، محمد جان کشفی، مبارک مونگیری، میکش بنارسی، شمیم کاشفی، حافظ مقبول نظر، جلیل عشرت، نیک محمد عبرت، عبداللہ ساغر، قاضی ذہیر احمد

بیخود، معراج العارفی وغیرہ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ایسے نوجوان شعراء بھی آئے جو کسی استاد کے شاگرد نہیں تھے لیکن جدید اور ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ ان شاعروں کی آمد سے مشرقی بنگال خاص کر کے سید پور میں اردو شاعری اپنے دوسرے دور میں جدید اور ترقی پسند نظریات سے مانوس ہوئی اور آہستہ آہستہ اس کا اپنا ایک الگ اور منفرد رنگ نمایاں ہونے لگا۔ ان شاعروں میں سے چند ایک کے شعری مجموعے بھی اسی دوسرے دور میں شائع ہوئے۔

قیامِ بنگلہ دیش کے قبل کے سید پور کے بزرگ اردو شعراء وادباء:

شاغلؔ فریدی (1880-1956):

پورا نام ابوالحسنات سید شاہ محمد عطاء الحق اور قلمی نام شاغلؔ فریدی تھا۔ آبائی وطن محلّہ چھوٹا تکیہ قصبہ بہار شریف (پٹنہ) تھا۔ وہیں ان کی پیدائش 22 / رجب 1296ھ کو ہوئی۔ تمام تر تعلیم و تربیت حکیم سید شاہ تفضل حسین کاملؔ بہاری سے حاصل کی اور اجازت و خلافت بھی انہیں سے ملی۔ شعر و سخن کا ذوق بچپن سے تھا۔ 14 سال کی عمر میں بہار شریف کے مشاعروں میں شریک ہو کر دادِ سخن حاصل کرنے لگے۔ ابتداء میں اپنی غزلیں حضرت کاملؔ کو دکھائیں۔ بعد میں شوقؔ نیموی اور مضطرؔ خیر آبادی سے مشورۂ سخن کیا۔ شاغلؔ فریدی ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب "آئینۂ جمال" المعروف بہ "بہارِ حسن" ہے جو طبع ہوئی۔ دوسری کتاب ایک معاشرتی ناول "جانکاہ" ہے جو اسی دور میں چھپی۔ تیسری کتاب بھی ایک ناول "بانکی ادا" تھی جو غیر مطبوعہ رہ گئی۔ شروع ہی سے آپ کا تعلق صحافت سے بھی رہا۔ سہ روزہ "تحفۂ ہند" (بجنور)، روزانہ "صادق الاخبار" (راجپوتانہ) ہفت روزہ "ریواڑی پنچ" اور ہفت روزہ "اپنچ" (پٹنہ) کے نامہ نگار رہے۔ "عالمگیر" (لاہور)، "ہمایوں" (لاہور) اور "ساقی" (دہلی) میں ان کے ادبی مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔

تقسیم کے بعد اپنے صاحبزادے ماہرؔ فریدی کے ساتھ جو ریلوے میں ملازم تھے، سید پور (بنگلہ دیش) آئے اور وہیں گوشہ نشینی کی زندگی گزار کر 1375ھ مطابق 12 / اکتوبر 1955ء میں انتقال کیا۔ اور نیا بابو پاڑہ

نٹ سٹلمنٹ متصل بڑی مسجد سید پور میں مدفن ہیں۔5 سید پور کے دورانِ قیام لوگوں کے اصرار پر چند مشاعروں میں شریک ہوئے۔ شاغلؔ مرحوم کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ بہار میں ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ ان کے کلام میں تصوف و اخلاق کا غلبہ تھا لیکن اس کے ساتھ زبان و بیان کا لطف و اثر بھی تھا، ان کا مرتبہ کردہ غیر مطبوعہ دیوان ماہرؔ فریدی کے پاس موجود تھا۔6

ماہرؔ فریدی (1901-1984):

سید مصطفیٰ حسن نام، ماہرؔ فریدی قلمی نام اور حسن اختر تاریخی نام ہے۔ 1901 میں اپنے نانہال خانقاہ بارگاہِ فیاضیہ، سملی شریف، پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بہار شریف تھا۔ وہ مشہور عالم، صوفی اور شاعر شاغلؔ فریدی کے فرزند تھے۔ تعلیم انہیں سے حاصل کی، 1914ء میں میٹرک کا امتحان دینے والے تھے لیکن تحریکِ ترکِ موالات کی حمایت میں امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ کچھ دنوں پٹنہ کے "صداقت آشرم" میں رہے جس کے منتظم علامہ مظہر الحق تھے۔ اسی زمانہ میں انہوں نے گاندھی جی کی تہنیت میں ایک پمفلٹ موسوم بہ "ہدایت" لکھی۔ وہ 1927ء تک کانگریس میں رہے۔ اس کے بعد ان کے خیالات میں تبدیلی آئی اور وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ 1928ء میں کلکتے کے ایک مڈل اسکول میں مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ 1929ء میں انہیں ریلوے میں ملازمت مل گئی اور وہ کھڑگپور چلے گئے۔ 1947ء میں ان کا تبادلہ سید پور میں ہو گیا۔ دسمبر 1967ء میں ملازمت سے ریٹائر ہو گئے۔

ماہرؔ فریدی ایک بلند پایہ غزل گو تھے۔ کلام میں فکری گہرائی بھی تھی اور زبان و بیان کی پختگی بھی۔ ان کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا تھا۔ اس پورے دور میں وہ شمالی بنگال کے مشاعروں پر چھائے رہے۔ اس خطے میں ان کے بہت سے شاگرد بھی تھے۔ ماہرؔ صاحب ایک اچھے نظم نگار بھی تھے۔ ان کی بعض نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔ مثلاً "پروانۂ پاکستان"، "نذرانۂ پاکستان" اور "ترانۂ پاکستان" وغیرہ۔ آزادی (1971) کے بعد وہ سید پور سے ڈھاکہ منتقل ہو گئے۔ میر پور میں قیام رہا۔ یہاں بھی شعر و شاعری کا شغل جاری رہا۔ اصلاحِ شعر کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔ یہاں انہوں نے کم و بیش دس سال گزارے۔ ماہرؔ فریدی مرحوم

بڑے مہذب، خوش اخلاق، ملنسار اور مجلسی انسان تھے لیکن وہ اپنے والد کی طرح صوفی نہ تھے۔ وہ چائے اور پان کے رسیا تھے۔ میر پور میں ان کا زیادہ تر وقت چائے خانوں میں یا کسی شاگرد کے گھر پر گپ شپ کر کے اور غزلوں پر اصلاح دیتے ہوئے گزرتا تھا۔ ماہرؔ صاحب 1982ء میں کراچی چلے گئے اور 4/اگست 1984ء کو ان کی وفات ہوئی۔ مرحوم لاولد تھے۔7

مبارکؔ مونگیری (1914-1988):

مبارک احمد نام اور مبارکؔ تخلص تھا۔ 1914ء میں مونگیر (بہار) میں پیدا ہوئے۔ مونگیر کالجیٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا اور ریلوے کی ملازمت اختیار کر لی۔ فنِ شعر گوئی میں انہیں مولوی وصی پنکھروی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ آٹھ نو سال تک ان سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ تقسیم کے بعد ہی ان کا تبادلہ (سابق) مشرقی پاکستان ہو گیا۔ ان کا قیام سید پور سے زیادہ تر چاٹگام میں رہا۔ مبارکؔ صاحب کی زندگی کا بہترین اور ہنگامہ خیز دور اسی سرزمین میں گزرا ہے اور ان کی شاعری کا بھی۔8 مبارک مونگیری خوش فکر اور استادِ فن شاعر تھے۔ مشرقی پاکستان کے نمایاں شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ نظم بھی کہتے تھے اور غزل بھی۔ وہ مشاعروں میں برابر شریک ہوتے رہے اور ان کا کلام بھی اخباروں میں اور رسالوں میں چھپتا رہا۔ آزادی کے چند سال کے بعد مبارک مونگیری کراچی چلے گئے۔ 1982ء میں ان کا مجموعۂ کلام "صحرا سے گلستاں تک" کراچی سے شائع ہوا۔ 6/اکتوبر 1988ء کو کراچی میں ان کی وفات ہوئی۔ وفات کے چھ سال بعد ان کا نعتیہ مجموعہ "ذکرِ اَرفع" 1994ء میں ان کے بیٹے اقبال مجیدی نے شائع کیا۔ اقبال مجیدی خود بھی ایک اچھے شاعر ہیں۔9

ریاض الدین حیدر ریاضؔ (-1913):

ملک ریاض الدین حیدر نام اور ریاضؔ تخلص تھا۔ 2/مئی 1913ء کو موضع سوگاؤں، ضلع گیا (بہار) میں پیدا ہوئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد ریلوے میں ملازمت کر لی۔ تقسیم کے بعد ان کا تبادلہ سید پور ہو گیا۔ وہ مشرقی

پاکستان ریلوے کے محکمہ اکاؤنٹس میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ ریاض صاحب نے اردو اور فارسی کی تعلیم اپنے دادا فائق گیادی سے حاصل کی۔ فائق مرحوم اپنے زمانے کے جید عالم اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ وہ شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، اور شفق عماد پوری کے ہم عصر و ہم نشین تھے۔ ریاض صاحب کو ادبی ذوق اگرچہ ورثے میں ملا تھا لیکن انہوں نے شعر و شاعری کا آغاز عمر کے آخری دور میں کیا جبکہ ان کی عمر پچاس سال کے قریب پہنچ چکی تھی۔10 انہوں نے صرف سات آٹھ سال کے عرصے میں دو مجموعے "بازگشت" (1968ء) اور "گلبانگ" (1969ء) شائع کر دیئے۔ ریاض صاحب نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ دونو مجموعوں میں فارسی غزلیں اور نظمیں بھی موجود ہیں۔11

ادیب سہیل: (1924-2017)

سید ظہور الحق نام اور ادیب سہیل قلمی نام ہے۔ ان کا آبائی وطن چواڑہ۔ ضلع مونگیر (بہار) ہے۔ وہیں 1924ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور ریلوے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم کے بعد ان کا تبادلہ سید پور (مشرق پاکستان) ہو گیا۔ وہ آخر وقت تک وہیں رہے۔ 1967ء میں جب صلاح الدین محمد کی سرکردگی میں پاکستان فیچر سنڈیکیٹ (Pakistan Feature Syndicate) قائم ہوا تو ادیب سہیل اس کے ایک رکن کی حیثیت سے ڈھاکا چلے آئے اور چند سال تک ان کا قیام ڈھاکے میں رہا۔

ادیب سہیل کا شمار مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے ممتاز ترقی پسند شاعروں میں ہوتا تھا۔ وہ آزاد اور پابند دونوں قسم کی نظمیں لکھتے تھے۔ غزل بھی کہتے تھے۔ ان کا کلام ہندو پاکستان کے رسالوں میں برابر شائع ہوتا رہتا تھا۔ انہوں نے سید پور کی ادبی و علمی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیا۔ ادیب سہیل ایک اچھے مضمون نگار بھی تھے۔ فنِ موسیقی اور ڈراما سے بھی انہیں دلچسپی تھی۔ فنِ موسیقی پر ان کے کئی اہم مضامین شائع ہوئے جو علمی حلقوں میں وقعت کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ادیب سہیل قیامِ بنگلہ دیش کے بعد کراچی چلے گئے۔ کچھ عرصہ ریلوے میں ملازمت کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ ایک عرصے تک "قومی زبان" کراچی

کے ایڈیٹر تھے۔ کراچی سے ان کا ایک شعری مجموعہ " بکھراؤ کا حرفِ آخر" شائع ہو چکا ہے۔12 نوے برس کی عمر میں 2017 کو کراچی میں وفات ہوئی۔13

محی الدین نواب:

محی الدین نواب کا آبائی وطن اور جائے پیدائش کھڑگپور (مغربی بنگال) تھا۔ 1947ء میں سید پور آ گئے۔ وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور کمرشل آرٹسٹ کا پیشہ اختیار کیا۔ محی الدین نواب نے 1956ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور بہت جلد افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ان کے افسانے مغربی اور مشرقی پاکستان کے مؤقر جریدوں میں شائع ہوتے رہے۔ اس دور میں ان کا ایک افسانہ " گڑیا رانی" بہت مشہور ہوا۔ محی الدین نواب 1969ء میں کراچی جا بسے۔ وہاں انہوں نے متعدد ناول لکھے اور افسانہ نگار کی حیثیت سے مزید شہرت حاصل کی۔ کچھ عرصے تک ڈائجسٹوں میں بھی لکھتے رہے۔ افسانوں کے دو مجموعے "ایمان کا سفر" اور " کچرا گھر" شائع ہو چکے ہیں۔14

قیامِ بنگلہ دیش کے بعد سید پور کی ادبی سرگرمیاں:

جس طرح مغلیہ حکومت کے خاتمے کے نتیجے میں دہلی اور لکھنؤ کی ادبی محفلیں اجڑ گئیں ٹھیک اسی طرح 1971 میں قیامِ بنگلہ دیش کے بعد ڈھاکہ، چاٹگام اور کھلنا کے ساتھ سید پور میں بھی اردو کی بساطِ شاعری الٹ کر رہ گئی۔ نامساعد حالات کے باوجود اردو کے کچھ گنے چنے ادیبوں اور شاعروں نے "ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے" کا عہد کرتے ہوئے اردو شعر و ادب کے چراغ کو روشن رکھنے کا بیڑا اٹھایا اور اس نئے ملک میں جہاں اردو زبان معتوب قرار دی جا چکی تھی وہاں اپنی ثقافتی بقا کے لئے اردو کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیا۔ سید پور میں ادبی سرگرمیاں مشاعروں سے شروع ہوئیں جو خیمہ، بستیوں اور گھر کی چہار دیواری کے اندر منعقد ہوتی تھیں۔ بنگلہ دیش کی آزادی کے پہلے دو سال میں کئی شاعروں نے وفات بھی پائی اور کئی شاعروں نے سید پور سے منتقل ہو کر دوسری جگہ پر جا بسے۔ ذیل میں ان شاعروں کا ذکر ہے جن کا

قیام سید پور میں ہوا۔ ان مین ایسے شاعر بھی شامل ہیں جن کے صرف اشعار ملے ہیں لیکن ان کے بارے میں پوری تفصیل نہیں مل سکی۔

محمد جان کشفی:

محمد جان کشفی سید پور کے استاد شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ علامہ آصف بنارسی کے شاگرد تھے۔ جون 1976ء کے بعد سید پور میں ان کا انتقال ہوا۔15 ان کے کلام کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جبینِ سجدہ میری خم ہے بندگی کے لئے　　اِدھر بھی ایک نظر بندہ پروری کے لئے
کمال سعی کا ممنون ہوگا اے کشفی　　جو مجھ سے کام کوئی ہوگیا کسی کے لئے

توحید عالم ہمدم

توحید عالم ہمدم، مولانا عبدالستار فائق قاسمی کے شاگرد تھے۔ سید پور میں قیام تھا۔ ان کا انتقال مارچ 1980ء میں ہوا۔16

لاسکے گا نہ کوئی اپنے تصور میں مجھے　　سرحدِ فکر و گماں سے میں نکل جاؤں گا
جس سے چمکے گا سدا درد کے ماروں کا جہاں　　اپنی رگ رگ کا وہی خون اُگل جاؤں گا

حافظ مقبول نظر:

پورا نام حافظ مقبول نظر، قلمی نام مقبول نظر۔ ان کے آبا و اجداد برطانوی دور میں قصبہ سید پور کے محلّہ اسلام باغ میں آباد ہوئے۔ غالباً انکے بزرگوار ضلع مونگیر (بہار) سے متعلق تھے۔ انکا خاندان سید پور کے قدیم خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔ انکے والد حافظ عبدالکریم، تاریخی عبادت گاہ چینی مسجد (1863ء) کے اول پیش امام تھے اور تاحیات انہوں نے اس مسجد میں امامت کی۔ حافظ مقبول نظر اسی محلّہ اسلام باغ میں پیدا

ہوئے۔ آپ سید پور بلدیہ (Municipal Committee) میں ملازمت کرتے تھے۔ بلدیہ سے ریٹائر کے بعد تقریباً نوے (90) کی دہائی میں پاکستان چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ آپ کا شمار استاد شاعروں میں ہوتا تھا۔ فکر میں بڑی وسعت تھی۔ نمونے کا کلام ملاحظہ ہوں۔

سبز پتّی سہ گئی بارِ قدم
خشک پتّی چُرمُرا کر رہ گئی

نعت، قصیدۂ رمضان، نظم، غزل وغیرہ آپکی تخلیقات میں شامل ہیں۔ انکی تخلیقات مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ غیر مطبوعہ تخلیقات سید پور کے نعت خواہاں اور قصیدہ خواں حضرات کے پاس اب بھی موجود ہیں۔ قصیدۂ رمضان کے چند اشعار۔

زمزمۂ نغمۂ ترانہ سر نجم ہونے لگا — گلشن و گل اور غنچوں پر سنم ہونے لگا
بندۂ مومن کی آنکھیں ہیں ابھی سے اشکبار — حسرتوں کا دل ہی دل ہی سر قلم ہونے لگا
تو جدا، ساغر جدا، شیشہ جدا، مینا جدا — میری محفل سے جدا ماہِ کرم ہونے لگا
ہائے کس بیچارگی سے آج کہتا ہے نظر — اے مہِ رمضاں پہ کیا ہم پر ستم ہونے لگا

حیدر صفی:

حیدر صفی مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کے مشہور افسانہ نگاروں میں سے تھے۔ وہ 10 جولائی 1937ء کو ہوڑہ (کلکتہ) میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن بکیا (یوپی) تھا۔ 1957ء میں سید پور آ گئے۔ 1958ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ تجارت کرتے تھے۔ فلمی صنعت سے بھی تعلق تھا۔ فلموں میں ہیرو کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ کئی فلمیں بھی بنائیں اور فلمی کہانیاں بھی لکھیں۔ حیدر صفی نے 1956ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ انہوں نے کافی تعداد میں افسانے لکھے جو مؤقر جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ 1970ء میں اپنا ناول "مادام" بڑے خوبصورت انداز میں شائع کیا، جس پر 1971ء کا آدم جی ادبی انعام بھی ملا۔

احمد سعدی:

احمد سعدی مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کے مشہور و معروف افسانہ نگار، مضمون نگار اور مترجم تھے۔ ان کی پیدائش بڑی بکیا (بہار) میں 1924 میں ہوئی۔ والد کے انتقال کے بعد وہ کولکاتا میں اپنے ماموں کے پاس چلے آئے۔ 1949ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ 1950ء میں مشرقی پاکستان آ گئے اور سید پور میں آباد ہوئے۔

احمد سعدی اس پورے دور میں مسلسل لکھتے رہے۔ انہوں نے افسانے اور مضامین بھی لکھے اور بنگلہ افسانوں اور ناولوں کے ترجمے بھی کئے۔ وہ ایک اچھے نظم نگار بھی تھے لیکن ان کی توجہ زیادہ تر افسانہ نگاری کی طرف مائل رہی۔ احمد سعدی وقتاً فوقتاً ادبی رسائل بھی نکالتے رہے۔ 1948ء میں کلکتہ سے ماہنامہ "ارمغان" نکالا۔ 1954-55ء میں سید پور سے "رباب" جاری کیا جس کے چھ شمارے نکلے۔ ہفت روزہ "میزان" سے بھی منسلک رہے۔ 1971ء میں پاربتی پور سے "عزمِ نو" نکالا جس کا صرف ایک شمارہ نکلا۔

ترجموں کے سلسلے میں احمد سعدی کا کام بہت وسیع ہے۔ انہوں نے علاء الدین الآزاد کے ناول "کرنافلی" کا ترجمہ کیا جو اسی دور میں شائع ہوا۔ بمل مترا کے ناول "کوڑیوں کے مول" (کوڑی دئے کینلام) کا ترجمہ "نقوش" لاہور میں قسط وار چھپا۔ علاء الدین الآزاد کے ایک ناولٹ "جاڑے کی آخری رات، بہار کا پہلا دن" بھی "نقوش" میں شائع ہوا۔ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد بھی ان کا قیام سید پور ہی میں رہا۔ اس دوران بھی وہ لکھتے رہے۔ ان کے اور س م ساجد کے افسانوں کا ایک مشترکہ مجموعہ "دودِ چراغِ محفل" کے نام سے ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "مٹی کی خوشبو" بھی ڈھاکے سے 1979ء میں شائع ہوا۔

احمد سعدی نے اردو میں بہت نظمیں کہیں ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے بنگلہ دیش کے اردو بولنے والوں کے درپیش سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے تناظر میں جو نظمیں کہیں ہیں وہ ان کی عوام دوستی کا پتہ دیتی ہیں۔ سعدی صرف ترقی پسند افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ترقی پسند ہونے کا اظہار ان کی نظموں کے ذریعے بھی ہوا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر بنگلہ دیش کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے تناظر میں جو نظمیں کہیں ہیں

وہ بنگلہ دیش میں اردو کے شعری ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ان کی چند نظموں کے درجِ ذیل اقتباسات حقیقت نگاری کے خوبصورت نمونے ہیں۔17

ہمیں کہ اجنبی بن کر دیار میں اپنے خراب و خستہ بہ حال تباہ رہتے ہیں
ہمیں کہ وقت کے خنجر کی زد پہ سینہ سپر ہمیں کہ سارے زمانے کا درد سہتے ہیں
حیات سوز فضاؤں میں ہنس کے جیتے ہیں ہمیں کہ زہر بھی بادہ سمجھ کے پیتے ہیں

آؤ پھر سعیِ رفو چاکِ گریباں کریں رہروِ شوق کے باقی ہیں ابھی نقشِ قدم
پھر سے آغازِ سفر کا کوئی سامان کریں آؤ آراستہ پھر آج کریں بزمِ طرب
پھر نیا گیت نئے ساز پہ گایا جائے گوشۂ دل کو جلا کر کریں روشن یہ شب
تادمِ صبح اسی طور گزارا جائے

احمد سعدی کا شعری مجموعہ "تیز ہوا کا موسم" غیر مطبوعہ ہے۔احمد سعدی کاروبار کرتے تھے۔ بااخلاق اور ملنسار آدمی تھے۔ اُن کا انتقال 19 نومبر 1999 کو سید پور میں ہوا۔

ذاکر عزیزی:

ذاکر عزیزی 14 نومبر 1934ء کو قصبہ بڑھیا، ضلع مونگیر (بہار) پیدا ہوئے۔ 1949ء میں مشرقی پاکستان آ گئے۔ سید پور میں قیام رہا۔ 1955ء میں سید پور سے میٹرک اور 1970ء میں ڈھاکا بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ان کا پہلا افسانہ "بچھڑے دوست" روزنامہ "پاسبان" میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کے افسانے اخباروں اور رسالوں میں برابر شائع ہوتے رہے۔ ان کے افسانوں میں "ڈوبتی آنکھیں"، "سکون کی تلاش" اور "دوسری چڑیا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ذاکر صاحب نظریاتی لحاظ سے ترقی پسند تھے۔ تادمِ حیات ان کا قیام بنگلہ دیش میں تھا۔ انہوں نے 80 کی دہائی میں ایک ادبی رسالہ "انتخاب" جاری کیا تھا، جو کچھ عرصے تک وقفے وقفے سے شائع ہوتا رہا۔ 11 مئی 2001ء میں وہ انتقال کر گئے۔

زین العابدین:

زین العابدین 1936ء میں الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن جمال پور (مونگیر) اور کلکتے میں گزرا۔ 1948ء میں سید پور آئے۔ ان کے والد ریلوے میں تھے۔ میٹرک سید پور سے، آئی کام ڈھاکا کالج سے، بی کام اور بی لیآنرز اور ایم اے (اردو) ڈھاکا یونیورسٹی سے پاس کیا۔ 1960ء سے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ 1964ء میں صحافت سے منسلک ہوگئے۔ "پاسبان" ڈھاکا، "سب رنگ" ڈھاکا، "میزان" ڈھاکا، "مارننگ نیوز" ڈھاکا اور "وطن" ڈھاکا میں کام کرتے رہے۔ وہ بنگلہ دیش ٹائمز سے بھی منسلک تھے۔ زین العابدین ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ ان کے افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ "نئی نوکری"، "سات بھائی چمپا"، "دھرتی کے گھاؤ" وغیرہ ان کے اہم افسانے ہیں۔ انہوں نے علامتی افسانے بھی لکھے۔ وہ ڈھاکے کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ ایک ناول بھی لکھا تھا جس کا مسودہ 1971ء کے ہنگامے میں ضائع ہوگیا۔ 9 مارچ 2017ء کو ڈھاکا میں ان کی وفات ہوئی۔[18]

میکشؔ بنارسی:

ان کا اصل نام احمد علی انصاری تھا۔ وہ 1937 میں مغل سرائے میں پیدا ہوئے۔[19] ان کے والد ریلوے کے ملازم تھے۔ 1947ء میں انہیں پاربتی پور میں منتقل کیا گیا۔ لیکن 1971ء کے ہنگاموں کے بعد میکشؔ کا خاندان سید پور آکر آباد ہوا۔ شمالی بنگال کے تقریباً تمام مشاعروں میں میکشؔ نے شرکت کی۔ ان کا انتقال یکم دسمبر 2009 کو سید پور میں ہوا۔[20] ان کی غزل سے دو شعر یہاں منقول ہیں۔

میں انتخاب کے قابل نہیں سہی لیکن — غلط کچھ آپ کا معیارِ انتخاب بھی ہے
وہ لامکاں ہیں تو اتنا غرور کیا معنی — کہ لامکاں تو یہ خانماں خراب بھی ہے

معؔراج العارفی:

ان کا اصل نام محمد قاسم اور قلمی نام معؔراج العارفی تھا۔ ان کے والد کا نام مرحوم تاج محمد تھا۔ معؔراج 1934ء

میں ہوڑہ (کولکاتا) میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ 1947 میں ہوڑہ سے ہجرت کر کے سید پور چلے آئے اور اسی شہر میں آباد ہو گئے۔ ان کی شاعری کا آغاز 1963 میں ہوا۔ 1971 کے بعد سید پور سے اردو کے بڑے بڑے شاعر پاکستان چلے گئے تو نوجوان اور نئے شاعروں کی رہنمائی کرنے والوں میں احمد سعدی کے ساتھ معراج العارفی بھی پیش پیش رہے۔ احمد سعدی کے انتقال کے بعد رہنمائی کا بوجھ تنہا ان کے کاندھوں پر آپڑا جسے انہوں نے اپنی آخری عمر تک اٹھائے رکھا۔ ان کا انتقال 12 ستمبر 2010 کو ہوا اور سید پور میں مدفون ہوئے۔ ان کے اشعار۔

مجھے خود آگہی نے ریزہ ریزہ کر دیا لیکن
بکھر کر میں نے یہ جانا خودی کیا ہے خدا کیا ہے

میں اس مقام سے گزرا ہوں مسکراتے ہوئے
حیات و موت میں جب کوئی فاصلہ ہی نہ تھا

وہاں سے لوٹ کے آیا ہوں ثابت و سالم
جہاں سے لوٹ کے آنے کا راستہ ہی نہ تھا

مجیب طرب:

ان کا اصل نام محمد مجیب الدین تھا۔ قلمی نام مجیب طرب اور ضرب الہ آبادی تھا۔ وہ 1928ء میں الہ آباد کے ایک گاؤں پنڈرا سہابن پور میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام غریب الدین تھا۔ کانپور میں ریلوے کی ملازمت اختیار کی۔ ترکِ وطن کے بعد سید پور آئے جہاں 1983ء میں ریلوے کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شعر و شاعری کے علاوہ موسیقی اور ڈرامہ نویسی سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، خانقاہوں اور مزاروں پر بھی حاضری ہوتی تھی۔ انہوں نے مبارک مونگیری اور ماہر فریدی سے مشورۂ سخن کیا۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اسّی کی دہائی میں انتقال کیا۔ ان کے منقبت کے اشعار ہیں۔

اب دل کو خیانت کی ضرورت نہ پڑیگی　　غم ہے تو مسرت کی ضرورت نہ پڑیگی
اے دل غمِ شبیر میں جی کھول کے رولے　　مرنے پہ طہارت کی ضرورت نہ پڑیگی

رقیبؔ اکبر کاظمی:

رقیبؔ اکبر کاظمی کے والد کا نام محمد ظہور قطبی تھا۔ رقیبؔ اکبر کاظمی ۳ جولائی 1947ء میں اتر پردیس کے ضلع بلیا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین ہندوستان سے ہجرت کر کے سید پور میں آباد ہوئے۔ انہوں نے 1966 میں غزل گوئی کا آغاز کیا۔ احمد سعدیؔ اور ادیب سہیل سے اصلاح لی۔ وہ سید پور میں اردو کے سینئر شاعر مانے جاتے تھے۔ چند برس پہلے ان کا انتقال ہو گیا۔ وہ ریلوے میں اعلیٰ افسر تھے۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور بنگلہ پانچ زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ وہ راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سبکدوش پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد لکھنوی کے قریبی دوستوں میں سے تھے۔ ان کی نعت کے دو شعر ہیں۔

جنہیں میسر تیری محبت، حیات ان کی سرور پیہم
جو اس عنایت سے ماوریٰ ہے، وہ لمحہ لمحہ عذاب میں ہے

رقیبؔ اکبر ہے نام میرا، درود پڑھنا ہے کام میرا
لحد میں بھی ہو یہی وظیفہ، یہ عرض عالی جناب میں ہے

سید پور میں باحیات شعراء و ادباء:

نصیر الدین فہمیؔ:

سید نصیر الدین نام اور فہمیؔ تخلص ہے۔ ان کے والد فدا حسین شرفی کا تعلق حویلی کھڑگپور، مونگیر، بہار سے ہے۔ وہ 1947 میں ہجرت کر کے سید پور آئے تھے، جہاں فہمیؔ صاحب پیدا ہوئے۔ انہوں نے کچھ دنوں تک کھلنا میں بھی قیام کیا لیکن اب مستقل طور پر سید پور میں مقیم ہیں۔ فہمیؔ نے 1961 میں مضمون نویسی شروع کی۔ وہ 1968 سے باقاعدہ شاعری کر رہے ہیں۔ وہ پہلے مجیب طربؔ کے شاگرد تھے بعد میں محمد

ابراہیم ناشؔاد سے اصلاح لینے لگے۔ان کی غزل کے اشعار ہیں۔

ملتا ہے ایسا عدل کتابوں کی بھیڑ میں
گیدڑ پناہ گیر تھے شیروں کی بھیڑ میں

خیرات مانگتی ہوئی پہونچی ہے گور تک
دیکھا ہے زندگی کو جنازوں کی بھیڑ میں

جس وقت ٹوٹ جائے گا دروازۂ قفس
چھپ جائنگے درخت پرندوں کی بھیڑ میں

آواز دے کے تھک گئیں ویران منزلیں
گم کاروانِ شوق تھا، رستوں کی بھیڑ میں

طالبؔ کبیر:

ان کا پورا نام قمرالزمان طالبؔ کبیر ہے۔21 جنوری 1950ء کو سید پور میں پیدا ہوئے۔انہوں نے پہلی غزل 1970 میں کہی تھی۔شروع میں شمیم کاشفیؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ان کے پاکستان چلے جانے کے بعد حافظ مقبول نظرؔ سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ وہ ڈھاکا کے جنیوا کیمپ میں مقیم تھے اور طویل علالت کے بعد 24 مارچ 2020 کو ان کا انتقال ہو گیا۔اور انہیں عظیم پور قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ان کا نعتیہ کلام ملاحظہ ہوں۔

جدائی نبی کی یوں تڑپا رہی ہے
میرے دل میں ہلچل مچی جا رہی ہے

وہ ہے سبز گنبد کا دلکش نظارہ
کہ جنت بھی واللہ شرما رہی ہے

حسنین رازؔ:

تاریخی نام یوسف حسین اور ادبی نام حسنین رازؔ ہے۔آپکے والد غلام رسول مرحوم برطانوی دورِ حکومت میں مشرقی بنگال کے قصبہ سید پور میں مقیم تھے۔آپکے والد ریلوے ملازم تھے انکا تعلق پٹنہ (بہار) سے تھا۔ حسنین رازؔ یہاں 1954ء میں پیدا ہوئے۔سید پور مسلم ہائی اسکول سے 1969ء میں میٹرک پاس کیا اور قائدِ اعظم کالج (سید پور سرکاری کالج) سے انٹر میڈیٹ پاس کیا۔پھر درس و تدریس انکا پیشہ بن گیا اور تادمِ تحریر وہ اس پیشہ سے منسلک ہیں۔پہلی غزل غالباً 1973ء میں "گلدستہ" (چاٹگام) میں شائع

ہوئی۔ 1974ء سے باضابطہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ انکی تخلیقات نے مختلف رسالوں کو زینت بخشی۔ انہیں ایک پختہ گو شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ انکی تخلیقات میں حمد، نعت، قصیدہ، منقبت، قطعات، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ نمونے کے چند اشعار

اس کے ہنستے رخسارے پر چھوٹی سی اک پیالی ہے
کہتے ہیں کہ ایسی صورت من کو موہنے والی ہے

اسی کو دوست سمجھو تم اسی کو مہرباں جانو — جو نکتہ چیں تمہارے ہیں انہی کو قدرداں جانو
یہ خموشی پیش خیمہ ہے کسی طوفان کا — چل رہا ہے یہ پتہ حلات کے آثار سے
دِیا محبتوں کا تم لے لو اپنے ہات میں — کہ کام آئیگا یہی کل اندھیری رات میں

س م ساجد:

س م ساجد کا تعلق سید پور سے ہے جہاں ان کے والد مرحوم سید عبدالمقتدر 1947ء کے بعد ہندوستان سے آکر قیام پذیر ہوئے تھے۔ وہ ریلوے میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے۔ س م ساجد کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی۔ جو کسی وقت اردو ادب خاص طور پر افسانوی ادب کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ساجد پہلے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے تھے، لیکن جلد ہی انہوں نے اپنے اندر چھپے ہوئے افسانہ نگاری کو دریافت کر لیا۔ 21 1971ء کے بعد انہوں نے بنگلہ دیش میں رہ جانے والے اردو بولنے والوں کی حالت زار کو اپنا موضوع بنایا اور ان کی سماجی، ثقافتی اور معاشی زبوں حالی کے تناظر میں افسانے لکھنے شروع کئے۔ ان کے افسانوں میں "معمولی سی بات"، "بوڑھی آنکھیں"، "صلیب کے سائے"، "کہانی کا قتل" اور "کتے" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ س م ساجد نے 1980ء میں شاہکار پبلی کیشنز کے نام سے اپنا ایک ادارہ قائم کیا اور اسی ادارے کے تحت ایک ادبی رسالہ "شاہکار" بھی شائع کیا۔ 1984 میں ساجد نے شاہکار پبلیکشنز کے تحت اپنا اور احمد سعدی کے افسانوں کا ایک مشترکہ مجموعہ "دودِ چراغِ محفل" کے نام سے شائع کیا تھا۔ وہ اپنی بیشتر

مصروفیت کی وجہ سے ایک طویل عرصے تک تخلیقی سرگرمیوں سے دور رہے۔ حال ہی میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "ایک سوال آنگن آنگن" 2017ء میں شائع ہوا۔ فی الحال وہ ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔

ایم نعیم:

محمد نعیم الدین خان نام اور ادبی نام ایم نعیم ہے۔ آپ کے والدین تقسیمِ ہند کے بعد ضلع مونگیر (بہار) سے 1947ء میں سید پور آئے۔ 1953ء میں ایم نعیم کی پیدائش سید پور میں ہوئی۔ مسلم ہائی اسکول سید پور سے میٹرک پاس کیا پھر آپ سید پور کو خیر باد کہہ کر ڈھاکہ میں آباد ہوئے اور تادمِ تحریر ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ خوش قسمتی سے ڈھاکہ میں آپ کو ادبی ماحول میسر آ گیا اور اس طرح آپ کے اندر لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ 1975ء میں آپکے افسانوی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کے افسانے بنگلہ دیش کے مختلف جریدوں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان، پاکستان اور چین سے بھی آپ کے افسانے شائع ہوئے۔ اپ کے افسانوں میں "نالی کا کیڑا"، "پس پردہ"، "ایک اجنبی سے ملاقات"، "بوھنی"، "رشتے کا پاس" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کے متعدد افسانوں کا ترجمہ بنگلہ زبان میں بھی ہوا جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کا شمار پایہ کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ تو افسانے قلم بند کیا کرتے تھے مگر اب آپ کا قلم ہی بند ہو گیا۔

ریاض رفیق:

ریاض رفیق کے خاندان کا تعلق بھوپال سے ہے۔ ان کے والد 1947ء میں ترکِ وطن کے بعد پاربتی پور میں قیام پذیر ہوئے تھے جہاں 1957ء میں وہ پیدا ہوئے۔ وہ 1980 سے غزلیں کہہ رہے ہیں۔ شاعری میں وہ محمد امین نادم کے شاگرد ہیں۔ ان دنوں ان کا قیام سید پور میں ہے۔ دو شعر۔

فاقہ کشی میں آبرو اِک ماں نے بیچ دی گزری ہے کیسے رات کوئی پوچھتا نہیں
رہبر بھی ہے رہزن بھی ہے منصف بھی وہی ہے اس سے تو سوالات کوئی پوچھتا نہیں

اشرف الحق بابو ساگر:

اشرف الحق کے والد مرحوم بشیر الحق چھپرا (بہار) سے 1947 میں پاربتی پور آئے تھے۔ اشرف الحق شمالی بنگال کے اسی شہر میں 1960ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی ابتداء 1998 میں ہوئی۔ اشرف الحق بابو کی ادارت میں فی الحال "ہمارا ادب" ایک جریدہ سید پور سے نکل رہا ہے۔ جو خلوص و محبت کا ایک پیکر ہیں۔ اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ سید پور میں مقیم ہیں۔ ان کے کلام میں قوم کا درد صاف محسوس ہوتا ہے۔ نمونۂ کلام۔

رات کتنی سہانی ہے فٹ پاتھ پر — چاند کی حکمرانی ہے فٹ پاتھ پر
آج کی رات مزدور سوئیں کہاں — آج بارش کا پانی ہے فٹ پاتھ پر
گھر لٹا، زر لٹا، لُٹ گیا کارواں — ظلم کی ہر نشانی ہے فٹ پاتھ پر
آنسوؤں سے مہاجر کی لکھی ہوئی — ہجرتوں کی کہانی ہے فٹ پاتھ پر

شوکت نور:

شوکت نور سید پور میں 1961 میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرحوم امداد الدین 1947 میں الٰہ آباد سے یہاں آئے تھے۔ شاعری کا آغاز 1980 میں کیا۔ پہلے اسلم راہی اور بعد میں جلیل عشرت کے شاگرد ہوئے۔ سید پور میں مستقل قیام ہے۔

جو بیٹھے ہیں ابھی بزمِ ادب میں اجنبی بن کر — میں ان کے سر ادب کی پاسبانی چھوڑ جاؤں گا

سلام حمید:

قلمی نام سلام حمید اور اصل نام محمد عبد السلام ہے۔ ان کے والد مرحوم عبد الحمید تقسیم کے بعد سید پور آئے تھے۔ عبد السلام اِسی شہر میں 1969 میں پیدا ہوئے۔ ان کی شاعری کی ابتداء بیس کی عمر میں ہوئی۔ انکے استاد

مرحوم ابراہم حسن رضوی تھے۔ انہیں بنگلہ زبان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ بنگلہ تخلیقات کا اردو میں ترجمہ بھی کرتے ہیں۔ مستقل قیام سید پور میں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جانے کیوں اس کی جدائی میں تڑپ اٹھا میں — جانے والے سے تو میرا کوئی رشتہ بھی نہ تھا
لوگ کہتے ہیں جو بوؤ گے وہی کاٹو گے تم — میں نے کاٹا ہے وہی جو کبھی بویا بھی نہ تھا

سید ماجد اقبال:

شاعری میں ماجد تخلص ہے۔ اقبال کے والد مرحوم سید علاء الدین پٹنہ سے 1948 میں سید پور آئے تھے۔ ماجد اقبال اسی شہر میں 1971 میں پیدا ہوئے۔ 1994 سے شاعری کر رہے ہیں۔ ان کے استاد نصیر الدین نہمی ہیں۔ ماجد کے اشعار۔

دنیا نے سکھایا ہے بہت کچھ مجھے لیکن — معلوم نہیں، عشق کے آداب بتا دے
ماجد تری باتوں میں چمکتی ہے صداقت — ممکن ہے کہ انگلی کوئی تجھ پر بھی اٹھا دے

اکبر حسین عامی:

عامی کے والد ذوالفقار علی بکیا (اتر پردیس) سے ہجرت کر کے 1947 میں سید پور آئے تھے۔ یہیں اکبر حسین عامی 1976 میں پیدا ہوئے۔ شاعری انہوں نے 1995 میں شروع کی۔ ان کے استاد معراج العارفی تھے۔

کیا پتہ ساتھ چھوڑ دے کب یہ — زندگی جیسی بیوفا ہے کوئی
ہم بھی اے کاش اس طرح جیتے — جب مریں تو لگے مرا ہے کوئی

میں نے اپنے مضمون میں جن بزرگ شعراء و ادباء کا ذکر کیا ہے ان میں سے بیشتر کے کلام اور تحریریں ان نایاب ہیں۔ کوششوں کے بعد کچھ نمونے پرانے رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ دستیاب ہوئے ہیں۔ اور

کچھ افراد کی بیاض بھی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہوں۔ اگر چہ مذکورہ افراد کی کچھ تحریریں مل بھی گئی لیکن ان کی ذاتی زندگی کی معلومات حاصل کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ موجودہ شاعروں اور ادیبوں کی تحریریں بھی حاصل کرنا آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ زیادہ تر اپنی تحریریں محفوظ نہ کر سکے۔ موجودہ حالات اردو زبان و ادب کے لئے سازگار نہ ہونے کی وجہ ہی اس کی بڑی وجہ ہے۔ مواد کی کم یابی کی وجہ سے سبھوں کو ہر کا فرداً فرداً ذکر کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ مذکورہ بالا شعراء و ادباء کے علاوہ اور بھی شعراء و ادباء کے نام ہیں جو سید پور سے تعلق رکھتے تھے اور رکھتے بھی ہیں ان میں سے مولانا عبدالستار فائق قاسمی، جلیل عشرت، نیک محمد عبرت، فرید شہزاد، عبداللہ ساغر، حبیب سحر، یوسف سیفی، ارسد انور، معین الدین ماسٹر، ابرھیم حسین رضوی، سمیم آختر، عزیز صدف، نجیب اشرف، امین نادم، مختار سعیدی، اسلم پرویز بادل، ارمان علی اشرفی، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

حوالہ جات:

1. واحد سرکار، نیل فماریر ایتی ہاس، (ڈھاکہ: امداد الحق چودھوری، اشاعتِ اول 2019ء)، صفحہ 75
2. احمد الیاس، بنگلہ دیش میں اردو، (ڈھاکہ: بنگلہ-اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، اشاعتِ اول 2014ء)، صفحہ 177
3. ایضاً، صفحہ 130
4. ایضاً، صفحہ 152
5. محاذ (ادبی رسالہ)، مدیران-ایوب جوہر اور عرفان نقش، (ڈھاکہ: محاذ پبلی کیشن، شمارہ جولائی 1981ء)، صفحہ 81
6. پروفیسر ہارون الرشید، محفل جو اجڑ گئی، (کراچی: زین پبلی کیشنز، اشاعتِ اول 2002ء)، صفحہ 35-34

7. ایضاً، ، صفحہ 47-48

8. مبارک مونگیری، صحرا سے گلستاں تک، افسر ماہ پوری کا پیش لفظ دیکھئے، (کراچی: ناصر مبارک، 1984ء)، صفحہ 18

9. پروفیسر ہارون الرشید، ایضاً، صفحہ 59

10. ایضاً، صفحہ 77-78

11. ریاض الدین حیدر ریاض کی کتاب "بازگشت" اور "گلبانگ" کا فہرست ملاحظہ فرمائیں

12 .ایضاً، صفحہ 125

13. https://dailypakistan.com.pk/09-Mar-2017/539603

14. پروفیسر ہارون الرشید، ایضاً، صفحہ 252-53

15. احمد الیاس، ایضاً، صفحہ 49

16. ایضاً، صفحہ 53

17. ایضاً، صفحہ 66-67

18.

//www.thedailystar.net/country/language-vetern-zainul-abedin-laid-rest-1373866

19. میکش بنارسی کے اسکول کے سند کے مطابق

20. احمد الیاس، ایضاً، صفحہ 78

21. س م ساجد، ایک سوال آنگن آنگن، (ڈھاکہ: بنگلہ-اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، 2017ء)، صفحہ 10

اردو زبان وادب کے فروغ میں بالی وڈ کا کردار

(فلمی نغمہ نگاروں کے خصوصی حوالے سے)

پروفیسر شمیم بانو*

[اردو اپنی پیدائش، ارتقاء، تدریجی مراحل اور فروغ میں کئی منازل سے گذری۔ یہ زبان دیکھنے سننے میں جتنی نازک اندام ہے لیکن مختلف نامناسب حالات میں اتنی ہی سخت جان بھی ہے۔ گذشتہ دو صدیوں سے بمبئی/ممبئی کی فلم انڈسٹری بہ اصلاح بالی وڈ میں بڑی ہی خوبصورتی سے اس نے اپنے نغموں کے سحر میں ساری دنیا کو مسحور کر رکھا ہے۔ ۱۹۳۱ میں ریلیز پہلی ہندوستانی بولتی فلم عالم آرا سے ۲۰۲۰ء تک اردو فلمی نغمے بالی وڈ کی روح رواں ہیں۔ آج بھی بالی وڈ کے شب و روز گلزار کی گل افشانی اور جاوید اختر کی اختر شماری کے بغیر بے معطر اور بے روشن ہیں۔ مضمون میں اردو شاعر اور فلمی نغمہ نگار جاوید اختر ان کی ادبی اور فلمی تخلیقات، ان کے حوالے سے ان کے شجرہ نسبی، جان نثار اختر، صفیہ اختر، مجاز لکھنوی اور کیفی اعظمی جیسے اردو شعراء اور مصنفوں کی علمی، ادبی اور فلمی کارناموں پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازایں شکیل بدایونی، ساحر لدھیانوی اور گلزار جیسے ممتاز اردو شعرا اور نغمے نگاروں کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ اردو کی ترقی میں بالی وڈ کا کردار اور بالی وڈ کی فضا میں اردو کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کلیدی الفاظ: اردو شاعری۔ بالی وڈ۔ فلمی نغمے۔ جاوید اختر۔ جان نثار اختر، مجاز لکھنوی۔ کیفی اعظمی]

اردو دور حاضر کی زندہ ترین زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اردو دنیا کے تقریباً ہر گوشے میں بیش و کم بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ یہ شاید دنیا کی واحد زبان ہے جسے قطعی طور پر کسی

---

* مارڈن لینگوئز انسٹیٹیوٹ، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

خاص علاقے یا سرزمین سے وابستہ نہیں کیا جاتا۔ اردو سے متعلق سینکڑوں کتابیں جیسے پنجاب میں اردو، دکن میں اردو (نصیر الدین ہاشمی، ۱۹۶۰)، سندھ میں اردو، بنگال میں اردو (وفا راشدی، ۱۹۵۵)، مشرقی بنگال میں اردو (اقبال عظیم، ۱۹۵۴) تصنیف کی گئی ہیں۔ دہلی اردو دبستان لکھنوی اردو دبستان وغیرہ عنوانات بھی اردو سے وابستہ ہیں۔ ان کتابوں میں مختلف جغرافیائی علاقوں کے ساتھ اردو کے لسانی تعلقات، اردو کی پیدائش ارتقا اور فروغ پر روشنی ڈالی گئی ہیں۔ عنوانات جتنے متنوع ہیں اتنے ہی مدلل اور وقیع ہیں۔ یہ امر اردو کے لئے طرہ امتیاز تو ہے لیکن دوسری جانب اس کی لامکانی کی بھی کہانی سناتے ہیں۔ بے شک اردو آج پاکستان کی دفتری زبان ہے۔ لسانیات کے ماہرین کے نزدیک زبان ایک جیتی جاگتی، ہنستی بولتی ہوتی ہے۔ بولتی بند ہو تو زبان بھی دم توڑ دیتی ہے۔ گذشتہ دو صدیوں سے اردو جس ماحول میں بے حد رواں دواں نظر آتی ہے وہ ہے بمبئی، جسے اب ممبئی کہا جاتا ہے، کی فلم انڈسٹری ہے اور جسے آج کی اصطلاح میں بالی وڈ کہا جاتا ہے۔

بالی ووڈ میں اردو شاعری کا آغاز ہندوستانی فلمی صنعت بمبئی ٹاکیز کے ساتھ بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوگئی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں ریلیز پہلی ہندوستانی بولتی فلم ''عالم آرا'' کی زبان فارسی مخلوط اردو تھی۔ بعد ازاں اردو شاعری اور اردو زبان ہندوستان فلمی صنعت کا جزو بن گئی۔ ہندوستانی سنیما کے اوائل کے دو مشہور موسیقی کار کیدار شرما اور دینا ناتھ مدھوک نے اردو شاعری اور سنیما کے درمیان جو پل تعمیر کیا تھا وہ آج بھی بر قرار ہے۔ ہندوستانی فلموں کی بنیاد پارسی تھیٹر قدیم ڈراموں اور ناٹکوں پر رکھی گئی تھی۔ یہ ڈرامے بیشتر منظوم ہوا کرتے تھے۔ اسی روایت کے تحت فلموں میں بھی نغموں کو اہم مقام حاصل ہوا۔

دئے دئے خدا کے نام
اگر ہمت ہے دینے کی

ہندستانی فلمی صنعت کا پہلا فلمی نغمہ ہے (نشاط حسن ۲۰۱۷ء، ص ۶۱) ہندوستانی فلمی نغمہ نگاروں میں شکیل بدایونی کو شاعر اعظم کہا جاتا ہے۔ ان کو فلمی نغمہ نگاری کا مرکزی نقطہ قرار دیتے ہوئے فلمی نغمہ نگاری کو تین دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (نشاط حسن، ادبی دنیا، ۲۰۱۷ء، ص ۶۱)

اردو زبان وادب کے فروغ میں بالی وڈ کا کردار (فلمی نغمہ نگاروں کے خصوصی حوالے سے)

شکیل بدایونی سے قبل فلمی نغمہ نگاروں میں آرزو لکھنوی، قمر جلال آبادی، جوش ملیح آبادی، حیات امروہی نے اس قافلے کی رہنمائی کی۔ شکیل بدایونی کے ہمعصر نغمہ نگاروں میں کیفی اعظمی، جان نثار اختر، جے کشن مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی مقبول عام رہے۔ شکیل بدایونی کو ۱۹۶۱ء میں فلم ''گھرانا'' کا نغمہ 'حسن والے تیرا جواب نہیں'' اور ۱۹۶۳ء میں فلم ''بیس سال بعد'' کا نغمہ 'کہیں دیپ جلے کہیں دل' کے لیے فلم فیر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مجروح سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی نے خالص ادبی لفظوں کا استعمال فلمی نغموں میں شروع کیا۔ (نشاط حسن، ادبی دنیا، دسمبر ۲۰۱۷، ص ۶۳)

ساحر لدھیانوی ادبی اور تخلیقی شاعری کی جانب رجحان رکھتے تھے۔ فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کے بعد فلمی نغموں کو ہی انہوں نے اپنی تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔

چلو ایک بار پھر سے
اجنبی بن جائیں ہم دونوں
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
(فلم: گمراہ)

کہا جاتا ہے کہ فلم ''پیاسا'' اور ''کبھی کبھی'' میں ان کی ذاتی زندگی کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ ان فلموں کے نغمے ان کی ذاتی ڈائیری سے اخذ کیے گئے ہیں۔ جو بے حد مقبول رہے۔ بعد ازآں راجہ مہدی علی خان، اسد بھوپالی۔ حسرت جے پوری، گلزار، جاوید اختر اس قافلے میں شامل ہوئے۔ آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے (فلم ان پڑھ) تو جہاں جہاں چلے گا میرا سایہ ساتھ ہوگا (فلم میرا سایہ) راجہ مہدی علی خان کے مقبول نغموں کے مکھڑے ہیں۔ 'جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے' (فلم: برسات، ۱۹۴۹)، 'آ جا صنم مدھر چاندنی میں ہم' (فلم: چوری چوری)، 'احسان تیرا ہوگا مجھ پر' (فلم: جنگلی)، دنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی' (فلم: تیسری قسم)، 'بہاروں پھول برساؤ' (فلم: سورج) 'جانے کہاں گئے وہ دن' (فلم:

میرا نام جوکر) 'زندگی ایک سفر ہے سہانا' (فلم: انداز) حسرت جے پوری کے سدا بہار گیت ہیں۔
۱۹۴۰ء سے ۱۹۷۰ء کو ہندوستانی فلمی صنعت کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔ اس دور تک اردو شاعری فلمی صنعت کا لازمی جزو بن چکی تھی۔ اس وقت کے تمام نامور نغمہ نگار اردو شاعری کے تربیت یافتہ اردو غزل، نظم اور قوالی کے ماہرین تھے۔ ان سب کا کیریر اردو شاعری کا مرہون منت رہا۔ شکیل بدایونی، جان نثار اختر، حسرت جے پوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی کے نغمے عوام وخواص کے زیر لب فضاؤں میں رس گھولتے رہے:
۱۹۸۰ء میں دہائی میں بالی وڈ میں اردو شاعری کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ کیفی اعظمی، مجروح سلطانپوری، آنند بخشی گلزار اردو نغمے بکھیرتے رہے۔ ہندوستانی فلمی موسیقی دنیا میں کچھ گلوکار ایسے بھی ہیں جو محض اردو شاعری کی لیے پر ہی راگ الاپتے ہیں۔ جگجیت سنگھ، سلمی آغا کی آوازیں اردو غزل کے لئے مخصوص رہیں۔

دل کے ارمان آنسوؤں میں بہہ گے
ہم جہاں میں تنہا رہ گئے۔
(فلم: نکاح، گلوکارہ: سلمٰی آغا)

موسیقی کی طرح اردو زبان کی بھی یہ خصوصیت ہے کہ چاہے کوئی اس سے واقفیت رکھے یا نہ رکھے اس کی لوچ اور کھنکناہٹ کی بنا پر لوگ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ آج بھی خالص تجارتی مار دھاڑ سے بھرپور فلمیں بھی عشق اور ملائمت کی چاشنی کے لئے اردو نغموں کا سہارا لیتی ہے۔ یہ نغمیں تماشابین اور سامعین کے لئے آرام دل وگوش کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ بالی وڈ اپنی تجارتی منفعت کے نقطہ نظر سے ہی سہی، عوام کی پسند کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو ادب کی بڑی خدمت کر رہی ہیں۔ بالی وڈ کے شب وروز آج بھی گلزار کی گل افشانی اور جاوید اختر کی اختر شماری کے بغیر بے معطر اور بے روشن ہیں۔ گلزار صاحب کی نظم کا یہ بند تو بالی وڈ اور اردو زبان کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

وہ یار ہے جو خوشبو کی طرح
وہ جس کی زبان اردو کی طرح
(فلم: دل سے، ۲۰۱۲ء)

گلزار اپنے نغموں میں نئی لفظیات اور اچھوتے خیالات کو برقرار رکھتے ہیں۔

میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے
ساون کے کچھ بھیگے دن رکھے ہیں
اور میرے ایک خط میں لپٹی رات پڑی ہے
وہ رات بجھوادو، میرا سامان لوٹادو

(اجازت)

آسمان بالی وڈ اور اردو ادب کا جاوید ترین ستارہ شاعر جاوید اختر کسی کے تعارف کا محتاج نہیں ہیں۔ جاوید اختر موجودہ دور کے نامور اردو شاعر، مصنف، فلموں کے مکالمہ نویس، نغمہ نگار ہیں۔ آپ اقلیم سخن قلم کے سلطان ہیں تو دوسری جانب سخن گفتار میں یکتائے روزگار ہیں۔ ان کی زبان کی ذکاوت، آواز کی متانت، لب ولہجہ کی استقامت، تلفظ کی گرفت واقعی قابل ذکر ہیں۔

جاوید اختر ۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء گوالیار میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ کولوین کے تعلقدار کالج اور منٹو سرکل علی گڑھ میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے میٹرکولشن کی سند حاصل کی۔ بھوپال کے صوفیہ کالج سے گریجویشن کی۔ بعد ازآں اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لئے ۱۹۶۴ء میں ممبئی (بمبئی) آگئے اور محض ۱۰۰ روپے کی تنخواہ میں فلموں میں مکالمہ نویسی کا کام کرنے لگے۔ ۱۹۷۰ء تک انہیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اسی دوران ان کی ملاقات سلیم خان (اداکار سلمان خان کے والد) کے ساتھ ہوئی اور دونوں نے مشترکہ طور پر کام کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۰ء میں فلم 'انداز' کی کامیابی کے بعد ان کے پاؤں فلمی دنیا میں جمنے لگے، سلیم خان منظر نگاری لکھتے اور جاوید اختر مکالمہ نویسی کے ذریعے ان میں رنگ بھرتے۔ اس جوڑی کی کامیاب ترین فلمیں ''ہاتھی میری ساتھی'' ۱۹۷۱ء، سیتا اور گیتا ۱۹۷۲ء، یادوں کی برات ۱۹۷۳ء، زنجیر ۱۹۷۳ء، ہاتھ کی صفائی ۱۹۷۴ء، دیوار ۱۹۷۵ء، شعلے ۱۹۷۵ء، چاچا بھیجتا ۱۹۷۷ء، ڈان ۱۹۷۸ء، ترشول ۱۹۷۸ء، دوستانہ ۱۹۸۰ء، کرانتی ۱۹۸۱ء، زمانہ ۱۹۸۵ء، مسٹر انڈیا ۱۹۸۷ء تھیں۔ اس کے علاوہ آخری داؤ ۱۹۷۵ء، ایمان دھرم ۱۹۷۷ء، کالا پتھر ۱۹۷۹ء، شان ۱۹۸۰ء بھی قابل ذکر فلمیں

ہیں۔غرض ان کی لکھی ہوئی ۲۴ فلموں میں ۲۰ فلمی تجارتی کامیاب ترین فلمیں ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں مسٹر انڈیا کے بعد ذاتی وجہ سے یہ جوڑی الگ ہوگئی۔ ۱۹۸۱ء میں ہدایت کار یش چوپڑا نے اپنی فلم ''سلسلہ'' کے لئے انہیں نغمے لکھنے کی پیش کی۔ اس فلم میں جاوید اختر کے نغمے بہت مقبول ہوئے۔

دیکھا ایک خواب تو یہ سلسلے ہوئے
دور تک نگاہوں میں ہیں گل کھلے ملے۔

اس کے بعد جاوید اختر نغمہ نگار کی حیثیت سے ابھرے۔ جاوید اختر نے کلاسیکل نغموں اور فلمی تجارتی گانوں کی سرحدوں کے خطوط کو ایک نقطہ پر پہنچانے کا اہم کام انجام دیا۔ ان کے سدا بہار نغمے اور گیت بالی ووڈ کی فضا میں پرواز کر رہے ہیں۔

دل کے راستے میں کیسی ٹھوکر میں نے کھائی
ٹوٹے خواب سارے ایک مایوسی ہے چھائی
ہر خوشی سو گئی، زندگی کھو گئی
تم کو جو پیار کیا میں تو سزا میں نے پائی

(فلم: دل چاہتا ہے ۲۰۰۱ء)

دو پل رکا خوابوں کا کارواں
اور پھر چل دیئے تم کہاں، ہم کہاں
دو پل کی تھی یہ دلوں کی داستان
اور پھر چل دیئے تم کہاں ہم کہاں

(فلم: ویرزارا ۲۰۰۴ء)

ایک لڑکی کو دیکھا تو ایسا لگا
جیسے کھلتا گلاب
جیسے شاعر کا خواب
جیسے اجلی کرن

جیسے بن میں ہرن
جیسے چاندنی رات
جیسے نغمے کی بات
جیسے مندر میں ہو
ایک جلتا دیا

(Love Story,1942)

گیت میں گویا تشبیہوں کی خوبصورت آبشار بہائے گئے ہیں ہر جگہ سخن کی وادی میں استعاروں کے گل کھلتے ہیں۔ کہیں مندوں کی گھنٹیاں، دلوں میں رس گھولتی۔ تشبیہوں اور استعاروں کی ایسی خوبصورت جھنکار اردو شاعری میں شاید پہلے کبھی نہ سنی گئی اور نہ سنائی گئی۔ گویا سالوں پہلے فلم چودھویں کا چاند کے گیت کے تشبیہ اور استعارہ گری کا لطف پھر دوبالا ہو جاتا ہے۔

چودھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو
جو بھی ہو تم خدا کی قسم لاجواب ہو۔
زلفیں ہیں جیسے شانوں پہ بادل جھکے ہوئے
آنکھیں ہیں جیسے مئے کے پیالے بھرے ہوئے
دنیائے حسن وشوق کا تم ہی شباب ہو
جو دھویں کا چاند ہو یا آفتاب ہو۔

فلم: چودھویں کا چاند، ۱۹۶۱
نغمہ نگار: شکیل بدایونی

فلم بارڈر ۱۹۹۷، گاڈ مادر ۱۹۹۹ء، رفیوجی ۲۰۰۰ء، اور لگان ۲۰۰۱ء کے لئے نیشنل ایوارڈ یافتہ جاوید اختر آج بھی بطور نغمہ نگار بالی وڈ میں اپنا جادو چلا رہے ہیں۔ جاوید اختر فلموں میں نغمہ نگار ہونے کے علاوہ حال حاضر اردو ادب کے نامور شاعر بھی ہیں۔ اردو ادب اور فلم انڈسٹری کے ساتھ وہ خود اور ان کا تمام کا شجرہ نسبی ادبی و فلمی اشجار سے سرسبز ہے۔

اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ہوگا جو ددھیال ننھیال اور سسرالی رشتوں سے اتنی نامور علمی ادبی اور فلمی ہستیوں کے ساتھ منسلک ہو۔ علمی و شعری وراثت کڑی در کڑی ان کے ساتھ چلی آتی ہے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی شہید جنگ آزادی ۱۹۵۷ء میرزا غالب کے دیوان کے مشاوران ترتیب دادگان میں سے ایک تھے۔ آپ جاوید اختر کے جد بزرگ تھے۔ جاوید اختر کے دادا مظفر خیر آبادی اپنے وقت کے قادر الکلام شاعر تھے، ان کا ننھیال خاندان بھی علمی اور ادبی دنیا میں بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ اردو کے ترقی پسند شاعر اور فلمی نغمہ نگار جاں نثار اختر ان کے والد اور ''حرف آشنا'' اور زیر لب کی مصنفہ صفیہ اختر جاوید اختر کے والدہ تھیں۔ وہ اردو کے جوان مرگ ترقی پسند ادب کے ہمنوا شاعر مجاز لکھنوی کے بھانجے ہیں۔ دوسری جانب اردو کے ترقی پسند ادب کے سرگرم رکن اور فلمی نغمہ نگار کیفی اعظمی کی بیٹی شبانہ اعظمی ان کی دوسری اہلیہ ہیں جو خود ایک معروف فلمی اداکارہ ہیں۔ بالی وڈ کے معروف اداکار فرحان اختر اور ضیا اختر ان کے قابل فرزندان ہیں۔ شریف و نجیب علمی و ادبی خاندان سے وابستہ ہونے کے باوجود جاوید اختر کا بچپن عسرت اور والدہ کی کڑی جدوجہد کی دھوپ میں گذرا۔ تب سے ان کا استعداد علمی اور ذوق ادبی کالاوا اشعار کا طلابن کر سامنے آیا۔ لڑکپن ہی سے شعر و شاعری کیا کرتے تھے۔ ورثہ میں پائی ہوئی علمی و ادبی استعداد خداداد تھی۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں ان کی اپنی آواز، نیا لہجہ اور پیرایہ بیان ہے۔ البتہ جرات اور حوصلہ مندی، نبرد آزمائی، اعتماد بہ نفس میں بزرگوں کا خون لاشعوری طور پر حرف زن ہوتا ہے۔ جاوید اختر کا شعری مجموعہ ''ترکش'' ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔ جاوید اختر کی نظمیں ان کی غزلوں سے زیادہ اعلی ہیں۔ ان کی نظمیں 'وہ وقت یاد آتا ہے'، 'میری آوارگی'، 'بھوک' ان کی تخلیقی دستخط ہیں۔ جاوید اختر کا ایک اور مجموعہ ''لاوا'' ہے۔

ان کی نظمیں اختر الایمان، میراجی، مجاز، جاں نثار اختر، سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی روایت سے مختلف ہیں۔

جدھر جاتے ہیں سب جانا ادھر اچھا نہیں لگا
مجھے پامال رستوں کا سفر اچھا نہیں لگا۔

(لاوا، ص ۳۴)

ان کی شاعری میں ذہنی تجسس، تفکر اور تعقل کی کارکردگی ہے۔ کائنات کے اسرار، انسان کے باطن، زندگی

کے رازوں کو جاننے کی سعی ہے۔ یہ کھیل کیا ہے، کائنات، عجیب قصہ ہے، برگد، ہر وقت ایک اور خیال۔ ان سب نظموں میں قدر مشترک ان کا ذہنی تجسس ہے، یہ نظمیں ٹکڑے ٹکڑے اور زینہ بزینہ گہرائی میں جاتی ہیں۔ جاوید سوال پر سوال اٹھاتے ہیں۔ قاری کے ساتھ مکالمہ کرتے ہوئے سوچ کی استفہامیہ کے ساتھ استعجابیہ کی فضا تیار کرتے ہیں:

یہ کھیل کیا ہے
میں سوچتا ہوں
یہ مہرے کیا ہیں
اگر میں سمجھوں
کہ یہ جو مہرے ہیں
صرف لکڑی کے ہیں کھلونے
تو جیتنا کیا ہارنا کیا (لاوا، ۳۹)

اچانک شاعر واضح کرتے ہیں کہ بات شطرنج کی نہیں، زندگی کی ہے یہ ہار جیت زندگی کی ہے۔ سیاہ وسفید دن اور رات کے استعارے ہیں۔

یہ کھیل کب ہے
یہ جنگ ہے جس کو جیتنا ہے۔ (لاوا، ص ۴۰)

بادشاہ اور وزیر طاقت اور مقتدر کے مظہر ہیں۔ پیادے بے بس عام انسان ہیں جن کی اپنی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ جاوید سوال کرتے ہیں:

اس میں اس طرح کا اصول کیوں
پیادہ جو اپنے گھر سے نکلے
پلٹ کر واپس نہ جانے پائے
اگر یہی ہے اصول
تو پھر یہ اصول کیا ہے؟

اگر یہی ہے کھیل
تو پھر یہ کھیل کیا ہے
میں ان سوالوں سے جانے کب سے الجھ رہا ہوں
میرے مخالف نے چال چل دی ہے
اور اب میری چال کے انتظار میں ہے۔
(لاوا، ص ۴۱۔۴۲)

یعنی یہ جنگ کسی ذاتی دفاع، مفاد یا بقا کی نہیں۔ بلکہ سماجی استحصال اور بے انصافی کے خلاف جدوجہد ہے۔ جاوید اختر کی غزلیں بھی فکر انگیز اور دل خوش کن ہیں۔ معمولاً غزل کی ہر بیت انفرادی خصوصیت کی حامل ہوتی ہے۔ لیکن ان کی غزلوں میں حکیمانہ سخن کے ساتھ تجسس و تفکر کی مربوط کیفیت ملتی ہے۔

نکل گئیں سب کی سب سمندر، زمین بچی اب کہیں نہیں ہے
بچاتے ہم اپنی جان جس میں وہ کشتی بھی اب کہیں نہیں ہے
مگر میں پہنچانتا تھا جس کو وہ، آدمی اب کہیں نہیں ہے
تم اپنے قصوں میں جا کے دیکھو وہاں بھی اب شہر ہی بستے ہیں
کہ ڈھونڈتے ہو جو زندگی تم، وہ زندگی اب کہیں نہیں ہے
(لاوا، ص ۸۲)

اس کی ایک اور نظم ''پیڑ سے لپٹی بیل'' پر جاوید اختر کی شعری مہر لگی ہے۔ اس میں فکر و تجسس کی وہی سوال کرتی ہوئی استعاراتی کیفیت ہے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں استعجابیہ اور استفہامیہ فضا موجود ہے۔ بظاہر بیل پیڑ سے لپٹی ایک بے مایہ شے ہوتی ہے جو پیڑ کے وجود کا حصہ بنتی ہے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب بیل اپنی بانہوں میں پیڑ کے وجود کو سنبھالے اس کی زندگی کا سہارا بن جاتی ہے۔ جاوید اختر آس و آرزو کے اسی نئے گلستاں کے امیدوار ہیں۔ وہ خود بھی تو اسی گلستاں کے پھول ہیں:

بیل اپنی بانہوں میں اب ہے پیڑ سنبھالے
دھیرے دھیرے

گھایل شاخوں پر
پتے پھر سے نکل رہے ہیں
دھیرے دھیرے
نئی جڑیں پھوٹتی ہیں
اور دھرتی میں گہری اتر رہی ہیں
بیل پہ جیسے
ایک نئی مسکان کے ننھے پھول کھلتے ہیں

(لاوا، ص ۱۷۶)

یہ بیل اور پیڑ استعارے ہیں جو جاوید اختر کے بچپن کے دکھوں اور محرومیوں میں ان کے تاب مقاومت کی داستاں سناتے ہیں۔ صفیہ اختر۔ والدہ جاوید اختر، اپنے شوہر جان نثار اختر کی پیڑ سے لپٹی وہ بیل سے جہاں سے جاوید اختر جیسے نئے پھول پھوٹ کر دنیا کو رنگ و بو سے منقش اور معطر کر رہے ہیں۔

جاوید اختر بالی وڈ کی فلموں مین مکالمہ نویس کے لئے چار مرتبہ فلم فیر ایوارڈ سے نوازے گئے۔ ۱۹۹۹ء میں ادب میں بیش قیمت خدمات کے لئے انہیں پدم بھوشن ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ان کے شعری مجموعہ لاوا۔ کے لئے انہیں ساھتیہ اکیدمی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ فلم بوڈر ۱۹۹۷ء، گادر ۱۹۹۹ء، رفیوجی ۲۰۰۰ء اور لگان ۲۰۰۱ء کے لئے نیشنل ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔ جاوید اختر آج بھی بطور نغمہ نگار بالی وڈ میں اپنا جادو چلا رہے ہیں، ۲۰۰۹ء میں راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے اردو شاعری کے باغیانہ تیور کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ۲۰۱۷ء میں اپنی نظم ''حکم نامہ'' میں بڑی جرأت، ذہانت اور خوبصورتی سے زبردست احتجاج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

کسی کا حکم ہے
ساری ہوائیں
ہمیشہ چلنے سے پہلے بتائیں
کہ اس کی سمت کیا ہے
ہواؤں کو بتانا یہ بھی ہوگا

جائیں گی تو کیا رفتار ہوگی
آندھی کی اجازت اب نہیں ہے

دریا کی لہریں
دریا پہ سرکشی کم کر لیں
اپنی حد میں ٹھہریں
ابھرنا اور بکھیرنا
اور بکھر کر پھر ابھرنا
غلط ہے ان کا یہ ہنگامہ کرنا
یہ سب ہے صرف وحشت کی علامت
بغاوت کی علامت
بغاوت تو نہیں برداشت ہوگی
اگر لہروں کو ہے دریا میں رہنا
تو ان کو ہوگا اب چپ چاپ بہنا
کسی کا حکم ہے

.....

کسی کو کوئی یہ کیسے بتائے
ہوائیں اور لہریں
کب کسی کا حکم سنتی ہیں
ہوائیں
حاکموں کی مٹھیوں میں
ہتکڑی میں قید خانوں میں
نہیں رکتیں
یہ لہریں روکی جاتی ہیں
تو دریا جتنا ہو پرسکون

بے تاب ہوتا ہے
اور اِس بے تابی کا اگلا قدم
سیلاب ہوتا ہے
کسی کو یہ کوئی کیسے بتائے۔

جاوید اختر کے والد جان نثار اختر اردو کے معروف شاعر اور بالی وڈ کے نامور نغمہ نگار تھے۔ جاوید اختر کے والد جان نثار اختر اردو کے نامور شاعر اور بالی وڈ کے معروف نغمہ نگار تھے۔ ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔ گوالیار کے وکٹوریہ کالج ہائی اسکول سے مٹریکولیشن کا امتحان دیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں صفیہ اختر سے شادی کی۔ اسی گھرانے میں ۱۹۴۵ء میں جاوید (اختر) اور ۱۹۴۶ء میں سلمان اختر کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد بھوپال آگے اور حمیدیہ کالج میں اردو اور فارسی کے صدر شعبہ کا عہدہ سنبھالا۔ ۱۹۴۹ء میں قسمت آزمائی کے لئے بمبئی (ممبئی) آگئے۔ یہاں اکر انہیں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی جیسے ترقی پسند ادبی تحریک کے نامور مصنفین کی صحبت حاصل ہوئی۔ اور وہ خود بھی اس تحریک کے رکن بن گئے۔ اوایل میں فلموں میں انہیں چندان کامیابی حاصل نہیں ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں فلم یاسمین کے بعد ان کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ ''میری نیند وں میں تم'' فلم نیا انداز ۱۹۵۶ء؛ ''غریب جان کے ہم کو تم دغا نہ دینا''، فلم چھومنتر ''اب یوں فاصلوں سے''، فلم شنکر حسین ۱۹۷۷ء ان کے قابل ذکر فلمی نغمے ہیں۔ ان کی پیش کردہ اور لکھی ہوئی ایک فلم ''بہو بیگم'' (اداکار پردیپ کمار، اشوک کمار، مینا کماری) ۱۹۴۴ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ ۱۹۷۳ء میں انہوں نے اپنے شعری مجموعہ ''خاک دل'' کی اشاعت کی اس مجموعہ میں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۷۰ء تک کا کلام شامل ہے۔ اسی مجموعہ پر انہیں ۱۹۷۶ء میں ساہیتہ اکیڈمی اردو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے رکن تھے۔ ان کی شاعری سیکولر (غیر مذہبی) شاعری ہے۔ آزادی، معاشی استحصال، بائیں حزب کے اصولوں پر مبنی ہے۔ اگر چہ ان کے اشعار سماجی سیاسی افکار کا پیغام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود ان اشعار کے پشت فرما ان کی اہلیہ صفیہ اختر کا بڑا کردار رہا ہے۔ جان نثار اختر اعتراف

کرتے ہیں۔

میرے مرنے کا سلیقہ ۔ مرے جینے کا شعور
مرا ناموس وفا ، مری محبت کا غرور
پھر بھی اس عرصہ گہ جہد مسلسل سے مجھے
کوئی آواز پہ آواز دئے جاتا ہے

ہر قدم تو نے کبھی عزم جوان بخشا
میں وہی عزم جوان ساتھ لئے جا تا ہوں
(خاک دل،نظم خاک دل،ص ۱۵۸۔۱۶۳)

جان نثار اختر نے ۱۹۵۵ سے ۱۹۷۶ء (سال وفات) تک کی چار دہائیوں مین بالی ووڈ فلموں کے لئے ۱۵۱ گیت لکھے ۔ ۱۹۸۰ء میں فلم نوری کے گیت کے لئے بہترین نغہ نگار کی حیثیت سے فلم فیر ایوارڈ کے لئے نامزد کئے گئے۔

آجا رے میرے دلبر آجا
دل کی پیاس بجھا جا

کمال امروہی کی فلم رضیہ سلطانہ (۱۹۸۲ء) کی نغمہ نگاری میں مصروف تھے کہ ۱۹۷۶ء میں ممبئی میں انکا انتقال ہوا۔

جاوید اختر کی والدہ صفیہ اختر اردو ادب کا وہ ستارہ ہے جو بہت ہی کم مدت کے لئے افق ادب میں نمودار ہوا۔ اور اپنی ادبی کرنوں سے آسمان ادب میں مقام حاصل کیا۔ اردو ادب کی خطوط نگاری میں مرزا غالب کے بعد صفیہ اختر کا نام سرفہرست آتا ہے۔ یہ خطوط انہوں نے اپنے شوہر جان نثار کو جو اس وقت بالی ووڈ میں کیریر کی جد وجہد کر رہے تھے یکم اکتوبر ۱۹۴۳ سے ۲۹ دسمبر ۱۹۵۲ کے درمیان لکھے تھے۔ صفیہ اختر کی وفات (۱۹۵۳) کے بعد جان نثار اختر نے انہیں دو مجموعوں ''حرف آشنا'' اور ''زیر لب'' کے عنوان سے ۱۹۵۵ میں شائع کیا۔ اور

اس طرح یہ ذاتی و شخصی خطوط اردو اب کا بیش قیمت خزانہ بن گئے۔ کرشن چندر نے ان خطوط کو کالیدا اس کے میگھ دوت سے مطابقت دی جہاں محبوب سے جدائی، فراق کا درد، وصال کی امید، ارمان اور آرزوئیں مچلتی تڑپتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے ان خطوط کی بنا پر صفیہ اختر کو مجسمہ قوت محبت سے تعبیر کیا۔ یہاں محبت کی قوت، صبر و بردباری والہانہ انداز میں پاش پاش ہو کر ابھرتی رہتی ہے۔ فراق پوری کے بقول یہ خطوط پاک مقدس محبت کا اظہار، شریک حیات کے لئے ایثار، انسانی اقدار کی ایک برھانی دلیل ہے۔ جو نہ صرف اردو ادب بلکہ شاید جہاں ادب میں اپنی نوعیت کی منفرد تحریر ہے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۴۶ء

اختر عزیز

تمھارا حال کئی دن سے معلوم نہیں ہوا۔ جی بری طرح سے پریشان ہے۔ کہیں مجھ سے خفا تو نہیں۔ میں بے موت مر جاونگی۔ میرے لئے یہی کوفت کیا کم ہے کہ تم تک پہنچ نہیں سکتی۔ خدا کرے تمھاری خیریت جلد معلوم ہو جائے ورنہ میں جس طرح ہوگا چل پڑونگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ جادو (جاوید اختر) ہر وقت ادھم پر مادہ، نظر آتا ہے۔ نہ جانے کہاں کی زندگی اس میں کوٹ کوٹ کر بھر گئی ہے۔ آفتاب سے کافی مانوس ہو گیا ہے۔ بعض اوقات محبت بھرے انداز میں خود ہی لپٹ کر مجھے پیار کرتا ہے۔ مجھے تمہارا شبہ ہونے لگتا ہے۔ میں تمہارے حصے کا پیار بھی اسی کو کر لیتی ہوں۔

تمھاری صفیہ

صفیہ اختر کے تنقیدی مضامین کا ایک مختصر مجموعہ ''انداز فکر'' ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون ''شمن کا نفسیاتی ارتقا'' عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' کا تنقیدی جائزہ ہے۔ صفیہ اختر کے تنقیدی جائزے سے قبل اس ناول کو خاص قبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن صفیہ اختر نے جب اپنے مضمون میں ناول کے شمن کردار کے نفسیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا، تب ناول نے قارئین کو اپنی جانب راغب کیا اور ناول کو خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی

۔اس طرح ان کا ایک اور مقالہ ''گھر کا بھیدی'' مرد وعورت کی ازدواجی زندگی کے نشیب وفراز کا تجزیہ ہے۔ اس حوصلہ مند خاتون نے محض ۳۷ سال کی عمر میں سرطان کی بیماری میں عسرت اور فراق کے درد جھیلتے ہوئے شوہر اور بچوں کو معاشی اور ذہنی سہارا دیتے ہوئے ۱۷ جنوری ۱۹۵۳ میں اس جہان فانی سے رخصت لی۔

اردو کے جوانمرگ شاعر اسرار الحق مجاز لکھنوی، صفیہ اختر کے بڑے بھائی اور جاوید اختر کے ماموں تھے۔ مجاز نے ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن کی۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ یہیں مجاز تخلص اختیار کیا۔ ان کی نظم'' نذر علی گڑھ'' علیگڑھ یونیورسٹی کا ترانہ بن چکی تھی۔

سرشار نگاہ نرگس ہوں یا بستہ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن ہے میں اپنے چمن کا بلبل ہوں۔

مجاز ترقی پسند ادبی تحریک کے رکن تھے۔ ۱۹۳۶ء میں سبط رضوی اور سردار جعفری کے ساتھ لکھنو سے رسالہ ''نیا ادب'' جاری کیا۔ ۱۹۴۳ء کے بعد مجاز پر ذہنی پریشانیوں کا دور پڑنے لگا اور رانچی کے دماغی اسپتال میں موجودہ بنگلہ دیش کے قومی شاعر قاضی نذر الاسلام کے ساتھ ایک ہی وارڈ میں زیر علاج رہے۔ صحت یابی کے بعد ممبئی آ گئے۔ ممبئی کے قیام کے دوران فلم ''ٹھوکر'' کے لئے نغمہ لکھا۔ طلعت محمود کی آواز میں یہ گیت ''آوارہ'' بہت مقبول ہوا۔

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں
یہ شہر کی رات میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی دوڑتی سڑکوں یہ آوارہ ، پھروں
غیر کی بستی میں کب تک در بدر مارا پھروں
راستہ میں رک کر دم لے لوں، میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں، میری فطرت نہیں
اور کوئی ہم نوا مل جائے، یہ قسمت نہیں

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

(فلم: ٹھوکر، ۱۹۵۳)

مجاز بنیادی طور پر رومانی شاعر ہیں۔ غزلوں کی بہ نسبت نظمیں زیادہ لکھیں ہیں۔

اس ایک حجاب پہ سو حجابیاں صدقے
جہاں سے چلتا ہوں تم کو دیکھتا ہوں میں
بتانے والے وہیں بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

.....

کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے خراب ہونا تھا
مجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی

(کلیات مجاز، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۲ء)

مجاز تمام تر ترقی پسندانہ فکر اور اشتراکی رجحانات کے باوجود کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں بنے۔ فیض کے بعد ترقی پسند شعرا میں سب سے پہلے مجاز کا نام آتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک طرف زندگی کی سرشاری ملتی ہے تو دوسری طرف انقلابی شعور بھی ہے۔ انکی شاعری میں رومان، انقلاب، آزادی بیک وقت اجاگر ہوتے ہیں۔

مجاز کی مقبولیت کی تین بڑی وجوہات ہیں۔ اول، دور جدید کے خیالات کی عکاسی۔ دوم، ان کی عام فہم زبان اور سوم، ان کے کلام کی دیانت داری۔ نظم ''مجھے جانا ہے ایک دن'' کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ابھی تہذیب عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی داد صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکرلے نہیں سکتی

مجھے جانا ہے ایک دن تیری بزم ناز سے آخر
ابھی تو کائنات او ہام کا ایک کارخانہ ہے
ابھی دھوکا حقیقت ہے، حقیقت ایک فسانہ ہے
ابھی توز ندگی کو زندگی کر کے دکھا نا ہے
مجھے جانا ہے ایک دن تیری بزم نار سے آخر

(کلیات مجاز، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۲ء۔ص ۱۶۳)

مجاز ذاتی زندگی میں، عشق میں، فلمی کیریر میں، حتی اشتراکی خیالات کی پیروی میں بھی ناکامیاب رہے۔ خود اعتراف کرتے ہیں۔

قطعہ:

سب کا مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا نہ کر سکے
سب کے گریبان سی ڈالے، اپنا ہی گریبان بھول گئے

(شب تاب، ہندستانی پبلیشرز، دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۱۵۰)

ان کی چند عمدہ نظمیں ''خواب سحر''، ''شہر نگار''، اندھیری رات کا مسافر'' اعتراف'' اور'' نوجوان خاتون سے'' ہیں۔

تیرے ماتھے پہ ہے آنچل بہت ہی خوب ہے
تو اس آنچل سے ایک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا
تیرے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا۔

(''نوجوان خاتون سے''، ''کلیات مجاز''، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۱۳۰)

کلیات مجاز میں کل ۲۶ نظمیں، ۳۳ غزلیں اور تین گیت ہیں، مجاز کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' ۱۹۳۰ء میں شایع ہوا۔ بعد ازاں ۱۹۵۶ء تک اور بھی جو لکھا وہ دوبارہ ''آہنگ'' ہی کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شایع ہوا۔ مجاز نے بہت ہی مختصر زندگی پائی۔ شاید اپنے طرز زندگی کی وجہ سے اپنی حیات ہی میں انہیں خود ہی اسکا احساس تھا۔

قطعہ

وقت کی سعی مسلسل کا رگر ہوتی گئی
زندگی لحظہ لحظہ مختصر ہو تی گئی
سانس کے پردوں میں بجتا رہا ساز حیات
موت کے قدموں کی آہٹ تیز تر ہو تی گئی

(شب تاب، ہندوستانی پبلشرز، دہلی ۱۹۴۵ء، ص ۱۸۲)

۵ دسمبر ۱۹۵۵ء چوالیس سال کی عمر میں مجاز نے اس زندگی سے رخصت لی۔

ایک اور ادبی، علمی اور فلمی ہستی جس کے ساتھ جاوید اختر کی نسبت ہے وہ ہے کیفی اعظمی۔ اردو شاعری کو فلموں کے ساتھ اتصال دینے میں ان کا نام سرفہرست آتا ہے۔ ان کی بیٹی شبانہ اعظمی ہندوستانی فلم کی مشہور فنکارہ اور ان کے بیٹے بابا اعظمی سنیما فوٹو گرافر ہیں۔ شبانہ اعظمی جاوید اختر کی دوسری اہلیہ ہیں۔ جاوید اختر کیفی اعظمی کے داماد ہیں۔ کیفی اعظمی کا پورا نام اطہر حسین رضوی ہے۔ ۱۴ جنوری ۱۹۱۹ء میں اتر پردیش اعظم گڑھ ضلع میں پیدا ہوئے غالباً اعظم گڑھ کی مناسبت سے اپنے تخلص کیفی کے ساتھ اعظمی کو وابستہ کیا۔ اور اسی نام سے مشہور ہوئے۔ گیارہ سال کی لڑکپن کی عمر میں ہی پہلی غزل کہی۔ غزل کا مطلع تھا۔ اتنا تو زندگی میں کسی کے خلل پڑے۔

۱۹۴۲ء میں تعلیمی سلسلہ ترک کر کے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بنے۔ ان کی ادبی قابلیت کو دیکھتے ہوئے ترقی پسند ادبی تحریک نے ان کی حتی الامکان تشویق وحمایت کی۔ بعد ازآں وہ اس ادبی تحریک کے سرگرم رکن بن گئے۔ کیفی اعظمی کی اولین شاعری غزل گوئی حسن وعشق، تشبیہ واستعارات، محور کی گرد گھومتی ہے۔ ترقی پسند ادب تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے کے بعد ان کے فن اور شیوہ شاعری میں تبدیلی آئی۔ اب ان کی شاعری کا مافی الضمی معاشرہ، سماجی طبقہ بندی، معاشی استحصال ہونے لگا۔ کیفی اعظمی کا پہلا شعری

مجموعہ جھنکار ۱۹۴۲ء کو منظر عام پر آیا۔ ان کی دیگر اہم مجموعات کی فہرست یوں ہے۔ آخری شب، سرمایہ، آوارہ، سجدہ، کیفیات، نئی گلستاں وغیرہ، عورت، مکاں، دائرہ، سانپ، بھر دینی ان کی بہترین نظمیں شمار کی جاتی ہیں۔ کیفی اعظمی نے بالی ووڈ میں بطور اداکار نغمہ نگار، کہانی نویس کام کیا فلم بزدل (۱۹۵۱) کے لئے انہون نے پہلا نغمہ لکھا اس کے بعد یہودی کی بیٹی ۱۹۵۶ء، پرویں ۱۹۵۷ء، مس پنجاب میل ۱۹۵۸ء اور عید کا چاند ۱۹۵۸ء فلموں کے کہانی نویس تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ احمد عباس، بمل رائے، ساحر لدھیانوی، جان نثار اختر، مجروح سلطان پوری اور کیفی اعظمی جیسے نغمہ نگاران ہندستان فلمی نغموں میں زبردست انقلاب لا رہے تھے ان اردو شاعروں نے ہندوستان فلمی نغموں کے لب ولہجہ، الفاظوں کی تراکیب میں ایک نئی روانی پیدا کی۔ کیفی اعظمی سے شیام بنگل کی فلم ''منتھن'' ۱۹۷۶ء میں بطور نغمہ نگار اور رمکالمہ نگار کام کیا۔ ایم ایس سنہیا کی فلم گرم ہوا ۱۹۷۳ جو کہ عصمت چغتائی کے ناول پر مبنی تھی میں نغمہ نگار اور مکالمہ نویس کا کام کیا گرودت کی فلم '' کاغذ کے پھول'' ۱۹۵۹ء اور چیتن آنند کی فلم حقیقت ۱۹۶۴ء سات ہندوستانی ۱۹۶۹ء، شعلہ اور شبنم ۱۹۷۱ء، پروانہ ۱۹۷۱ء، باورچی ۱۹۷۲ء، پاکیزہ ۱۹۷۲ء، ہنسے زخم ۱۹۷۳ء، ارتھ ۱۹۷۶ء، اور رضیہ سلطانہ ۱۹۸۲ء کے لئے نغمے لکھے۔ ''میری آواز سنو'' ان کی فلمی نغموں کے انتخابات کا مجموعہ ہے۔ فلمی نغموں میں ان کا بہترین یادگار نغمہ حسب ذیل ہے۔

کر چکے ہم فدا جان و تن ساتھیوں
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں
زندہ رہنے کے موسم بہت ہیں مگر
جان دینے کی رت روز آتی نہیں
حسن اور عشق دونوں کو رسوا کرے
وہ جوانی جو خون میں نہاتی نہیں
آج دھرتی بنی ہے دلہن ساتھیوں
اب تمہارے حوالے وطن ساتھیوں

(فلم: حقیقت، ۱۹۶۴)

۱۹۷۵ء بہترین نغمہ نگار نظم ''سات ہندوستانی'' کے لئے انہیں نیشنل فلم فیر ایوارڈ عطا کیا گیا۔ ان کے شعری مجموعہ'' آوارہ سجدہ'' کے لئے اتر پردیش اردو اکیڈمی اور قومی ساہتیہ اکیڈمی برائے اردو ایوارڈ سے انہیں سرفراز کیا گیا، ۱۹۹۵ء میں انہیں قومی یکجہتی کے لئے صدر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مہاراشٹر حکومت نے انہیں جے نیشور ایوارڈ عطا کیا۔ ۲۰۰۲ء میں انہیں دہلی سرکار اور دہلی اردو اکیڈمی سے پہلے ہزارہ کے انعام سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۲ میں ساہتیہ اکیڈمی اسکالر شپ سے سرفراز کیا گیا۔ بیشو بھارتی یونیورسٹی شانتی نکیتن کی طرف سے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی گئی۔ ۱۰ مارچ ۲۰۰۲ ممبئی میں ان کا انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۸۳ سال تھی۔

> بالی وڈ میں گلزار، جاوید اختر، جان نثار اختر، آنند بخشی، مجاز اور ساحر لدھیانوی، حسرت جے پوری، شکیل بدایونی، کیفی اعظمی جیسے اردو کے ماہر شاعروں کی وجہ سے اردو کی جو خدمت ہو رہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان میں وہ لوچ اور شگفتگی ہے جو اسے ہر ماحول میں پنپنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ جب تک ہمارے شعراو ادباء زندہ ہیں اردو زندہ ہے اور جب تک اردو زندہ ہے، ہمارے شعراو ادبا جاوید ان ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ اسرار الحق مجاز لکھنوی، شب تاب، ہندوستانی پبلیشرز، دہلی، ۱۹۴۵

۲۔ اسرار الحق مجاز لکھنوی، کلیات مجاز، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۲

۳۔ اقبال عظیم، سید، مشرقی بنگال میں اردو، مشرق کوآپریٹیو پبلیکیشنز، ڈھاکہ، اگست ۱۹۵۴

۴۔ جاوید اختر، ترکش، ساحر پبلیکیشن ہاوس، اشاعت اول، اپریل ۱۹۹۵ء

۵۔ جاوید اختر، لاوا، سٹار پبلیکیشن، نئی دہلی، یکم جنوری ۲۰۱۱ء

۶۔ جان نثار اختر، خاک دل، نگرا طباعت، ۱۹۷۳ء

۷۔صفیہ اختر، زیر لب، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان رصفیہ اکیڈمی، حیدرآباد، انڈیا ۱۹۵۵ء

۸۔صفیہ اختر، حرف آشنا، صفیہ اکیڈمی، حیدرآباد، انڈیا ۱۹۵۵ء

۹۔کیفی اعظمی، آخری شب، کتب پبلشرز لمیٹڈ، ممبئی، ۱۹۴۷

۱۰۔کیفی اعظمی، آوارہ سجدہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، جنوری ۲۰۱۷ء

۱۱۔کیفی اعظمی، جھنکار، قومی دارالاشاعت، ممبئی

۱۲۔کیفی اعظمی، سرمایہ، معیار پبلیکشن، دہلی ۱۹۹۴ء

۱۳۔کیفی اعظمی، کیفیات، راج کمل پرکاشنا، دہلی، ۷ جنوری ۲۰۱۹ء

۱۴۔کیفی اعظمی، میری آواز سنو، راج کمل پرکاشنا، دہلی، ۲۰۰۲ء

۱۵۔کیفی اعظمی، نئی گلستان، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، یکم جنوری ۲۰۱۷ء

۱۶۔نشاط حسن، فلمی نغمہ نگاری، سینما کی تاریخ کا روشن باب، ماہنامہ اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، دسمبر ۲۰۱۷

۱۷۔نصیر الدین ہاشمی، دکن میں اردو، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰ء

۱۸۔وفا راشدی، بنگال میں اردو، مکتبہ اشاعت اردو، حیدرآباد، پاکستان، جنوری ۱۹۵۵

اکیسویں صدی میں ہندوستان کے اردو ناول۔ایک تنقیدی مطالعہ

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی*

کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی جس شکست وریخت، پیچ وخم اور انقلاب سے دوچار رہتی ہے اس کے اظہار کا سب سے بہتر وسیلہ بننے کی صلاحیت اگر کسی صنف میں ہے تو وہ صرف ناول میں ہے، کیونکہ ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل وعناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ داخلی تضاد وتصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ زندگی اور معاشرے سے گہرے تعلق کے باوجود ناول کو اپنے وجود اور اہمیت کے لئے ہر جگہ اور ہر دور میں سنگھرش کرنا پڑا ہے۔ پریم چند کے گئودان تک ناول کو بڑی مشکل سے تیسرا درجہ دیا گیا تھا۔ (اس سے پہلے کے دو مقام شاعری اور افسانے کے لئے مخصوص تھے) ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے زیر اثر لکھنے والوں نے اردو ناول نگاری کو موضوع اور اظہار دونوں سطحوں پر نئے موڑ اور نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ ان لوگوں کے ذریعہ ناول میں پہلی مرتبہ نئی کہانی، اس کے کہنے کا فن، وقت اور اس کا انسانی زندگی میں عمل دخل، نفسیاتی، سماجی اور طبقاتی الجھنیں، اظہار کی نئی صورتیں سب کچھ نئے مسالوں کے ساتھ نئے ڈھنگ سے پیش ہوئے۔ انہیں تمام صورتوں نے ناول کے لئے ایک راستہ ہموار کیا اور ناول محض اصلاحِ مذاق، دل بہلاو؟ اور مثالی زندگی کی تلاش سے نکل کر حقیقی اور عملی زندگی کی طرف متوجہ ہوا۔ زندگی اور سماج سے بڑھتے ہوئے تعلق نے اس کی مقبولیت میں بھی اضافہ کیا اور ناول جو اصناف ادب میں تیسرے درجے پر متمکن تھا اسے دوسرا مقام مل گیا۔ پہلا مقام حاصل کرنے کے لئے بہرحال اسے سنگھرش کرتے رہنا تھا کیونکہ ۱۹۷۰ کے بعد تک جب نئی نسل کی آمد کی اطلاع اور بحث زوروں پر تھی فکشن میں اس کا ذکر صرف افسانوں کے حوالے سے ہوتا تھا۔ ناول کی سمت ورفتار قرۃ العین حیدر (گردش رنگ چمن) سے جوگیندر پال (نادید) تک آکر رک سی گئی تھی۔ اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جانے لگا کہ ناول کے لئے ایک خاص قسم کے تجربے، مشاہدے اور عمر کی ضرورت ہوا کرتی ہے

*ایسوسیٹ پروفیسر اور چیئرمین، شعبۂ اُردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ، بہار، بھارت

اور یہ سب نئی نسل کے پاس نہیں اس لئے یہ مشکل اور بڑا کام نئی نسل کے بس کا نہیں۔ گویا ۱۹۷۰ کے بعد ہمارے نقادوں کے ذریعہ ناول کے سفر پر فُل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ کرائسس سے بھرے اس عہد اور ماحول میں تین اہم افسانہ نگاروں عبدالصمد، غضنفر اور پیغام آفاقی کے بالترتیب تین ناولوں دوگز زمین، پانی اور مکان نے افسانوی ادب میں ہلچل مچادیا۔ اس ہلچل کی دو وجہیں اور تھیں ایک تو یہ کہ خلاف توقع یہ ناول نئی نسل، نئی ذہن کی پیداوار تھے، دوسری وجہ ان کا رویہ برتاؤ اور اسلوب قطعی طور پر اپنے پیش رو وں سے مختلف تھے۔ یہ ناول سبھی کو چونکا گئے۔ ان ناولوں کی کامیابی نے اردو کے اہم افسانہ نگاروں کو بھی متوجہ کیا چنانچہ یکے بعد دیگرے متعدد ناول منظر عام پر آتے گئے، اور یہ سلسلہ اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ جوگندر پال، علی امام نقوی، صلاح الدین پرویز، عشرت ظفر، مظہر الزماں خان، حسین الحق، عبدالصمد، غضنفر، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، الیاس احمد گدی، گیان سنگھ شاطر، اقبال مجید، سید محمد اشرف، ساجدہ زیدی، جتندر بلو، کشمیری لال ذاکر، یعقوب یاور، شفق، ترنم ریاض، محمد علیم، شمس الرحمان فاروقی، انیس ناگی، نورالحسنین، کوثر مظہری، شاہد اختر، آچاریہ شوکت خلیل، احمد صغیر، علی امجد، ظفر عدیم، اور شبر امام وغیرہ ایسے نام ہیں جن کا سب سے بڑا Contribution یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں انہوں نے ناول کو پہلے پائدان پر پہنچادیا اور آج نقادوں کو مجبور کردیا یہ اعلان کرنے پر کہ اکیسویں صدی اردو فکشن بالخصوص اردو ناول کی صدی ہے۔

میں اگر اپنی گفتگو کو صرف اکیسویں صدی تک محدود کروں تو اس نئی صدی میں اردو کے جو ناول منظر عام پر آئے ان میں مجھے میر کہتے ہیں صاحبو (حبیب حق) پار پرے (جوگندر پال) بساط (علی امام نقوی) دھمک بکھرے اوراق، شکست کی آواز، اجالوں کی سیاہی (عبد الصمد) اماوس میں خواب (حسین الحق) مہاماری، ائے دل آوارہ (شموئل احمد) وش منتھن، شوراب، مانجھی (غضنفر) دی وار جرنلس (صلاح الدین پرویز) پلیتہ (پیغام آفاقی) چراغ تہ داماں (اقبال مجید) جنگ جاری ہے، دروازہ بند ہے، ایک بوند اجالا (احمد صغیر) پو کے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، آتش رفتہ کے سراغ، نالہ شب گیر (مشرف عالم ذوقی) بادل، کابوس (شفق) کئی چاند تھے سر آسماں (شمس الرحمان فاروقی) برف آشنا پرندے (ترنم ریاض) وشواس گھات (جتندر بلو) اندھیرا پگ (ژوت خان) موت کی کتاب (خالد جاوید) نادیدہ بہاروں کے

نشاں،صدائے عندلیب برشاخ شب (شائستہ فاخری) میرے نالوں کی گمشدہ آواز (محمد علیم) نخلستان کی تلاش، ایک ممنوعہ محبت کی کہانی،خدا کے سائے میں آنکھ مچولی،روحزن (رحمان عباس) ایوانوں کے خوابیدہ چراغ (نورالحسنین) اگنی پریکشا (کشمیری لال ذاکر) کہانی کوئی سناؤ متاشا (صادقہ نواب سحر) اگر تم لوٹ آتے (آچاریہ شوکت خلیل) دھند میں کھوئی ہوئی روشنی (افسانہ خاتون) ایک اور کوسی (نسرین ترنم) دھند میں اُگا پیڑ (آشا پربھات) انجوشوفر (ظفر عدیم) شاہین، جب گاؤں جاگے (شبر امام) کالی ماٹی (علی امجد) سیاہ کاری ڈور میں ایلین (جاوید حسن) زوال آدم خاکی (غیاث الدین) دکھیاری،خواب سراب، پری ناز اور پرندے (انیس اشفاق) بنارس والی گلی (فیاض رفعت) تخم خوں (صغیر رحمانی) اور لیمینیڈ گرل (اختر آزاد) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔بلا شبہ یہ تمام ناول غیر معمولی اور اہم نہیں ہیں مگر دھمک، مہاماری، مانجھی، جنگ جاری ہے، لے سانس بھی آہستہ، بادل، اندھیرا پگ، کئی چاند تھے سر آسماں، برف آشنا پرندے، پلیتہ، صدائے عندلیب برشاخ شب، خدا کے سائے میں آنکھ مچولی، کہانی کوئی سناؤ متاشا، چراغ تہ داماں، خواب سراب اور لیمینیڈ گرل جیسے کچھ ناول ایسے ضرور ہیں جو اردو ناول کی تاریخ کا حصہ بنیں گے۔یہ ناول اہم بھی ہیں اور اچھے بھی کیونکہ ان میں جیتے جاگتے تازہ ترین مسائل، دور حاضر کی سماجی اور معاشی گتھیاں، زندگی کی نئی الجھنیں، انسان کی نفسیاتی کمزوریاں، نئے اور منفرد انداز میں در آئی ہیں۔میڈیا کا پھیلتا جال، بھرشٹا چار کا کھل کر کھیل، فرقہ وارانہ فسادات، نیا عریاں کلچر، نوجوانوں کا بڑھتا ہوا فرسٹریشن، تعصب، ہماری گمشدہ تہذیب، ہندستان کی مخصوص سیاست اور اس کا بحران، اقدار کی پامالی اور ہوس کی اجارہ داری ایسے مختلف موضوعات ان ناولوں میں زندگی کی پوشیدہ تلخ اور کھردری حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔زندگی کے انتشار اور اس کے احساس نے کبھی کبھی پلاٹ سے بھی لکھنے والوں کی دلچسپی کم کر دی۔انسان کے باطنی کرب اور زندگی کی بے سمتی کا اظہار بھی ان ناولوں میں ہوا اور اسی مناسبت سے زبان واسلوب بھی اختیار کئے گئے اس لیے ان ناولوں میں لسانی تازہ کاری کو بڑی آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔یہاں مسائل کا حقیقی عرفان وادراک، تبدیل شدہ اقدار وافکار کا حقیقت پسندانہ وفنکارانہ اظہار وابلاغ اپنے آپ میں گہری بصیرت اور جمالیاتی کیف رکھتا ہے۔اس لئے یہ ناول اپنی گوناں گوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایسے مختلف جدید رویے اور نئی جہتیں پیش کرتے ہیں جن سے اردو ناول کا دامن وسیع ہوتا ہے اور گفتگو کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں جن لوگوں نے تسلسل کے ساتھ ہمیں ناول دیے ہیں اُن میں عبد الصمد ،ذوقی ،غضنفر رحمان عباس اور احمد صغیر سب سے پہلے متوجہ کرتے ہیں۔عبدالصمد اپنی سیاسی فکر اور واضح بیانیہ اسلوب کے سبب پہلے سے ہی شناخت قائم کر چکے تھے ،نئی صدی میں انہوں نے دھمک ،بکھرے اوراق اور شکست کی آواز جیسے ناولوں میں اپنے موضوعاتی اور اسلوبی تنوع کے سبب قارئین کو چونکایا۔'دھمک' میں انہوں نے بدعنوان سیاست کی پیچیدگیوں، اقتدار کے کھیلوں اور استحصال کے بھیانک رنگوں کو تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے اپنے صوبے بہار کے سیاسی گلیاروں اور اس کے شب و روز کا گہرا مشاہدہ کیا اور اس کے اندھیروں اجالوں کو بڑی سادگی و بے تکلفی سے پڑھنے والوں تک پہنچا دیا۔سیاست اور سماج عبدالصمد کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اس لئے انہوں نے ناول میں بہار کے سیاسی کھیل، کرپشن اور شرمناک سرگرمیوں کے مختلف رنگوں کو کئی زاویوں سے پوری فنکاری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔چونکہ عبدالصمد کے تمام ناول ایک تخصیص لیے ہوئے پس منظر اور اسلوب کے حامل ہوتے ہیں اس لیے 'بکھرے اوراق' اور 'شکست کی آواز' نے قارئین کو اسلوب اور موضوع کی ندرت کی وجہ سے حیران کر دیا۔'بکھرے اوراق' موضوع کے اعتبار سے تو وہی سیاسی اور معاشرتی کرپشن پیش کرتا ہے جس کے لیے عبدالصمد مشہور ہیں۔اس میں بھی انہوں نے خوف و دہشت کے موجودہ ماحول کو ہمہ جہت رنگ میں دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے مگر یہاں ان کا اسلوب استعاراتی اور علامتی ہے۔عبدالصمد شروع میں اپنے استعاراتی اور علامتی افسانوں کے لیے خاصے مشہور رہے ہیں مگر ناول میں انہوں نے یہ انداز پہلی مرتبہ اختیار کیا ہے۔یہ اسلوب ناول میں بہت کامیاب تو نہیں ہو سکا مگر اس کے ذریعہ انہوں نے ناول کو ہماری موجودہ زندگی کا آئینہ خانہ بنانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔'شکست کی آواز' اسلوب کے بجائے موضوع کے سبب حیران کرتا ہے کہ اس میں عبدالصمد پہلی بار سیاسی اور سماجی گلیاروں سے نکل کر انسان کے نفسیاتی اور جنسی مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔انہوں نے ندیم نام کے ایک Introvert نوجوان کی شخصیت میں پوشیدہ جنسی شعور کی پیچیدگیوں کو وقوعوں کے ذریعہ تدریجی طور پر کامیابی سے دکھایا ہے۔ندیم چونکہ فطری طور پر دروں بیں (Introvert) ہے، وہ لڑکیوں سے گھبراتا ہے۔طبعیاتی تقاضے کے تحت جنسی جذبے کی فزوں تری ندیم کی شخصیت میں ایک کشاکش پیدا کرتی ہے۔وہ نوری کو نیم عریاں انداز میں دیکھتا بھی ہے مگر جب وہ اپنا جسم دکھانے لگتی ہے تو گھبرا بھی جاتا ہے۔ناظمہ قریب آنے لگتی

ہے تو خود فاصلہ قائم کر لیتا ہے۔مگر یہی جذبہ اس وقت بیبا کی محسوس کرتا ہے جب وہ نوری کو ماسٹر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔جب یہ باندھ ٹوٹتا ہے تو وہ اپنے اندر ہمت بٹور لیتا ہے کہ عورت کو مختلف روپ میں دیکھ سکے۔اختری کا آنا، بچے کو دودھ پلانا، پھر غسل خانہ میں نہانا، یہ ساری تصویریں ندیم کی شخصیت میں پوشیدہ برف کی سِل کو پگھلاتے رہتی ہیں اور تصورات اور حقیقت کا ٹکراؤ اُسے آگہی کی نئے جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔عبدالصمد نے ندیم کی آہستہ خرام تبدیلیوں کو متعدد چھوٹے چھوٹے خارجی واقعات کے ذریعہ فطری انداز میں پیش کیا ہے۔شخصیت اور اس کی دروں بینی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اِس ناول کا اہم ترین وصف ہے جو عبدالصمد کی ناول نگاری کی ایک نئی مگر دلچسپ جہت سے روشناس کراتا ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سیاست اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کو ٹارگٹ کرنے کا مسئلہ بھی اپنے وطن کے بڑے مسائل میں شمار ہوتا رہا ہے۔اب تہذیبوں کا ٹکراؤ آمنے سامنے ہے، اس لیے معمولی معمولی باتوں پر فرقہ وارانہ تناؤ ہو جاتا ہے۔غلط فہمیوں اور سیاسی مفادات سے نفرت کی آگ کو ہوا ملتی ہے اور ایک مخصوص طبقے کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر پوری قوم پر خوف و ہراس کی فضا مسلط کر دی جاتی ہے۔مشرف عالم ذوقی کے 'آتش رفتہ کا سراغ' پیغام آفاقی کے 'پلیتہ' احمد صغیر کے 'دروازہ ابھی بند ہے' شموئل احمد کے 'مہاماری' شفق کے 'بادل' کابوس' اور محمد علیم کے 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' میں خوف و دہشت کی وہ فضا بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے جو ناانصافیوں کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔

مہاماری، پلیتہ، میرے نالوں کی گمشدہ آواز کا موضوع بنیادی طور پر ملک کی موقع پرست اور قابل مذمت سیاست ہی ہے۔وہ سیاست جس نے دفتر شاہی، بدعنوان پولس اور انتظامیہ سے ہاتھ ملا کر ایک ایسا سسٹم پیدا کر دیا ہے جس سے نکلنا کسی ایماندار فرد کے لیے محال ہے۔ان ناولوں کے کردار ایک طرف مفاد پرست لیڈروں کی آئینہ داری کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ہماری مشترکہ تہذیب نیم جاں ہو چکی ہے اور سیاست اور مذہب کا گٹھ جوڑ اِس تہذیب کی پروردہ ایک پوری نسل کو بے ضمیر بنانے پر آمادہ ہے۔فرقہ واریت سیاست کو کیسے طاقتور بناتی ہے، تحریک کیسے گھٹنے ٹیک دیتی ہے، ہتھیلیاں کیسے عزائم خریدتی ہیں اور جنسی استحصال کس طرح سرور بخشتا ہے، ان سب کو شموئل احمد نے بڑی سچائی اور بے باکی

سے 'مہاماری' میں پیش کیا ہے تو فیمنزم، مارکیٹ اکانومی، گلوبلائزیشن، کرپشن، کارپوریٹ کلچر، پولرائزیشن، لاقانونیت، بدامنی اور ذہنی دیوالیہ پن کی واضح تصویریں پیغام آفاقی نے 'پلیتہ' میں پیش کی ہیں۔ 'میرے نالوں کی گمشدہ آواز' میں بھی انہیں حقائق پر نظر ڈالی گئی ہے مگر بہار کے ایک چھوٹے سے شہر کے حوالے سے جو آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کی کہانی بن جاتی ہے۔

اس دور کی پیچیدہ سیاست اور نئی صدی میں مسلمانوں کی صورت حال پر قدرے وسیع کینوس کے ساتھ مشرف عالم ذوقی اور شفق نے بھی لکھا ہے۔ شفق نے 'بادل' میں موجودہ عہد کے مسلمانوں کی بے چینی اور عالمی سطح پر جنگ اور فساد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے پیدا شدہ مسائل و نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہوئے حملہ سے شروع ہوتا ہے اور اس ہیبت ناک حادثے کی تفصیل ٹی وی پر دیکھتے ہوئے لوگوں کے مختلف خیالات پر نظر ڈالتا، ہندستانی مسلمانوں کی زندگی اور ان کے موجودہ رویے کو ٹٹولتا آگے بڑھتا ہے۔ اِس حادثے نے مسلمانوں کو جس فکر اور اندیشے میں مبتلا کر دیا اور جن سوالات سے انہیں جوجھنا پڑا، ناول ان کا جائزہ بڑے مدلل انداز میں لیتا ہے اور حملے کے بعد مسلمانوں کو درپیش مسائل کو بڑے کرب اور دکھے دل سے پیش کرتا ہے۔ یہ موضوع ایسا تھا کہ ناول خبروں کا پلندہ بن جاتا مگر مصنف نے شعور کی پختگی اور فنکاری سے کام لے کر اسے ناول ہی بنائے رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

''دی وار جرنلس'' میں صلاح الدین پرویز نے بھی امنِ عالم کو درپیش خطرات کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کا تانا بانا عراق، افغانستان، اور پاکستان کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں رونما ہونے والے مختلف حادثات و واقعات سے بُنا گیا ہے۔ اس میں اس دور کی مختلف سیاسی شخصیات مثلاً جارج ڈبلیو بش، ٹونی بلیئر، پرویز مشرف، صدام حسین، اسامہ بن لادن اور ملا عمر کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ داستانوی اسلوب میں لکھے گئے اس ناول کا ایک اہم کردار شہرزاد ہے جو موجودہ حالات پر نہایت بے باک اور بے خوف تبصرہ کرتی ہے۔ اس ناول میں گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ کا ذکر ہے اور امریکی hypocricy، جارحیت، اور انسانیت سوز مظالم پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ اس میں وہاں کی معیشت، سیاست اور انتظامیہ پر یہودی لابی کی گرفت اور امریکہ کو کٹھ پتلی کی طرح اپنے اشاروں پر نچانے کی صورت حال بھی واضح کی گئی ہے، مگر ساتھ ساتھ گجرات

فسادات اور پارلیمنٹ پر دہشت گردانہ حملہ وغیرہ مختلف واقعات بھی موضوع بنائے گئے ہیں۔

مشرف عالم ذوقی کو موضوعاتی ناول لکھنے میں مہارت حاصل ہے۔وہ بے باکی اور نڈرتا سے دیش ،سماج ،معاشرے ،تہذیب وتمدن اور انسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بلکہ اس کرب کو دل میں اتار لیتے ہیں،اور پھر ان کا قلم اپنے موضوع کے ساتھ بھرپور طریقے سے انصاف کرتا ہے،اسی لیے ذوقی کے یہاں موضوعاتی تنوع بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔گذشتہ صدی میں بیان،شہر چپ ہے اور ذبح جیسے ناول پیش کرنے کے بعد نئی صدی میں بھی وہ پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان وایا سونامی، لے سانس بھی آہستہ،آتش رفتہ کے سراغ اور نالہ شب گیر جیسے کئی ناول ہمیں دے چکے ہیں۔'پوکے مان کی دنیا' نئی نسلوں اور نئی تہذیب کی افسوسناک تصویریں پیش کرتا ہے، جہاں فلم،ٹی وی،کمپیوٹر اور کارٹون بچوں کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اور ایک نئی صارفیت زدہ،ہوس کی اجارہ داری کرنے والی تہذیب پیدا کررہے ہیں۔ناول میں ذوقی کا اصل Concern بچے ہیں، جو فنتاسی اور رئیلیٹی کے بیچ پھنس کر ریپ جیسے حادثے انجام دے رہے ہیں۔پوکے مان کارڈز،کارٹون اور ویب سائٹس بچوں سے ان کا بچپن چھین رہے ہیں۔فنتاسی کے غلط استعمال پر ذوقی کا غصہ آتش فشاں بن جاتا ہے اور وہ اپنا سارا زور قلم اپنی تہذیب اور بچوں کی معصومیت کو بچانے میں صرف کردیتے ہیں۔'پروفیسر ایس کی عجیب داستان (۲۰۰۵) میں بھی ذوقی نے موجودہ عہد کی سماجی ،سیاسی ،مذہبی اور فکری ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے،مگر اس کا ذمہ دار'وقت' کو بنایا ہے، جو بھیانک طوفان سونامی کی طرح ہماری قدروں،تہذیبوں،ثقافتوں اور ایمانداریوں کو بہالے جارہا ہے۔'لے سانس بھی آہستہ'تہذیب کے ٹوٹنے،بکھرنے کی ایک اور داستان پیش کرتا ہے،جس میں تین نسلوں کے سفر نے تین تہذیبوں کا راستہ طئے کیا ہے۔عبدالرحمن کاردار،اس کے آباؤ اجداد اور اس کے بعد کی نئی نسل۔تہذیب کے زوال سے سماج کا چہرہ کس حد تک کریہہ ہوسکتا ہے اس کی بھیانک تصویر مصنف نے'لے سانس بھی آہستہ'میں پیش کی ہے۔

'آتش رفتہ کا سراغ' آزادی کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی آپ بیتی یا سرسٹھ سالہ دردناک تاریخ ہے۔اس میں شروع سے آخر تک ذوقی نے اپنے سینے میں جلنے والے درد وکرب کی اس آگ کو انڈیلا

ہے جوانہیں جلا رہی تھی۔ ۲۷۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ۲۰۰۸ تک کے وہ واقعات ہیں جن میں مسلمانوں کو اس انداز سے دہشت زدہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہی ملک میں خود کو غریب الوطن سمجھنے لگے۔ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر اس کی سب سے بڑی مثال تھی۔ مسلمانوں کا مذہبی لباس، داڑھی، ٹوپی، اُن کے دہشت گرد ہونے کی علامت بنا کر انہیں بدنام کیا جانے لگا۔ ناول کا دوسرا حصہ اس زمانے کو پیش کرتا ہے، جب بابری مسجد رام مندر ایودھیا کی تحریک چل رہی تھی اور فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے درمیان نفرت کی تخم ریزی کر رہے تھے، جبکہ تیسرا حصہ ۲۰۱۰ کے بعد کے مسلسل واقعات کو ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ ان کا ناول 'مرگ انبوہ' بھی اس سلسلے کی تازہ کڑی ہے۔ ذوقی کے یہ تمام ناول اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کے یہاں احتجاج کا ایک ایسا انداز ملتا ہے جو دور حاضر کے بہت کم ناول نگاروں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود انہوں نے کوئی حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لایا بلکہ آئینہ دکھا کر ایک سوالیہ نشان ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ جھنجھلائیں، غصہ کریں، خاموش رہ جائیں یا سرگرم عمل ہو جائیں۔ تقسیم ہند سے لے کر آج تک سیاست کے سبب ہماری زندگی اور تہذیب پہ نشیب و فراز آتے رہے ہیں اور بجلیوں کی زد پہ ہمارا آشیانہ مسلسل رہا ہے اس لیے صدائے احتجاج بلند ہونا ایک فطری امر ہے۔ مگر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذوقی کی صدائے احتجاج دوسروں کی آواز سے قطعی مختلف اور زیادہ موثر ہے۔

جوگندر پال نے بھی اپنے ناول ''پار پرے'' میں ہندوستانی تاریخ و تہذیب اور سیاسی منظر نامے کو نہایت خوبی سے سمیٹا تھا مگر ایک مخصوص عہد اور مخصوص ماحول کے تناظر میں۔ اس میں کالا پانی کے نام سے مشہور انڈمان نیکو بار کے سیلولر جیل کے قیدی رہائی کے بعد بھی اپنی محبت، انسان دوستی اور بھائی چارے کے رشتے کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی بقیہ زندگی بھی وہیں ایک ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کی بنائی اس دنیا میں نفرت، عداوت اور تعصب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ لیکن اچانک قومی سیاست میں فرقہ واریت کے بڑھتے طوفان کے اثرات وہاں کے لوگوں کی پرسکون زندگی پر بھی پڑتے ہیں۔ بعض فرقہ پرست عناصر انھیں مذہب کے نام پر بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو پاتی۔ یہ مثالی معاشرہ ان لوگوں کا بنایا ہوا ہے جو دنیا کی نظروں میں مجرم ہیں۔ یہ ہمارے مہذب معاشرے پر ایک بلیغ طنز ہے۔ ساجدہ زیدی کے

ناول ''مٹی کے حرم'' میں بھی کسی قدر فنکاری کے ساتھ تقسیم کے سانحے، یاد ماضی، خواب اور شکستِ خواب، زندگی کی تلخ حقیقتوں، وقت کے جبر اور بے بسی ومحرومی کو موضوع بنایا گیا ہے۔

اکیسویں صدی میں تسلسل کے ساتھ ہمیں ناول دینے والے ایک اہم ناول نگار غضنفر بھی ہیں۔انہوں نے وش منتھن، شوراب اور مانجھی کی صورت میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر ناولوں میں تنوع پیدا کیا ہے۔غضنفر کا آزمودہ اسلوب اور مخصوص طریق کار استعاراتی، علامتی اور تمثیلی رہا ہے۔'وش منتھن' میں انہوں نے ہندو مسلم تعلقات، اختلافات اور تصادمات کو اپنے آزمودہ استعاراتی، تمثیلی اور شعری اسلوب ہی میں برتا ہے۔جبکہ 'شوراب' حیرت انگیز طور پر واضح بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔اس کے بعد 'مانجھی' میں پھر وہ اپنے استعاراتی اور علامتی طرز اظہار کی طرف واپس لوٹ گئے ہیں۔'مانجھی' کا ہیرو وی۔این رائے اپنے رشتے کے بھائی کے گھر الٰہ آباد آتا ہے۔دونوں بھائی کے نظریات وخیالات میں تضاد ہے۔وی۔این رائے سنگم کی سیر کے لیے جس ناؤ کا انتخاب کرتا ہے اس کے مانجھی کا نام ویاس ہے۔یہ ناول وی۔این رائے اور مانجھی ویاس کے مکالموں پر مبنی ہے۔ان دونوں کی گفتگو میں آج کی دنیا کے حالات، مذہب، سیاست، ہندو صنمیات اور مختلف معاشرتی مسائل بھی آتے ہیں۔اس ناول میں واقعات قصے کی شکل میں نہیں آتے بلکہ سارے واقعات، مشاہدات یا تصورات کی شکل میں آتے ہیں۔غضنفر تجربہ پسند ذہن رکھتے ہیں، انہوں نے سابقہ ناولوں کی طرح اس میں بھی اشاراتی اسلوب کا تجربہ کامیابی کے ساتھ برت کر فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔'شوراب' مانجھی سے قبل شایع ہوا مگر مانجھی سے زیادہ مقبول ہوا۔اول تو اپنے واضح بیانیہ اسلوب کی وجہ سے اور دوم موضوع کی ندرت کے سبب۔'شوراب' کے حوالے سے مصنف نے تلاش رزق میں دربدری یا ہجرت کو موضوع بنایا ہے۔اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نوکری حاصل کرنے میں ناکام رہنے والے نوجوان خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں اور وطن سے دوری، نت نئے مسائل کو جنم دیتی ہے۔وہ زندگی بھر اپنے کرب کی آگ میں تنہا جلتے ہیں اور خوبصورت تحفے عزیزوں یا دوستوں کی نذر کرتے ہوئے یہ تمنا ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں کے چھالے بھی کوئی دیکھ لیتا۔جیسا کہ میں نے عرض کیا غضنفر، اپنے استعاراتی اور علامتی طرز بیان کے لیے مشہور ہیں مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے یہ ناول پوری طرح بیانیہ میں لکھا ہے۔یہ الگ بات ہے

کہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر غیر ضروری طور پر بعض تمثیلی قصوں کو بھی کہانی کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں ایک اور چیز بار بار نگاہوں میں چبھتی ہے، وہ ہے جنسیت کا غلبہ۔ کئی مقام پر سستی جذباتیت، بیانیہ کی عریانیت اور جزئیات نگاری غیر ضروری طور پر در آئی ہیں۔ اسی موضوع پر احمد صغیر کا ناول 'ایک بوند اجالا' بھی قابلِ قدر ہے جس میں مصنف نے تخلیقی سطح پہ کمال کی بنت اور فنکاری سے کام لیتے ہوئے اس عورت کی بغاوت کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا شوہر اسے چھوڑ کر عرب ملک میں روزی کمانے گیا ہوا ہے۔ کسی کمزور لڑکی کے لیے اس اذیت کو سہ جانا شاید آسان ہوتا ہو، لیکن عام طور پر پڑھی لکھی لڑکیوں میں تکلیف دہ تنہائی، جسمانی و روحانی اذیت اور گھٹن سے گھبرا کر بغاوت کا مادہ سر اٹھانے لگتا ہے، اور یہی اس ناول کی ہیروئن کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اُس ایک بوند اجالے کے لیے بغاوت کرتی ہے۔ ناول میں مذہب بھی ہے اور نئی تہذیب بھی۔ اور انسانی فطرت کے حوالہ سے بغاوت کا منظر نامہ بھی۔ مصنف نے بڑی خوبصورتی سے اس نازک موضوع کو برتا ہے اس لیے انسانی نفسیات کی مختلف پرتیں ہمیں ایک منجھے ہوئے فنکار کی طرح دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ احمد صغیر 'جنگ جاری ہے' اور 'دروازہ بند ہے' میں اکیسویں صدی کے ہندستان اور مسلمانوں کی لرزہ خیز داستان سنا کر قارئین کے دلوں میں جگہ بنا چکے تھے، اِس ناول کے ذریعہ انہوں نے موضوع بدل کر ہمیں اپنی فنکاری سے روشناس کرایا ہے۔

آخر میں تین، چار ناولوں کا اور ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن میں نئی صدی اور نئی تہذیب میں عورتوں کی پوزیشن، ان کے استحصال اور پدرانہ نظامِ معاشرت کے جبر کا بیان ہے۔ پہلا ناول اختر آزاد کا ''لیمینیٹڈ گرل'' ہے جو سب سے پہلے ہمیں اپنے نئے موضوع کی وجہ سے متوجہ کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی صارفیت نے ہر شئے کو بازار کا سامان بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ 'عورت' بھی اب گوشت پوست کے بجائے پلاسٹک کوڈیڈ چمچماتی ہوئی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ عورت کو اس مقام تک لانے میں جہاں اس کی اپنی بے راہ روی، فیشن اور دولت کی فراوانی کا ہاتھ رہا ہے وہیں فلموں اور ٹی وی پروگراموں نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اختر آزاد نے بڑی فنکاری سے اِس ناول میں ایک ماں کو اپنی بیٹی کو ٹی۔ وی کے رئیلیٹی شوز کے لیے تیار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ شوبھا اپنی بیٹی کو ٹریننگ سے سلیکشن اور پھر کامیاب T.V.Face بنانے کے لیے ہر جائز و

ناجائز امتحان سے گزرتی ہے۔یہی نہیں وہ بیٹی کے ذہن میں بھی سرایت کر دیتی ہے کہ شہرت، دولت اور سماجی status کے لیے ہر کام جائز ہے۔ماں بیٹی شہرت کی بلندیاں تو پالیتی ہیں مگر بالآخر وہی ہوتا ہے جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔اس کے باپ ڈاکٹر کپل کی مثبت فکر بہر حال فتح حاصل کرتی ہے۔مصنف نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ناول کا اختتام کیا ہے جس سے قاری کے ذہن پر واضح تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایسے ریلیٹی شوز معاشرے میں متعدد برائیوں کو جنم دینے کا سبب بن رہے ہیں۔

اکیسویں صدی میں خواتین کے تین ناول برف آشنا پرندے، کہانی کوئی سناؤ متاشا اور عندلیب بر شاخ شب قارئین کی سنجیدہ توجہ کا مرکز بنے۔ترنم ریاض کا ایک ناول 'مورتی' کے عنوان سے شایع ہو چکا تھا، جس میں انہوں نے ازدواجی زندگی کے مسائل اور ناکام ازدواجی زندگی کے اسباب کو موضوع بنایا تھا۔یہ ناول پیش کش کے سپاٹ پن کی وجہ سے بہت زیادہ مقبول نہیں ہو سکا۔مگر ۲۰۰۹ میں شایع ہونے والا ان کا ضخیم ناول ''برف آشنا پرندے'' نسبتاً زیادہ پسند کیا گیا۔اس ناول کی سب سے بڑی خوبی کشمیر کی معاشرتی، سماجی اور تہذیبی پیش کش ہے جس کی تفصیل اور باریک جزئیات کشمیر سے ناواقف قاری کو نہ صرف متحیر کرتی ہے بلکہ ایک نئی دنیا اور نئی ثقافت سے متعارف کراتی ہے۔طرز رہائش سے دسترخوان کی تفصیلات تک ہر گوشے کو بڑی وضاحت اور سچائی سے پیش کیا گیا ہے۔وہاں کی سیاست اور مسائل پر گفتگو کم کم ہے، تہذیبی تاریخ کی پیش کش پر زیادہ زور ہے۔

صادقہ نواب سحر کے ناول ''کہانی کوئی سناؤ متاشا'' نے مقبولیت کی سرخیاں خوب بٹوریں۔اس ناو ل کا موضوع عورت کا استحصال ہے۔موضوع کوئی نیا نہیں مگر خود عورت کی زبانی عورت کے استحصال کی طویل داستان جس باریک بینی، تفصیل اور دردمندی سے بیان کی گئی ہے وہ اسے Readable بنا دیتی ہے۔ ناول کا مرکزی کردار متاشا پورے ناول پر چھائی ہوئی ہے، اور چونکہ کہانی اسی کے ارد گرد گھومتی رہتی ہے اس لیے وہ قاری کے دل و دماغ میں بھی گردش کرتی رہتی ہے۔مصنفہ نے ایک عورت کے کرب والم اور اس کی بے بسی کو ایسی پر اثر زبان میں پیش کیا ہے کہ اس کی مظلومیت قاری کے دل کو اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیتی ہے اور قاری ناول ختم کرنے کے بعد بھی اس کے درد کو بہت دیر تک اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے۔یہی مصنفہ کی کامیابی ہے۔

شائستہ فاخری کا پہلا ناول ''نادیدہ بہاروں کے نشاں'' کتابی صورت میں شایع ہونے سے پہلے ہی مقبول ہو چکا تھا۔اس میں بھی عورت کی مظلومیت اور بے بسی کو ہی موضوع بنایا گیا ہے جو مرد کی خودغرضی، انانیت اور بے دردی کا نتیجہ ہے۔مصنفہ نے ایک نازک مسئلے (حلالہ) کو بڑی بے باکی اور سچائی کے ساتھ اس ناول میں برتا ہے۔یہ ناول نہ صرف عورت کی ناقدری، مظلومی اور اس کے جذبۂ ایثار کو پیش کرتا ہے بلکہ مردوں کو ان کے جابرانہ رویے کے تعلق سے دعوت احتساب بھی دیتا ہے۔ناول کے مرکزی کردار علیزہ کا درد یہ ہے کہ اس نے دو مردوں کے آگے خود کو برہنہ کیا، دونوں مرد اس کے اپنے تھے اور وہ دونوں بھی عریاں تھے۔علیزہ اپنے شوہر کے شک اور تنگ مزاجی سے اپنی ذات میں محصور ہو جاتی ہے اور ایک دن تقدیر اسے اپنے دیور کے ساتھ حلالہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔اس کا دماغ دو حصوں میں منقسم ہے، ناف کے اوپر کے حصے پر دماغ کی حکمرانی ہے تو ناف کے نیچے بھوگ کی۔تکمیلیت کہیں نہیں ہے۔ناول ایک بڑا سوال اٹھاتا ہے کہ اگر خطا کار مرد ہے تو سزا عورت کیوں جھیلے؟ ہمارے معاشرے کا یہ مسئلہ بہت نازک تھا مگر شائستہ فاخری نے اسے بڑی سنجیدگی سے برتا ہے۔مذہبی احکامات کے نرغے سے نکلنے کے بعد علیزہ جو فیصلہ لیتی ہے وہ عورت کی آزادی کا اعلامیہ ہے۔ناول کی زبان اور پیش کش پہلے ہی ناول سے مصنفہ کی فنکاری اور فن پر دسترس کا اعلان کر دیتی ہے۔شائستہ نے دوسرا ناول ''صدائے عندلیب برشاخ شب'' لکھ کر اہل فن سے اپنی فنکاری پر مہر تصدیق بھی ثبت کروالی۔سترہ ابواب پر مشتمل یہ ناول نادیدہ بہاروں کے نشاں کے مقابلے میں وسیع کینوس، کثیر کردار اور اجتماعی شعور و لاشعور کے ڈھیر سارے رنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔موضوع عورت ہے کہ نازنیں سے ستارہ تک زیادہ تر کردار جو کہانی میں اہم رول ادا کرتے ہیں عورت ہی ہیں۔ایک طرف خوش حال اور امیر طبقہ ہے تو دوسری طرف جھونپڑی میں رہنے والا مفلوک الحال طبقہ۔مصنفہ کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے دونوں طبقات کی زندگی اور درد و الم جیسی کیفیات کو سلیقے سے پیش کیا ہے۔زندگی کی رفتار اور اس میں انسان کے مختلف رنگ کو ناول اس طرح پیش کرتا ہے کہ ایک طرف تجسس جاسوسی ناولوں جیسی دلچسپی پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف زندگی کے المیہ اور طربیہ رنگوں کی تفصیلات ہمیں فلسفیانہ حقائق سے آشنا کراتی ہیں۔بحیثیت مجموعی یہ ناول کئی افراد، کئی طبقات کی زندگی، اور زندگی کا تجربہ پیش کرنے میں کامیاب ہے اور جہاں کہیں مصنفہ کا تجربہ فلسفہ بن جاتا ہے

ناول ایک نئی بلندی حاصل کرلیتا ہے۔مسرت کی بات یہ ہے کہ ناول میں یہ مقامات کثرت سے آئے ہیں۔چنانچہ موضوع، پیش کش، کردانگاری، فلسفہ، حقیقت نگاری اور زبان کی تخلیقیت کے اعتبار سے اردو کے نئے ناولوں میں صدائے عندلیب برشاخ شب کوایک عمدہ، معنی خیز اور فکر انگیز اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ تینوں ناولوں سے قبل ثروت خان کا ناول اندھیرا پگ'' شایع ہوکر مقبول ہو چکا تھا اور ثروت خان اپنے پہلے ناول سے ہی ہم عصر اردو ناول میں اپنی شناخت مستحکم کر چکی تھیں، مگر اس کا موضوع اور پس منظر قدرے مختلف ہے۔اندھیرا پگ کا موضوع بیوہ عورت کی زندگی ہے جو ظاہر ہے نیا نہیں ہے اور نہ پہلی مرتبہ کسی ناول میں برتا گیا ہے مگر اسے جس خاص راجستھانی پس منظر میں برتا گیا ہے وہ پس منظر اسے اہم بنا دیتا ہے۔جو حقائق یہاں پیش کیے گئے ہیں وہ حقائق اسے اہم بناتے ہیں اور ہماری نظروں سے اوجھل جس تہذیب، کلچر اور نظام کو نہایت کھلے بندھے انداز میں دکھایا گیا ہے وہ نظام اور کلچر اس ناول کو معتبر اور منفرد بناتا ہے۔ناول میں مختلف قسم کے کردار ہیں۔ہر کردار کے دامن میں کھونے، لٹ جانے، مرنے، مٹنے کی ان گنت داستانیں ہیں۔سب خوں آشام، ہر چہرہ الجھا ہوا، ہر کردار کا جگر چھلنی۔یہ سب مل کر ہمیں راجستھان کے مختلف کلچرز کی ان گنت زمینی حقیقتوں سے روبرو کراتے ہیں۔یہاں واقعات جس قدر زیادہ ہیں اشارات ان سے بھی زیادہ۔پورا ناول جذباتی اور ذہنی کشمکش کی بھٹی میں کھولتا رہتا ہے۔بکھراؤ اور تعمیر، ظلم اور احتجاج دونوں مرحلوں میں یہ بھٹی کبھی بجھتی نہیں۔اس لیے قاری ایک بے چین روح کی طرح ناول نگار کے اشارے پر جیتا مرتا رہتا ہے۔یہ اضطراب، بے چینی، خواب، حقیقت کا گھماسان، آسمان میں اڑنے کی چاہت اور پنجرے میں قید ہونے کی مجبوری۔یہی اس ناول کا اصل کرب ہے اور المناک حقیقت۔مصنفہ اس حقیقت کی تصویریں ایک فوٹو گرافر کی طرح اتارتی ہیں اور قاری تک پہنچاتی ہیں۔اس تصویر کشی میں ان کے اندر کا فنکار تمام واقعے، حادثے اور المیے پر بہت خاموشی کے ساتھ اپنا احتجاج درج کراتا رہتا ہے۔یہ احتجاج ہی ''اندھیرا پگ'' کا مرکزی نقطہ ہے جو ناول کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔

طالب علموں کی زندگی اور موجودہ مسابقتی دور کے حالات پر خواتین کے دو ناول منظر عام پر آئے، جن میں ایک نسترن احسن فتیحی کا ''لفٹ'' اور دوسرا نیلوفر کا ''اوڑم لین'' ہے۔''لفٹ'' میں ایک نہایت اہم مسئلے

کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔آج کے مسابقتی دور میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہر آدمی چور دروازے کی تلاش میں ہے۔ چنانچہ نوکری حاصل کرنی ہو یا کسی دفتر میں کوئی کام کرانا ہو، ہر جگہ اسی کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ نتیجتاً مستحقین کی حق تلفی ہوتی ہے اور غیر مستحق افراد ان مقامات یا عہدوں تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جن کے وہ اہل نہیں ہوتے۔ ناول میں 'لفٹ' کو اسی شارٹ کٹ کے استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار اجے ورما جہاں اپنی محنت اور لگن سے کامیابی حاصل کرتا ہے وہیں نیک رام شارٹ کٹ کے ذریعے ایک کلرک سے یونیورسٹی کے اعلیٰ عہدے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ باصلاحیت افراد در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور غیر مستحق لوگ اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز ہو رہے ہیں۔

اپنے موضوع کی ندرت کے سبب نیلوفر کا پہلا ناول 'اوٹرم لین' بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے جس میں مصنفہ نے یو پی ایس سی کی تیاری کرنے والے طلبہ کے جد وجہد، کوچنگ انسٹی چیوشنز کی لوٹ کھسوٹ، اور ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے فرسٹریشن کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر چہ یہ ناول فنی طور پر ادب میں جگہ بنانے میں ناکام رہا مگر قدروں کی پامالی اور تہذیب کے زوال سے الگ نئی صدی میں لکھنے والے نئے موضوعات کی طرف جس طرح راغب ہو رہے ہیں اس کا اشاریہ ضرور ہے۔ مجھے عورتوں کے ناول اور عورت کے مسئلے بات کرتے ہوئے دو ناول اور یاد آرہے ہیں۔ آشا پربھات کا ''دھند میں اُگا پیڑ'' اور افسانہ خاتون کا ''دھند میں کھوئی ہوئی روشنی''۔ گرچہ ان دونوں کے موضوعات براہ راست تانیثیت کی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے مگر عورتوں کے استحصال، معاشرتی جبر اور عورتوں کے اضطراب سے ان کا تعلق ضرور ہے۔ عورت کے اندر پھوٹنے والے سب سے خوبصورت جذبے پر خود عورت کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تو محبت کی مٹی سے گندھا ہوتا ہے مگر پدرانہ سماج میں عورت کو ہی مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ ''دھند میں اگا پیڑ'' ایک شادی شدہ عورت کی داستان ہے جس میں اس کا خود غرض، شاطر اور منصوبہ بندی کے ساتھ جرم کرنے والا شوہر نہ صرف پیش قدمی کرتا ہے بلکہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر حال میں عورت ہی مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے۔ آشا پربھات نے شادی شدہ عورت کے عشق اور مرد و عورت کے رشتوں پر سادگی کے ساتھ عمدہ کہانی بیان کی

ہے۔جبکہ افسانہ خاتون نے اپنے ناول میں شالینی ،سنتوش اور سمیر سے جو تکون تیار کیا ہے،اس کے ذریعہ ازدواجی رشتے کے کھوکھلے پن اور تشنگی کے درمیان عورت کی ذہنی وجذباتی کشمکش کو بخوبی بیان کر کے اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے،مگر ناول کے آخری حصے میں کلائمکس اور اینٹی کلائمکس کے مابین عجلت پسندی نے فنی سا لمیت کو نقصان پہنچایا ہے۔عورتوں کے ایسے ہی چند ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ ''عورتوں کا اضطراب فطری ہے مگر ہمیں آج بھی اردو ناول میں اس نسوانی کردار کی تلاش ہے جو مرد کی صرف شکایت نہ کرے بلکہ ان کے سامنے سوالیہ نشان کی صورت میں ابھرے''۔میرا خیال ہے کہ مشرف عالم ذوقی کا نیا ناول ''نالہ ؟ شب گیر'' نہ صرف اُن کے سوال کا جواب ہے بلکہ اُس نسوانی کردار کو بھی پیش کرتا ہے جس کی تلاش اردو ناول کے ناقدوں کو رہی ہے۔ناہید اس ناول کا وہ کردار ہے جس نے نہ صرف ظلم سہنے سے انکار کیا بلکہ برسوں کی تذلیل کا بدلہ لینے کی بھی ٹھان لی۔جو نہ صرف اپنی سوچ بدل لیتی ہے بلکہ اِس نئی صدی کو بدل دیتی ہے۔اردو ناول نے آج تک ممتا،قربانی اور محبت کے جذبوں سے بھرپور عورت کو ہی دکھایا تھا،ذوقی نے ہمیں وہ عورت دکھایا ہے جس کے اندر ہر غلط نگاہ کو نوچ لینے کی ہمت ہے۔ذوقی نے ایک نئی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو مردوں سے کسی طرح کمتر نہیں۔بلکہ جس نے کمال ہشیاری سے مردوں کو ہی عورت بنا دیا ہے۔بلاشبہ یہ ناول فیمنزم کے حوالے سے نہ صرف ایک نئی سوچ کے ساتھ فکر واحساس کے نئے دریچے وا کرتا ہے بلکہ ذوقی کی ناول نگاری کی نئی اور کامیاب جہت سے آشنا کراتا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی کے ضخیم ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا مطالعہ کئی جہتوں سے کیا گیا۔کسی نے اسے تاریخی،کسی نے نیم تاریخی،کسی نے تہذیبی اور کسی نے غیر ناولانہ تحریر کا نام دیا۔مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ خواہ کسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کریں اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔میں اسے تہذیبی ناول سمجھتا ہوں،جس میں مصنف نے انیسویں صدی کی ہند اسلامی تہذیب،معاشرت،ادب اور ثقافت کی بھرپور مرقع کشی کی ہے۔اکیسویں صدی میں جب ہماری دنیا تہذیبی اور معاشرتی سطح پر بالکل بدل چکی ہے،انیسویں صدی کی تہذیب دیکھ کر حیرت انگیز خوشی اور استعجاب کی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ناول کی طوالت عام قاری کو گراں گزر سکتی ہے،مگر مصنف نے وزیر خانم کے خاندان کی کڑیاں ملانے کے لیے جو تفصیلات پیش کی ہیں،تاریخی مآخذات سے جس طرح استفادہ کیا ہے،اور تہذیبی زندگی کی پیش کش میں جیسی جزئیات نگاری کی

ہے، یہ ناول کو نہ صرف مطالعیت سے بھرپور بناتی ہے بلکہ مصنف کی انیسویں صدی کی زبان وتہذیب سے واقفیت کا اعتراف بھی کرواتی ہے۔اس ناول کی ادبی اہمیت کا اعتراف کیا جائے یا انکار کیا جائے، اتنا تو طے ہے کہ اردو ناول کی تاریخ اس کے بغیر مکمل نہیں ہو سکے گی۔

رحمان عباس ہم عصر ناول کی دنیا میں اپنے دستخط سے معتبر ہو چکے ہیں۔ان کے تین ناول نخلستان کی تلاش، ایک ممنوعہ محبت کی کہانی اور خدا کے سائے میں آنکھ مچولی عوامی اور ادبی دونوں حلقوں میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔نخلستان کی تلاش کشمیر کے شورش زدہ حالات اور ہندستانی سماج میں بڑھتی ہوئی فسطائیت کا احاطہ کرتا ہے۔اس میں نئی نسل اور نوجوان طبقے کو خصوصی طور پر نگاہ میں رکھا گیا ہے جن کے ذہن ودماغ پر ایسے حالات اور سیاسی جبر کا نفسیاتی اثر سب سے زیادہ پڑ رہا ہے۔ناول اپنے گٹھے ہوئے پلاٹ اور تخلیقی بیانیہ کے سبب قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔رحمان عباس کا دوسرا ناول 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' محبت کے ایک پرلطف، پرسوز اور دلچسپ قصے پر محیط ہے، جس کے حوالے سے مذہبی شدت پسندی، مسلکی منافرت اور ہندستانی مسلمانوں میں تفریق وذہنی پسماندگی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔کونکنی تہذیب ومعاشرت کا پس منظر بھی اس کہانی کو نیاپن اور دلچسپی عطا کرتا ہے۔تیسرا ناول 'خدا کے سائے میں آنکھ مچولی' انسانی نفسیات اور انسانی سرشت کے مطالعے کا خوبصورت اظہار ہے۔اس کا مرکزی کردار عبدالسلام اپنی آوارہ مزاجی، آشفتہ حالی اور پراگندہ خیالی کے باوجود اپنی قربانی کے سبب قاری کی ہمدردی حاصل کر لیتا ہے۔اس میں مصنف نے تکنیک اور اسلوب کے تجربات بھی کئے ہیں، اس لیے اسلوب واظہار کی سطح پر یہ ناول ماقبل ناولوں سے زیادہ متوجہ کرتا ہے۔رحمان عباس کا قلمی سفر ابھی تیزی سے جاری ہے۔''روحزن'' کے عنوان سے جو نیا ناول آیا، اس نے ساہتیہ اکادمی انعام بھی حاصل کر لیا ہے۔مگر اس پر ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری ہے، جلد ہی ایک الگ مضمون میں حتمی رائے قائم کی جائے گی۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ اُن ناولوں کا بھی کچھ ذکر کر دوں جو ابھی ابھی زیر مطالعہ رہے ہیں۔ان میں سب سے پہلا ناول معروف فکشن نگار حسین الحق کا ہے۔طویل گیپ کے بعد حسین الحق کا نیا ناول ''اماوس میں خواب'' (۲۰۱۷) آیا جو ایک بڑے کینوس پر لکھا گیا ہے۔اس میں آزادی کے بعد کی

سیاسی ،سماجی صورت حال بھی ہے اور مسلمانوں کی زندگی میں پیش آئے تغیرات و انقلابات بھی۔تعلیم کی کساد بازاری بھی ہے اور سیاست کی عیاری بھی۔اس میں بھیونڈی، مالیگاؤں، بھاگلپور، بابری مسجد، گجرات، لو جہاد، گئو رکچھا سب کچھ موجود ہے اور ان سب کو خوبصورتی سے قارئین تک پہنچانے کے لئے اسماعیل، قیدار، نائلہ اور رمیش جیسے مضبوط کردار بھی تراشے گئے ہیں۔آزادی کے بعد سے اب تک کی ہندستانی تاریخ کو ایک سیکولر اور غیر جانبدار نقطہ نگاہ سے دکھانے کے لئے ایک بڑے کینوس اور ہزاروں صفحات کی ضرورت تھی مگر حسین الحق نے ایک ماہر فنکار کی طرح استعارے، تمثیل اور علامت کی زبان دے کر بڑی خوبی سے ۳۴۷ صفحات میں سمیٹ دیا ہے۔یہاں ماضی اور اس کی قدریں، اسلاف کی تہذیب، مشترکہ ثقافت خواب کی صورت جلوہ گر ہوتی ہیں جسے تعبیر کی صورت میں اسماعیل سے نائلہ تک تین نسلیں پانا چاہتی ہیں، مگر کیا کیجے کہ ملک نے اپنے اوپر نفرت، سیاست اور دشمنی کے اماوس کی وہ چادر تان رکھی ہے کہ تعبیر کا چاند نکل ہی نہیں پاتا۔حسین الحق نے اس ناول میں بیانیہ کا خوبصورت استعمال کیا ہے۔اس کا ڈکشن استعارے اور تمثیل کو نئی جہتیں دیتا ہے اور بیانیہ کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔بیانیہ کی صرف ایک مثال دیکھئے:

> ''وہ آرہی ہیں۔۔۔ایک وہم سا ہوا۔۔۔کہیں نظر نہیں آرہی تھیں مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آرہی ہیں۔برف یا روئی کے گالے سے تیار کی ہوئی فضا میں سنہرے گل بوٹے ٹکے ہوئے تھے اور جگنو؟وں کو حکم دیا گیا تھا کہ تم سارے میں جگمگاتے پھرو اور چاند نے منادی کی تھی کہ ابدالآباد تک میں اس فضا پر چاندنی بکھیروں گا اور غیب الغیب سے ایک فرمان جاری ہوا تھا کہ سورج اپنی تپش کو اس جلسے سے دور رکھے۔الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے، جہاں حوران بہشتی کا مجمع دف پر گا تا تھا۔۔۔چوں پردہ برافتد۔۔۔چوں پردہ برافتد۔۔۔اور پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا۔حریری پردوں کی نرم سرسراہٹ نرم بھی تھی اور ریشم جیسی کومل بھی، پردے ساکن نہیں تھے، مگر اُٹھ بھی نہیں جا رہے تھے۔اہتمام یہ تھا کہ کچھ چھپا بھی رہے، کچھ جھلملاتا بھی رہے، ایسے ستر پردوں کے پرے وہ ساعد سیمیں ایک مستانہ سی بوجھل اور سرشار کیفیت میں مکیف ہوئیں کہ ماتھے پر ان کے شکنیں صف تشنگاں تھیں اور بھویں طلب کی آگ میں جل کر زلف زلیخا کی مانند سیاہ اور آنکھوں کی پتلی میں سیاہی تھی، سفیدی تھی، شفق تھی، ابر باراں تھا۔''(۱)

دوسرا ناول معروف افسانہ نگار صغیر رحمانی کے زور قلم کا نتیجہ ہے ''تخم خوں''، جو مکمل طور پر دلت ڈسکورس اور فکسل موومنٹ کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اسے پڑھ کر کے ایک نتیجہ تو فوراً اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دلت مسائل پر یہ اردو کا پہلا مکمل ناول ہے۔ دلت طبقہ کو پیش نظر رکھ کر ''دویہ بانی'' بھی لکھا گیا تھا مگر وہاں پس منظر تاریخی اور اسلوب شاعرانہ تھا۔ یہاں عہد حاضر کے سلگتے مسائل ہیں اور اسلوب و اظہار حد درجہ حقیقت پسندانہ۔ ایسا لگتا ہے صغیر رحمانی نے الیاس احمد گدی کی طرح وہی سب لکھا ہے جو انہوں نے بچپن سے دیکھا اور بھوگا ہے۔ اس کا ہر صفحہ ان کے مشاہدے کا عکاس ہے۔ انہوں نے دلت مسائل کو صرف کتابوں اور اخباروں سے نہیں جانا ہے بلکہ دلت کرداروں کے ساتھ جی کر ان کی سائیکی میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ ۱۹۹۰ء کے آس پاس بہار میں حق کے لئے آواز اٹھانے والی آوازیں دلتوں، پسماندوں اور غریبوں کی تھیں، ان آوازوں نے کئی تحریکوں اور آندلنوں کی بنیاد رکھی تھی۔ صغیر رحمانی نے بڑی باریکی اور گہرائی سے ان تحریکوں کے بطن میں اتر کر نتائج اخذ کیے ہیں اور ناول کے تانے بانے میں اس طرح پرویا ہے کہ وہ سارے حالات زندہ صورت میں ہماری نگاہوں کے سامنے پھر جاتے ہیں۔ یہ وہ معاشرہ جسے خود بہار والوں نے بھی بہت قریب سے نہیں دیکھا ہوگا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سماجی اور سیاسی مسائل پر فکشن لکھنے اور ان مسائل کو بھوگ کر فکشن تخلیق کرنے میں بڑا فرق ہے۔ صغیر رحمانی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ اردو ادب میں دلت مسائل کو دیکھنے کی کوشش ٹھیک ویسی ہے جیسے ٹرین کی کھڑکی سے بھاگتے ہوئے گاؤں کو دیکھنے کی۔ صغیر رحمانی نے ایسا بالکل نہیں کیا ہے اس لیے اس میں قاری کو بہار کا وہ چہرہ دکھائی دیتا ہے جو شاید ہی کسی نے دکھایا ہو۔ سامنت واد اور برہمن واد کا مسئلہ شاید ہندستان کے بہت سارے علاقوں میں ہو مگر بہار میں اس مسئلہ کی جڑیں زمینی تنازعہ کے ذریعہ بہت اندرون تک سمائی ہوئی ہیں اور مختلف تحریکوں کے باوجود آج تک صورتیں بدل بدل کر سیاست کے کام آرہی ہیں۔

تخم خوں صرف موضوعی اعتبار سے نہیں، فنی ٹریٹمنٹ اور برتاؤ کے لحاظ سے بھی قابل توجہ ناول ہے۔ پلاٹ کا گٹھاؤ ایسا ہے کہ ناول اپنے آغاز سے ہی قاری کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے اور کردار نگاری ایسی کہ بلائتی قاری کی فکر کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ استحصال کی ہی علامت نہیں مزاحمت کا شعلہ بھی بنتی ہے اور اپنے ہر روپ میں مکمل نظر آتی ہے۔ مرد کرداروں میں ٹینگر، مانجھی، اگھورن، جھگرو، بھیکھنا سب کے سب ایک ہی درد کا

شکار ہیں اور اس سامنتی کلچر کو جھیل رہے ہیں جہاں ان کے نام کی طرح ہی کام بھی کوئی دلکشی نہیں رکھتا۔ان کے ساتھ ہونے والے سلوک سے انسانیت کراہتی ہے اور آسمان شرمندہ ہوتا ہے۔مگر کوئی چہرہ ایسا سامنے نہیں آتا جو ان کی کراہ پر مضطرب ہو یا ان کے ہاتھوں کو تھام کر صاف ستھری زندگی کا راہی بنادے۔اس کے لئے انہیں کے درمیان سے کسی کو اٹھنا ہوگا۔صغیر رحمانی نے دکھایا ہے کہ اب آندولنوں اور تحریکوں کے ذریعہ اس کی شروعات ہو چکی ہے اور وہ دن دور نہیں جب بلائتی یا ٹینگر کی مزاحمت رنگ لائے گی اور وہ اپنا حق اسی سامنت وادی طبقہ سے چھین کر اپنے گھروں کو روشن کریں گے۔چنانچہ ناول کا خاتمہ جس منظر کے ساتھ ہوتا ہے وہ منظر دلت مسائل کے خاتمے کی جھلک اور ان کے روشن مستقبل کا اشاریہ پیش کرتا ہے۔آپ بھی دیکھئے:

> ''نور کا تڑکا پھیل چکا تھا۔آسمان کا جنوبی کنارہ سرخی مائل ہونے لگا تھا۔سورج کے طلوع ہونے میں محض چند ساعتوں کی تاخیر تھی۔عین اسی وقت بلائتی نے کیسر ملے دودھ کی مانند سرخ اور روئی کے پھاہے جیسے نرم بچے کو جنم دیا۔ادھر بچے کے پیر زمین پر پڑے،ادھر سورج نے اپنی شعاعیں بکھیر دیں۔ٹینگر گویا پاگل ہوا تھا۔زور زور سے پیتل کی تھالی پیٹنے لگا۔سورج نکل چکا تھا۔(۲)

میرا خیال ہے دلت مسائل پر تخم خوں ایک سچا اور بڑا ناول ہے، جو اپنے فنی اور فکری پہلوؤں پر تفصیلی گفتگو کا تقاضا کرتا ہے۔

ادھر تازہ واردان بساط ادب بھی فکشن کی دنیا میں بادنسیم کے جھونکوں کی طرح آئے ہیں۔ان پر گفتگو ضرور ہونی چاہیے کہ تنقید و تحقیق کی نسبتاً آسان دنیا میں آسانی سے بڑی تعداد میں لوگ داخل ہوتے ہیں،مگر تخلیق کا میدان خالی خالی رہتا ہے۔جب کہ ادب کے فروغ کے لیے نئی نسل کا تخلیق میں دلچسپی لینا اور آگے بڑھنا زیادہ ضروری ہے۔ایسے میں دو ریسرچ اسکالرز سلمان عبدالصمد اور سفینہ بیگم کے ناول اور شہناز رحمان اور شارقہ شفتین کے افسانوی مجموعے مجھے موصول ہوئے تو از حد خوشی ہوئی کہ ہمیں اردو ادب کے مستقبل سے مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔تخلیق کی شمع جلائے یہ لوگ اردو فکشن کی روشنی اور تابنا کی ضرور قائم رکھیں گے۔

سلمان عبدالصمد کا ناول ''لفظوں کا لہو'' اپنے موضوع کے اعتبار سے جدت لئے ہوئے ہے کہ فکشن

میں ہم عصر اردو صحافت کو مرکز مطالعہ شاید اب تک نہیں بنایا گیا تھا۔ یوں تو اس ناول میں مصنف نے موجودہ معاشرہ کے مختلف مسائل کی جانب ہمیں متوجہ کیا ہے مثلاً شہری زندگی کا کرب، گاؤں کی تکلیفیں، کم عمر کی شادی، بیویوں کو چھوڑ کر غیر ممالک میں بسنے والے شوہروں کے ازدواجی رشتے اور اس کے مسائل، ہندستانی معیشت اور طبابت کی کمزوریاں وغیرہ۔ مگر مرکزی توجہ صحافت اور عورتوں کی زندگی پر رہی ہے، اور پورا ناول انہی دونوں موضوعات کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے۔ سلمان جہاں ایک طرف صحافت اور عورت کی طاقت کا احساس دلاتے ہیں وہیں ان دونوں کے زوال کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے بار بار صحافیوں کو زوال پذیر صحافت کے خلاف کھڑے ہونے کی تلقین کرتے ہوئے ان کو حق گوئی وراست بازی کی جانب متوجہ کیا ہے تو عورت کو بھی اپنے حق کی بازیافت کے لئے للکارا ہے۔ وہ چونکہ خود صحافی ہیں اس لئے انہوں نے زرد صحافت ،استحصال کی بنیاد پر ٹکی صحافت اور اس کے نشیب وفراز کو قریب سے محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صحافت کے بعض ایسے گوشوں اور ایسے حقائق سے ہمیں روشناس کراتے ہیں جہاں ہماری نگاہ جا ہی نہیں سکتی اور جاتی بھی ہے تو ہم اس کا احساس نہیں کر سکتے۔ اسی لئے وہ صحافت جیسے پاکیزہ پیشے سے وابستہ افراد کے ساتھ ہر قاری کو اس کا احساس کرانا چاہتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف صحافیوں سے کہتے ہیں:

> ''صرف حق کا مطالبہ ہی نہیں، حق پیدا کرنا اور حق کی پرورش کرنا بھی میرے لحاظ سے صحافیوں کا فریضہ ہے۔ جو ہو رہا ہے اسے دکھانے کی ضرورت ہی کیا، وہ تو خود ہی دکھ رہا ہے۔ انہیں وہ بھی دکھانا ہے جو ہو سکتا ہے''(۳)

تو دوسری طرف قاری سے کہتے ہیں: ''دنیا میں پیدا ہونے والا ہر فرد صحافی ہے۔ حق کا مطالبہ کرنا ہر ایک کا بنیادی حق ہے''(۴)

آج جب صحافت پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا دونوں کے ذریعہ ایک کمرشیل اور تجارتی شعبے کے طور پر اپنی جگہ بنا چکی ہے، جہاں اصول، آدرش اور طریقہ کار کتابوں تک سمٹ چکے ہیں، سلمان بہت گہرائی سے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور قاری کو سیاہ اور سفید کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ کر دکھاتے ہیں۔

تکنیکی طور پر یہ ناول دو خوبیاں رکھتا ہے۔ اول یہ کہ سلمان کا مشاہدہ عمیق ہے اس لیے وہ جزئیات نگاری کا کمال دکھاتے ہیں۔ جزئیات سے محاکات کا حسن پیدا ہوتا ہے اور ناول کی پکڑ قاری پر مضبوط ہوتی

ہے۔سلمان کی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔ایک چھوٹا سا منظر ناول کے آغاز سے ہی دیکھئے

''نیند میں نائلہ کا بایاں ہاتھ قریب پھیلے اخبار کے صفحات پر جا پہنچا تھا۔دوسرے ہاتھ کی بند الٹی مٹھی ماتھے پر تھی اور دونوں گھٹنے کھڑے تھے۔اس کی ساڑی کی گولائی کا نچلا سرا بستر کی چادر سے ملا تھا اور اوپر کا، پنڈلیوں سے ذرا اوپر بلکہ گھٹنوں کے قریب آ گیا تھا۔زنیرا کے دل میں آیا کہ اسے کھینچ کر سیدھی کر دے۔''(۵)

ناول کی دوسری خوبی اس کا مربوط پلاٹ ہے جو چھوٹے چھوٹے کئی افسانوں سے بنا گیا ہے۔یہ ایک نئی تکنیک بھی ہو سکتی ہے کہ مصنف نے اپنے موضوع کے مختلف شیڈش دکھانے کے لئے بجائے سپاٹ بیان کے ہر موضوع پر ایک کہانی لکھ ڈالی اور اسے نہایت خوبصورتی سے ایک لڑی میں پرو کر ناول کا حصہ بنا دیا۔وہ بھی اس طرح کہ وہ افسانے ناول کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔صوفیہ، شبنم، فیضی، ثانیہ، عاطف، اسلم اور انیقہ، شوذیب وغیرہ کی کہانیوں کو اسی تکنیکی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

سلمان ابھی طالب علم ہیں اور کم عمر بھی۔اس لیے بہت سی جگہوں پر جلد بازی کا شکار بھی ہو گئے ہیں۔خاص طور پر زبان کے تعلق سے ابھی انہیں مزید محنت کی ضرورت ہے۔وہ الفاظ کا ذخیرہ رکھتے ہیں اور تخلیقی اسلوب برتنے کا ہنر بھی، بس تھوڑا سا صبر اور توجہ چاہیے۔کرافٹ مین شپ کی ایک ہلکی سی کمی کے باوجود چونکہ یہ ناول ایک اچھے ناول نگار کی بشارت دے رہا ہے اس لیے فکشن کی دنیا میں سلمان عبدالصمد کا استقبال گرمجوشی سے ہونا چاہیے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ اسکالر سفینہ بیگم کا ناول ''خلش'' بھی زیر مطالعہ رہا۔۱۴۰ صفحات پر مشتمل اس مختصر ناول میں انہوں نے چار لڑکیوں کی کہانیاں پیش کی ہیں اور انہیں آپس میں مربوط کر کے ناول کی شکل دی ہے۔رامپور کی طوبیٰ، لکھنو کی ماہم، لکھیم پور کی زہرہ اور دہلی کی عالیہ۔یہ چاروں الگ الگ طبقات سے تعلق رکھتی ہیں اور سب کے مسائل الگ الگ ہیں۔لیکن ایک جذبۂ محبت ایسا ہے جو چاروں کی شخصیت کو متاثر کرتا ہے۔یہ وہ جذبہ ہے جس کے بغیر عورت کا وجود بے معنی ہے۔لہذا یہ جذبہ انہیں نہ صرف ذہنی اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے بلکہ ہمیشہ کے لیے ایک قسم کی خلش سے بھی دوچار کرتا ہے۔سفینہ نے ہاسٹل کی زندگی میں مختلف قسم کی لڑکیاں دیکھی ہیں اس لیے چار الگ الگ کرداروں کی تعمیر میں ان کے مشاہدے کی گہرائی کا

اندازہ ہوتا ہے۔ تانیثیت کے اس عہد میں نسائی آزادی اور تانیثی استحکام کی آواز اٹھائی جاتی ہے مگر عورت کے دل کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کوئی نہیں کرتا، جہاں ایک مختلف دنیا آباد ہوتی ہے۔ سفینہ نے اسی دنیا سے قارئین کو روبرو کرانے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ عورت خواہ کتنی آزادی کی بات کرلے اس کی تقدیر مرد کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ ان لڑکیوں میں بھی بعض اپنی منزل کو حاصل کرلیتی ہیں تو بعض منزل کی تلاش میں استحصال کا بھی شکار ہو جاتی ہیں۔ استحصال اور تشدد عورتوں کا ایک بڑا مسئلہ ہے، جس کے خلاف سفینہ نے احتجاج کر کے اخلاقی جرآت کا مظاہرہ کیا ہے۔ ناول کا پلاٹ تھوڑا ڈھیلا ہے مگر چاروں لڑکیوں کی کہانیاں قاری کو اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول نگار بہت جلدی جلدی سب کچھ بیان کر دینا چاہتی ہیں۔ اس لیے وہ تکنیک اور ٹریٹمنٹ کے بجائے موضوع پر زیادہ توجہ دے رہی ہیں۔ موضوع اہم ہوتا ہے مگر ناول میں اس کی پیش کش اور طریقۂ کار بھی کم اہم نہیں۔ شاید اسی لیے ناول ''خلش'' خود کو پڑھوا تو لیتا ہے مگر اس سے کسی ہمراز و ہم جلیس کی طرح سرگوشیوں کی صورت پیدا نہیں ہو پاتی۔ اس کے باجود اس ناول کا استقبال میں نے خوش دلی کے ساتھ اس لیے کیا کہ یہ ایک سوچنے والی لڑکی اور باخبر ریسرچ اسکالر کی ادبی کاوش ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی طرح لکھتی رہیں تو ہمیں فنی طور پر زیادہ بہتر فن پارہ ضرور اور جلد دیں گی۔

مجھے احساس ہے کہ اکیسویں صدی میں ناولوں کا یہ تذکرہ مزید چند ناولوں کے تفصیلی ذکر کا متقاضی ہے مثلاً اگر تم لوٹ آتے (آچاریہ شوکت خلیل) وشواس گھات (جتندر بلو) موت کی کتاب (خالد جاوید) اہنکار، ایوانوں کے خوابیدہ چراغ، چاند ہم سے باتیں کرتا ہے (نورالحسنین) چراغ تہ داماں (اقبال مجید) زوال آدم خاکی (غیاث الدین) ایک اور کوسی (نسرین بانو) انجو، شوفر (ظفر عدیم) شاہین، جب گاؤں جاگے (شبر امام) کالی ماٹی (علی امجد) سیاہ کاری ڈور میں ایلین (جاوید حسن) آنکھ جو سوچتی ہے (کوثر مظہری) کابوس (شفق) خورشید انور ادیب (یادوں کے سائے) دکھیاری، خواب سراب، پری ناز اور پرندے (انیس اشفاق) آخری سواریاں (سید محمد اشرف) اور شموئل احمد (اے دل آوارہ، گرداب) بنارس والی گلی (فیاض رفعت) جس دن سے (صادقہ نواب سحر) اجالوں کی سیاہی (عبدالصمد) وغیرہ۔ ان تمام ناولوں کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے ناول نگاروں نے بیسویں صدی کے اواخر میں اردو ناول

کی طرف جو پیش قدمی کی تھی وہ اکیسویں صدی میں بھی قائم رہی ہے۔اکیسویں صدی میں ہندستان کا اردو ادب مجموعی طور پر ناول کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوا ہے۔ہمارے ناول نگاروں نے اکیسویں صدی کی موجودہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عوام وخواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور اظہاریت سے چھوٹی ہو۔آج کی رنگارنگ زندگی، معاشرے پر مغربی دباؤ اور اثرات، معاشی صورتیں، نفسیاتی پیچیدگیاں، جنسی اور سیکسی رویے، سیاست کے داؤ ؟ں پیچ، استحصال کے نئے نئے روپ اور ہر پل نئے تجربات سے دوچار ہوتا سماج بیان کے کھلے اور ڈھکے چھپے دونوں طریقے سے ان ناولوں میں موجود ہے۔طریق کار کے پرانے فریم ورک ٹوٹ چکے ہیں اور ناول نگار پیچیدہ کیفیات پیش کرنے کے لئے الفاظ اور زبان کے سراب آمیز میدانوں سے گزر رہے ہیں۔ان کے بیانیہ میں واقعے کی صرف اوپری سطح اہم نہیں واقعے کے اندرون میں برپا تلاطم، کرداروں کی زندگی اور کارکردگی میں ہلچل اور کشمکش اور ان پر گزرتی ہوئی لمحاتی اور دوررس کسک چھپی ہوئی ہے جس کے محاسبے اور واقعیت کے بغیر نئی تنقید ان کی روح تک نہیں پہنچ سکتی۔اس صدی میں اردو ناول کی سمت و رفتار آگے چل کر کیا ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا مگر ایک بات ہمیں مطمئن کرتی ہے کہ اکیسویں صدی کا یہ بیس سالہ عرصہ ناول کی تخلیق کے لحاظ سے اتنا بھرپور رہا ہے کہ ہم تہی دامنی کی شکایت نہیں کر سکتے۔ہاں میرا یہ احساس اپنی جگہ پر ہے کہ نئی صدی کے اردو ناولوں میں موضوعات کے تنوع کے باوجود آفاقیت سے ہمکنار کرنے کے لیے یا عالمی ادب کا ہم پلہ قرار دینے کے لیے اس کے اسالیب اور افکار میں جن تجربات اور عمومی تنوع کی ضرورت ہے، شاید ابھی اردو ناول ان سے دور ہے۔

حوالے:

۱۔حسین الحق، اماوس میں خواب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔۶۔ ۲۰۱۷ء ،ص۔۱۷

۲۔رحمانی صغیر، تخم خوں۔ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی، ۶۔ ۲۰۱۶ء ،ص۔۱۵۳

۳۔سلمان عبدالصمد، لفظوں کا لہو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی، ۶۔۲۰۱۶ء ص۔۹۵

۴۔سلمان عبدالصمد، لفظوں کا لہو۔ص ۶۹

۵۔سلمان عبدالصمد، لفظوں کا لہو۔ص ۲۲،

ڈاکٹر محمد عبداللہ کے حالات زندگی اور ادبی (اردو) کارناموں کا ایک مختصر جائزہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد شہید الاسلام*

ڈاکٹر محمد عبداللہ بنگلہ دیش کے اردو ادب کے آسمان پہ ایک روشن ستارے ہیں۔ بنگلہ دیش میں اردو ادب کے چرچے، ترویج واشاعت اور اردو ادب کے خزانے کو مالا مال کرنے، اردو کے مختلف موضوعات وہستیوں پر کتابیں اور مضامین لکھنے خصوصاً اردو ادب کو بنگلہ میں اور بنگلہ ادب کو اردو میں منتقل کرنے میں ڈاکٹر محمد عبداللہ کا کردار بے مثال ہے۔ وہ ایک نامور محقق، کامیاب معلم، باکمال مضمون نگار، معروف مصنف، مشہور ادیب اور شہرت یافتہ مترجم تھے۔ برصغیر کے جن مسلمان ماہرین، سیاست داں، محققین، شعراء اور ادباء نے مسلمانوں کی آزادی اور انسانی حقوق کی ادائیگی میں غیر معمولی کردار ادا کیا ان کے حالات زندگی اور ادبی کارناموں پر کافی تعداد میں کتابیں اور ایک سو سے زیادہ مضامین اردو بنگلہ اور انگریزی میں انہوں نے قلم بند کئے ہیں۔ اس مقالے میں ڈاکٹر عبداللہ کے حالات زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جائیگا۔

حالاتِ زندگی

ڈاکٹر محمد عبداللہ پہلا اپریل ۱۹۳۲ء میں لکھشمی پور ضلع کے بنگا خاں گاؤں میں پیدا ہوئے۱۔ ان کے والد کا نام مخلص الرحمٰن اور ماں کا نام انبیاء تھا۔ بچپن میں ان کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ ان کے والد نے دوسری شادی بھی کی تھی۔ ان کے والد اس زمانے کے ایک مشہور عالم دین اور لکھشمی پور دارالعلوم مدرسے کے معلم تھے۔

* شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

ڈاکٹر عبداللہ کے آباء واجداد مذہبی تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے اس علاقے میں اسلامی تعلیم کی اشاعت وتبلیغ میں اہم رول ادا کیا۔ جس کی وجہ سے ڈاکٹر عبداللہ کا خاندان اس علاقے میں بہت مشہور تھا۔ گاؤں کے لوگ ان کے خاندان سے بے حد محبت کرتے تھے۔

ڈاکٹر عبداللہ چار سال کی عمر میں اپنے والد کی سرپرستی میں تعلیمی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کے گھر کے قریب ایک مکتب تھا جہاں ان کے والد معلم تھے۔ اسی مکتب میں عربی کے ذریعہ ان کی تعلیم کی شروعات ہوئی۔ پھر اپنے گاؤں کے بنگا خاں پرائمری اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد نواکھالی دارالعلوم مدرسے میں داخل ہوئے۔ مدرسے کی تعلیم کی طرف ان کا رجحان بہت کم تھا۔ اپنے والد کے اصرار پر وہ مدرسے کی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور ہوئے۔ چونکہ بچپن ہی میں ان کی والدہ کی موت ہوئی۔ لہذا ان کو سخت اقتصادی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مدرسہ ان کے گھر سے تیں کلومٹر دور تھا۔ وہاں ایک کاشت کار کے گھر میں جا گیر رہ کر انہوں نے اپنی پڑھائی کی۔[۲] اس وقت مدرسے کی تعلیم کو حکومت کی طرف سے تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ جو طلبہ مدرسے میں پڑھتے تھے وہ صرف اللہ کی رضامندی اور دین کی خدمات کی غرض سے پڑھائی کرتے تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ بے حد ذہین طالب علم تھے۔ اٹھویں جماعت میں انہوں نے ضلع کا اسکالرشپ حاصل کیا۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے نواکھالی کرامتیہ مدرسے میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۳ء امیں سارے بنگال میں عالم کے امتحان میں حصہ لیا اور درجہ اول میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور ۱۹۴۵ء میں فاضل کے امتحان میں درجہ اول میں دوسرے نمبر پہ آئے[۳]۔ اس کے بعد انہوں نے کلکتہ عالیہ مدرسے میں داخلہ لیا۔ اس وقت پاکستان کی آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اس تحریک میں حصہ لیا اور گرفتار بھی ہوئے[۴]۔ کلکتہ عالیہ مدرسے میں نہ صرف بنگال کے طلبہ تھے بلکہ لکھنو، دہلی، علی گڑھ، پٹنہ اور پنجاب کے طلبہ بھی تھے۔ ان کی صحبت میں رہ کر ڈاکٹر عبداللہ کو اردو کی کافی معلومات اور مہارت حاصل ہوئی۔ وہاں انہوں نے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۸ء میں ممتاز المحدثین کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں چاٹگام ائی ائی (فی الحال حاجی محسن کالج) میں داخلہ لیا اور ۱۹۴۹ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے تحت ائی اے

کے امتحان میں حصہ لے کے درجہ اول میں چوتھی پوزیشن حاصل کی۔۱۹۴۹ء میں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہء اردو اور فارسی میں داخلہ لیا لیکن تعلیم کے راستے میں ان کی بری اقتصادی حالت آڑے آئی۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے وہ کبھی کبھی اپنے گھر چلے جاتے اور ضروری کتابیں خریدنے میں ناکام رہتے۔ پھر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری اور حتی المقدور کوشش اور جان توڑ محنت کر کے ۱۹۵۲ء میں آنرز کے امتحان میں درجہ اول میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اور ۱۹۵۳ء میں درجہ ثانی میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۷۲ء میں اسلامک اسٹڈیز اور ۱۹۷۳ء میں عربی کے موضوع پر بھی دو ڈگریاں حاصل کیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے تحت "سرسید احمد خاں دھرمیو وسماجک چنتا دھارا" کے موضوع پر تحقیقی کارنامہ انجام دے کر ۱۹۸۱ء میں ایم فل اور ۱۹۸۳ء میں "بنگلہ دیشے فارسی ساہتو" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔س

ڈکٹر عبداللہ نے صرف پندرہ سال کی عمر میں کرامتیہ مدرسے میں زیر تعلیم رہتے ہوئے شادی کر لی۔ ان کی بیوی اٹھویں جماعت کی طالبہ اور کم سن تھیں۔ اس شادی سے ڈاکٹر عبداللہ بالکل خوش نہ تھے۔ لیکن اپنے والد کے اصرار پر ان کو یہ شادی کرنی پڑی ۵۔ طالب علمی کے دوران شادی کرنے کی وجہ سے ان کی زندگی اور بھی مشکلات سے دوچار ہوئی۔ ڈاکٹر عبداللہ ایک مذہب پسند انسان تھے۔ بچپن ہی سے انہوں نے اسلام کی تعلیم حاصل کرنے اور مذہب کو بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے والد بھی انہیں مذہبی ماحول میں تربیت دینے اور پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے۔ گھر اور تعلیمی اداروں میں ڈاکٹر عبداللہ کو اسلامی ماحول ملا۔ جس کا گہرا اثر ان کی زندگی پر پڑا۔ خود اصولِ اسلامی کی اتباع کرتے اور گھر والوں کو بھی اتباع کرنے کی ہدایت دیتے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اگرچہ پرہیزگارانہ زندگی گذارنے کی کوشش کی مگر لباس کے مقابلے میں وہ پوری طرح جدت پسند تھے۔

مدرسہ، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیمی زندگی ختم کرنے کے بعد انہوں نے ملازمت شروع کی۔ شروع سے آخر تک وہ درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ سب سے پہلے انہوں نے مندرانہ ہائی اسکول میں دو سال (۱۹۴۵-۱۸۴۳) تعلیمی کا کام انجام دیا۔ ۱۹۴۵ء میں انہوں نے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ سلہٹ

سرکاری عالیہ مدرسے میں چار سال (۱۹۵۵-۱۹۵۱) سابر ڈنیٹھ سرکھس میں کام کیا۔ ۱۹۵۸ میں راجشاہی کالج میں Lecturer کی حیثیت سے ان کی تقرری ہوئی۔ لیکن راجشاہی کے ماحول سے وہ مطمئن نہ تھے۔ لہذا ۱۹۶۵ء میں وہ ڈھاکہ کالج میں بدلی ہوگئے۔ ۱۹۶۶ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوکر بریشال کالج میں Head of the Dept ہوکر منتقل ہوگئے۔ ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش وجود میں آنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کے اردو بولنے والے تمام اساتذہ بنگلہ دیش چھوڑ کے چلے گئے۔ اس وقت شعبہء اردو و فارسی میں اردو کے اساتذہ کا ایک خلا پیدا ہوا۔ اس خلے کو پورا کرنے کی غرض سے ۱۹۷۲ء میں وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور ۱۹۷۸ء میں معاون پروفیسر اور ۱۹۸۵ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آخر ۱۹۹۲ء میں ڈاکٹر عبداللہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ عام طور پر سبکدوش ہونے کے بعد ہر استاد کو Preparatory Leave کی حیثیت سے تنخواہ کے ساتھ چھ مہنے کی چھٹی ملتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر عبداللہ نے وہ چھٹی نہیں لی بلکہ باقاعدہ معلّمی کا کام انجام دیتے رہے۔ ان کی نوکری کی معیاد ختم ہوجانے کے بعد شعبے نے ڈاکٹر عبداللہ کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک Super Numerary Teacher کے عہدے کی تشکیل دی ۱۹۹۷ء تک وہ اس عہدے پر فائز تھے۔ ڈاکٹر عبداللہ کی تدریسی اور تحقیقی کاموں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے شعبے کی سفارش کے مطابق Part Time Teacher کی حیثیت سے پانچ مرتبہ ان کی ملازمت کی توسیع دی گئی۔ آخر Honourary teacher کی حیثیت سے ان کو شعبۂ اردو و فارسی میں مقرر کیا گیا۔ زندگی کے آخری دم تک وہ اس عہدے پر فائز ہوکر اپنی معلّمی زندگی کے فرائض نبھائے۔ اردو زبان و ادب پر دلچسپی رکھنے والی یہ ہستی نے ۲۰۰۸ء میں ڈھاکہ میں وفات پائی۔

ادبی کارنامے

ڈاکٹر عبداللہ سلہٹ سرکاری عالیہ مدرسے میں نوکری کے دوران انہوں نے اپنی تحقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے 4 اپریل ۱۹۵۶ء میں انہوں نے تحقیقی انداز میں ایک مضمون لکھا جس کا نام تھا "مشرقی

پاکستان میں اردو کا نیا روپ" جو ڈھاکہ کے پاسبان اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو زبان وادب کی جو ترویج ہوئی اس نے بنگلہ ادب اور ماحول کے اثر سے ایک نئی صورت اختیار کی تھی۔ اس مضمون میں انہوں نے یہ بھی بتانے کی کوشش کی کہ پاکستان بننے کے بعد لاہور اور کراچی کی طرح ڈھاکہ میں اردو کا ایک نیا اسکول وجود میں آیا جس کے بانی ڈاکٹر عندلیب شادانی تھے۔ اس کے بعد ۱۹ جون ۱۹۵۶ء میں پاسبان اخبار میں تحقیقی انداز میں "مشرقی پاکستان میں اردو" کے نام سے ان کا دوسرا ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کے ذریعہ انہوں نے مغربی پاکستان کے لوگوں کو مشرقی پاکستان کی اردو کی صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ سلہٹ سرکاری عالیہ مدرسے میں دورانِ قیام ان کے اور بھی پانچ مضامین منظر عام پر آئے۔ ۱۹۶۰ء میں راجشاہی کالج سے ڈھاکہ کالج میں منتقل ہونے کے بعد ڈاکٹر عبداللہ کی اردو میں اصلی تحقیقی کاموں کا آغاز ہوا اور پہلے سے اردو میں مضامین لکھنے کا سلسلہ اور بھی تیزی آئی۔ ان کے اکثر و بیشتر مضامین اس کالج میں ملازمت کے دوران شائع ہوئے۔ وہ سب مضامین کافی معیاری تھے جو پاکستان کے ماہنامہ ساقی، ماہنامہ فران اور لاہور کے ماہنامہ سیارہ اخبار نے شائع کئے۔ راجشاہی یونیورسیٹی کے شعبۂ السنہ کے سابق چیئرمن پروفیسر ڈاکٹر بظل الوہاب نے اپنے مضمون میں ان کے تعارف میں کہا

> ''بنگلہ دیش میں پروفیسر عبداللہ واحد بنگالی ہیں جنہوں نے اردو میں اس کثرت سے اعلی درجے کے مضامین لکھے اور ان کو معیاری اردو رسالوں میں شائع کرانے میں کامیاب ہوئے۔''[۶]

ڈاکٹر عبداللہ کا دھیان ہمیشہ تحقیقی کاموں میں مائل تھا اور یہ ان کے ایک قسم کا نشہ تھا۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کی پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول نے کہا" شعبۂ اردو و فارسی کے شاگردوں کی حوصلہ افزائی میں پروفیسر عبداللہ کا حصہ قابل تعریف ہے۔ پڑھنا، بڑھانا اور تحقیقی مقالہ لکھنا پروفیسر عبداللہ کا پیشہ نہیں نشہ ہے۔ علمی تحقیق وتنقید کی صلاحیت ان میں خداداد ہے۔ ان سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں خود بخود تحقیق وتنقید کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے۷۔ اس قول کی تائید کرتے ہوئے ڈھاکہ یونیورسیٹی کے

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر عبدالباقی نے کہا "وہ کامیاب معلم، مفکر، مضمون نگار اور مصنف ہیں۔ وہ ایک اچھے مترجم بھی ہیں۔۸ "پروفیسری کرنا اور تحقیقی کام کرنا ہی عبداللہ صاحب کا فلسفہء زندگی ہے۔۹" پروفیسر عبداللہ نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں جن میں ادبی، علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین بھی شامل ہیں۔ بنگلہ دیش کے قومی شاعر نذرالاسلام کی شاعرانہ عظمت اور خصوصیات کو انہوں نے اردو والولوں کے سامنے بڑی خوبی سے پیش کیا۔ ٹیگور اور اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا اور دونوں کی شاعری کا موازنہ کیا، نذرالاسلام اور جوش کی شاعری کا تقابلی جائزہ پیش کیا۔ مشرقی پاکستان میں اردو ادب اور لوک گیت کی صورتِ حال اجاگر کی۔ حالی کے ساتھ ہنکم کا موازنہ، بنگلہ زبان پر اردو کا اثر، بنگلہ زبان پر اسلام کے اثرات، شیخ سعدی اور ان کی گلستاں پر تبصرہ، اسلام کی اشاعت میں اردو زبان و ادب کا حصہ، اردو قواعد وغیرہ موضوعات پر ڈاکٹر عبداللہ نے مضامین لکھے ہیں۔

ڈاکٹر محمد عبداللہ نے اپنا مضمون لکھنے کا آغاز اردو ہی میں کیا تھا اور بنگلہ دیش کی آزادی تک انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ انہوں نے ایک سو سے زیادہ مضامین اردو، بنگلہ اور انگریزی میں لکھے ہیں جن میں انچاس مضامین اردو میں ہیں۔ جو پاکستان کے دور میں لکھے تھے۔ جب بنگلہ دیش وجود میں آیا تو اردو میں مضمون لکھنے کی ضرورت کم ہوگئی۔ اس وقت ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی تحریر کا رخ بدل لیا اور اردو چھوڑ کے بنگلہ میں مضامین اور کتابیں لکھنا شروع کیا۔

مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش میں اردو ادب کا چرچہ اور تعلیم دینے میں ڈاکٹر عبداللہ کا نام سرفہرست ہے۔ اردو ادب کو بنگالیوں سے اور بنگلہ ادب کو اردو والوں سے متعارف کرانے میں انہوں نے غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔ خاص طور پر برصغیر کے اردو ادباء، شعراء، سیاست داں اور مؤرخین کے حالات زندگی، خیالات اور ادبی کارناموں کو بنگلہ میں منتقل کرنے میں ان کا کردار بے مثال ہے۔ ڈھاکہ یونیورسیٹی کے شعبۂ اردو اور فارسی کی پروفیسر ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر نے کہا:

> "انہوں نے بنگالی کی ثقافت، تہذیب اور ادبی زندگی کے جوہر، جو انات اردو کی کتابوں میں موجود تھے۔ انہیں کھوج کھوج کر بنگالی حضرات کے سامنے پیش کیا۔ حقیقت میں

پروفیسر عبداللہ ان حضرات گرامی میں سے ہیں جنہوں نے بنگالی میں بسنے والے اردو
کے مایہ ناز فنکاروں کو بنگالی حلقوں میں روشناس کرایا"[۱۰]

ڈاکٹر عبداللہ بنگلہ، اردو، عربی، انگریزی اور فارسی زبانوں کے ماہر تھے۔ ان کی اکثر کتابیں بنگلہ میں ہیں۔ اردو میں انہوں نے تین کتابیں تصنیف کی ہیں جن میں دو کتابیں شائع ہوئیں اور ایک شائع نہیں ہوئی۔ انگریزی میں انہوں نے صرف ایک کتاب لکھی ہے۔ اسلامی ادب، اسلامی تہذیب وتمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے جنہوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان ہی کو ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ ان کی اردو کتابوں کا جائزہ حسب ذیل ہے۔

مفید اردو مضامین: ڈاکٹر عبداللہ کی اردو میں لکھی ہوئی یہ پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں پچاس مضامین شامل ہیں جو چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ۲۰۶ صفحوں پر مشتمل اس کتاب کے آخری حصے میں کچھ خطوط بھی ہیں۔ شروع سے آخر تک انہوں نے آسان اور صاف زبان استعمال کی ہے۔ ۱۹۶۲ء میں داؤد خان منزل ڈھاکہ نے اس کتاب کو شائع کیا۔

نذرالاسلام: اردو زبان میں لکھی ہوئی یہ ڈاکٹر عبداللہ کی انمول کتاب ہے۔ اس کے ذریعہ ڈاکٹر عبداللہ کو کافی شہرت ملی اور اس سے ڈاکٹر عبداللہ اردو والوں کے پاس مشہور ہو گئے تھے۔ ان کے ادبی کارناموں میں یہ سب سے اہم اور عمدہ کارنامہ ہے۔ ۱۹۶۵ء میں کراچی کے ساقی اخبار نے نذرالاسلام کے عنوان پر ایک خصوصی شمارہ نکالا تھا۔ بعد میں پاکستان اکاڈمی نے ۱۹۷۱ء میں اسے کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ نذرالاسلام کے حالاتِ زندگی اور ان کے ادبی کارناموں کے مختلف حصوں اور موضوعات کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ڈاکٹر عبداللہ نے بنگلہ دیش کے قومی اور باغی شاعر قاضی نذرالاسلام کو پاک وہند کے اردو بولنے والوں اور ادب سے ذوق وشوق رکھنے والوں کے سامنے بڑی خوبصورتی اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی اس کتاب میں 'کھیا پاریر ترونی'، 'دھوم کیتو'، 'انوارہ' 'رنو بھیری'، 'ذوالفقار'، 'بدروھی' وغیرہ نظموں کو بڑے دلچسپ اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ کرتے وقت

انہوں نے شعروشاعری کے اصولوں کی پابندی کرنے کی کوشش نہیں کی اور وزن، ردیف اور قافیہ کا خیال بھی نہیں کیا۔ صرف اصلی موضوع کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر

جو حکومت ظالم ہو
اس کا خون بہانا اور اس کو سیدھا کر دینا چاہتا ہوں۔
اس کے سینے پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر،
اس کی گردن موڑ کر خون چوسنا چاہتا ہوں [11]

انہوں نے مزید کہا:

کیا زنجیر اور غلامی کی پوجا
ہمیشہ برقرار رہیگی ؟
اے مستی! تو دروازہ توڑ کر آجا
اے جوان مستو! اے میری نونہالو!
تم طوفان کی طرح فتح مندی کا پرچم لہرا کر،
قہقہوں سے آسمان چیر کر،
بھلا ناتھ کی تھیلیوں کو رنڈیل کر
موٹی موٹی غلطیاں ہی سہی پیش کرو [12]

اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"اردو میں نذرالاسلام کے متعلق مضامین تو بہت سے لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے معلوم ہے اس موضوع پر کوئی جامع اور مستقل تصنیف موجود نہیں۔ اردو میں نذرالاسلام کی زندگی اور شاعری پر قلم اٹھانے والے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی مادری زبان بنگلہ ہو۔ وہ اردو میں اچھی دستگاہ رکھتا ہو۔ بھرپور ادبی ذوق کا مالک ہو اور اردو سے بخوبی واقف ہو۔ پروفیسر عبداللہ ان تمام خوبیوں کے جامع ہیں۔ ان کی

مادری زبان بنگلہ ہے۔ وہ اردو میں اعلیٰ ڈگریاں امتیاز کے ساتھ حاصل کر چکے ہیں۔ اور بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ ان کی یہ کتاب درحقیقت اہل وطن کے لئے ایک نادر تحفہ ہے۔[۱۳]

انہوں نے مزید کہا کہ

"نذرالاسلام اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں نذرالاسلام کے حالاتِ زندگی جامعیت کے ساتھ پیش کئے گے ہیں اور ان کی ذہنی ارتقاء اور شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ پروفیسر عبداللہ نے جابجا نذرالاسلام اور علامہ اقبال کا موازنہ کیا ہے۔ دونوں کے حالات کی یکسانی حیرت انگیز ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جس طرح علامہ اقبال کی شاعری کاروانِ ملت کے لئے بانگ درا ثابت ہوئی اسی طرح نذرالاسلام کی للکار بنگال کے مسلمانوں کی نشات ثانیہ کی سبب بنی[۱۴]۔

ڈھاکہ یونیورسیٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے معزز پروفیسر ڈاکٹر محمد عبدالباقی نے اپنے مضمون "اردو اور بنگلہ کے ایک ممتاز بنگلہ دیشی ادیب" میں فرمایا کہ "سب سے پہلے ان ہی (عبداللہ) نے شاعر بنگال قاضی نذرالاسلام کے سماجی اور سیاسی کارناموں پر مشتمل اردو کتاب لکھ کر اردو دانوں کو بنگال کے اس شاعر سے روشناس کرایا۔[۱۵]

اقبال اور ٹیگور: یہ ڈاکٹر عبداللہ کی ایک تنقیدی کتاب ہے اس کتاب میں انہوں نے علامہ اقبال اور ٹیگور کی شاعری اور دونوں کے خیالات کا موازنہ کیا ہے۔ خصوصاً اسلام، آزاد، فلسفہ، انسانیت، دنیا کا وجود، فطرت وغیرہ کے متعلق دونوں کے نظریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب شائع نہیں ہو پائی۔ کیونکہ یہ کتاب شائع ہوتے وقت ۱۹۶۵ء میں پاک بھارت کی جنگ شروع ہوئی اور پریس کے اوپر ایک بم گرا اور اصلی نسخہ کے ساتھ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ پاکستان کے دور میں سیارہ، فران اور ساقی اخبار نے اس کتاب کے اکثر موضوعات شائع کئے تھے جو ڈاکٹر عبداللہ کے پاس موجود تھے۔

معیاری کتاب کی تصنیف کرنے اور تحقیقی مضامین لکھنے پر ڈاکٹر عبداللہ کو کافی عزت بھی ملی ہے۔ ماہرین اور محققین نے بھی ان کی تحریری قوت کو تسلیم کیا اور ان کے ادبی کارناموں کے بارے میں اپنی اپنی رائے اور خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کسی نے ان کو کامیاب معلم، کسی نے مشہور محقق اور تحقیقی کارناموں کے خالق، کسی نے اسلامی تہذیب کے علم بردار اور تہذیب پسند کاتب، کسی نے ان کو تحقیقی دنیا کے انسٹی ٹیوٹ، کسی نے ان کو اردو اور بنگلہ بولنے والوں کے بیچ رشتہ قائم کرنے والے کی شخصیت کا نام دیا ہے۔

پڑھنے، پڑھانے اور تحقیقی کاموں میں ڈاکٹر عبداللہ نے اپنی ساری زندگی صرف کردی۔ یو جی سی کے تحت انہوں نے بارہ تحقیقی کارنامے انجام دئے۔ بنگلہ، اردو اور انگریزی ان تینوں زبانوں میں انہوں نے ادبی خدمت انجام دی۔ ڈھاکہ یونیورسیٹی کے سابق وائس چنسلر ڈاکٹر وکیل احمد نے ڈاکٹر عبداللہ کے تحقیقی اور ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا:

> ''ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়ের উর্দু ও ফারসী বিভাগের প্রধান অধ্যাপক মুহাম্মদ আবদুল্লাহ একজন নিষ্ঠাবান ও নিবেদিত প্রাণ গবেষক। তাঁর জ্ঞান পিপাসা চিরন্তন ও অদম্য। বিগত ত্রিশ বছর ধরে তিনি বিপুল পরিমাণ গবেষণার ফসল তুলেছেন। আমাদের অজ্ঞতা ও অবহেলার কারণে যে সব বিষয় জাতির জীবনের ইতিহাস ও ঐতিহ্য থেকে হারিয়ে যেতে বসেছে অধ্যাপক আবদুল্লাহ সে সব বিষয় অন্ধকার খনি থেকে উদ্ধার করে আলোচনা ও গবেষণার মাধ্যমে আমাদের উপহার দিয়েছেন"

اسی طرح ڈاکٹر عبداللہ کے تحقیقی اور ادبی کارناموں کی تسلیم کرتے ہوئے بنگلہ دیش کے شہرت یافتہ دانشور اور ڈھاکہ یونیورسیٹی کے شعبۂ تاریخ کے معزز پروفیسر ڈاکٹر سید انوار حسین نے کہا:

"অধ্যাপক আবদুল্লাহ একজন অনলস গবেষক। সুধী সমাজে সমাদৃত প্রচুর গবেষণাকর্মের স্রষ্টা তিনি"।৮

ن کے اردو مضامین کی زبان صاف اور سلیس تھی۔ اردو کتابوں میں بھی سادہ اور بے تکلف زبان استعمال کی گئی ہے۔ پاکستان کے مشہور صحافی اور ادیب فراز احمد نے اپنے "ایک تعارف" مضمون میں لکھا "عبداللہ کی تحریر سلاست میں دہلی لکھنو، عظیم آباد اور لاہور کے بہت سے اہل قلم کی تحریروں سے کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتی ۱۸"۔ ڈاکٹر عبداللہ نے نذر الاسلام کے مشکل سے مشکل اشعار کو نہایت سادگی اور صفائی سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ثقیل مقفی اور مسجع الفاظ سے اپنے مضامین کو دور رکھنے کی کوشش کی۔ ان کی تحریروں میں ظرافت اور شوخی کی چاشنی بہت کم ہے۔ انہوں نے اعلی درجے کے مشکل مضامین کو بھی اس طرح پیش کیا کہ قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہو۔ جس کی وجہ سے پاکستان کے دور میں ان کے مضامین کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بنگلہ دیش میں جن چند ہستیوں نے اردو زبان وادب پر غیر معمولی خدمت انجام دی ہے ان ہستیوں میں ڈاکٹر عبداللہ کا نام قابل ذکر ہے۔ بنگلہ دیش کی ادبی دنیا میں ڈاکٹر عبداللہ کی شان بیان کرتے ہوئے راجشاہی یونیورسیٹی کے شعبہ السنہ کے سابق چیئرمن پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ

> "Professor Dr. Md. Abdullah was one of the most celebrated an well informed teachers of Dhaka University He was an authentic research scholar and a prolific writer of the country."۱۹

ڈاکٹر عبداللہ صرف ایک معلم ومحقق ہی نہیں تھے بلکہ وہ معلموں کے معلم اور محققوں کے سرپرست بھی تھے۔ ڈھاکہ اور راجشاہی یونیورسیٹیوں میں آج بھی ان کے بہت سارے شاگرد اور محقق موجود ہیں۔ تحقیقی میدان میں اہم رول ادا کرنے کے لئے پروفیسر عبداللہ کو ۱۹۹۱ع میں "ابراہیم شارک شرنو پدک" اور ۱۹۹۴ء میں "دیوان عبدالحمید شاہتو پور شکار" ملے ۲۰۔ اردو زبان وادب میں لا جواب خدمات انجام دینے کے لئے پاکستان کے "سیارہ" ڈائجسٹ کے اڈیٹر یل بوڈ رنے انہیں "نشان اردو" کا خطاب دیا ۲۱۔ بنگلہ دیش میں جب تک اردو زبان وادب زندہ رہیگا، تب تک عزت کے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ کا نام بھی یاد کیا جائیگا۔

ماخذ و منابع

۱۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، پشچم بنگے فارسی سہولیتے اور (اردو) ثقافتی مرکز، ۱۹۹۴)، ص تعارفی صفحہ

۲۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ سے ملاقات، ان کے گھر میں، بتاریخ ۱۹۔۱۔۲۰۰۲ء، رات ۸ بجے۔

۳۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، پشچم بنگے فارسی ساہتیہ، ص تعارفی صفحہ

۴۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ سے انٹرویو، ان کے مکان میں، بتاریخ ۱۹۔۱۔۲۰۰۲ء، رات ۹ بجے۔

۵۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ سے انٹرویو، ان کے مکان میں، بتاریخ ۱۹۔۱۔۲۰۰۲ء،

۶۔ ڈاکٹر بظل الوہاب، "ایک تعارف" غیر مطبوعہ

۷۔ یادگار، (ڈھاکہ: شعبۂ اردو و فارسی، ڈھاکہ یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء) صفحہ۔۱۲۴

۸۔ محمد عبدالباقی، اردو اور بنگلہ کے ایک بنگلہ دیشی ادیب، "الاخبار"، (ڈھاکہ: ۱۹۹۰ء) صفحہ۔۸

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر مجمدار، بنگلہ ادب میں سرسید احمد خان "تہذیب الاخلاق"، (علی گڑھ: ۱۹۹۰ء) ص ۸

۱۱۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، نذر الاسلام، (ڈھاکہ: پاکستان اکاڈمی، ۱۹۶۹ء)، ص ۹۰

۱۲۔ ایضاً، صفحہ۔۶۸

۱۳۔ ایضاً، صفحہ۔۵

۱۴۔ ایضاً، صفحہ۔۱۱-۱۰

۱۵۔ ڈاکٹر محمد عبدالباقی، الاخبار، ص فہرست

۱۶۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، پشچم بنگے فارسی ساہتیہ، ص ابھیمت۔

۱۷۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، نواب سلیم اللہ، (ڈھاکہ: اسلامیک فاؤنڈیشن، بنگلہ دیش، ۱۹۸۶)، ص پوربوکتھا

۱۸۔ فراز احمد، ایک تعارف، "سیارہ" (لاہور) ص ۴۳

۱۹۔ Latif Ahmad, A living legent of his time, *The Independent* (Dhaka; Bangladesh), P-11

۲۰۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، نیوز لیٹر، دسمبر ۱۹۹۲) ص ۲۶

۲۱۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ، مسلم دھرموستے امام غزالیر ابودان، (ڈھاکہ کامیاب پروکاشن، ۲۰۰۰) ص تعارفی صفحہ

نئی اردو تنقید کے موضوعات و مسائل

صفدر امام قادری*

زمانی اعتبار سے اکیسویں صدی اگرچہ ایک واضح میعاد کے آغاز کا تصور فراہم کرتی ہے مگر ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ہمارے لیے یہ بات مشکل تر ہے کہ اس حدِ فاصل کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی زبان میں آتی ہوئیں تبدیلیوں کی نشان دہی کر سکیں۔ پوری ادبی تاریخ نویسی میں ایسے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے کیوں کہ ادب رویّے یا سماجی، سیاسی یا تہذیبی و ثقافتی تبدیلیاں وقت کی پابند ہو کر کسی روٹین کی پابند ہو کر ہمارے سامنے نہیں آئی ہیں۔ زمانے کی رفتار اور ادب کی رفتار کی کڑیاں ضرور ایک دوسرے سے ملتی رہی ہیں مگر کیلنڈر کے صفحات کی طرح سے ادبی تاریخ کے صفحات ہرگز نہیں پلٹ سکتے۔ اسی وجہ سے جب تاریخی طور پر کسی کام، صنف یا شخصیت کے اوصاف کی پڑتال کرنی ہوتی ہے تو ہمیں اکثر و بیش تر ادبی کیفیتیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی میسر آتی ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا تو باضابطہ طور پر قیام عمل میں آیا تھا مگر ادبی مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے بہت پہلے سے ہی ہمارے ادب میں نئے رویّے پیدا ہونے لگے تھے، بھلے ان کا نام بعد میں متعین ہوا۔

اکیسویں صدی میں اردو ادب کی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایسی مشکلات ہر طالبِ علم کے لیے غور و فکر کا موضوع بنتی ہیں کہ کن بنیادی رویّوں کو اکیسویں صدی میں پہچانا جائے اور انھیں بیسویں صدی سے الگ کر کے دیکھا جا سکے۔ ادبی رجحانات اور تحریکوں کے حوالے سے توجہ دی جائے تو ۱۹۸۰ء کے بعد کے دور کو مابعدِ جدیدیت سے موسوم کیا جاتا رہا ہے اور ابھی تک اکیسویں صدی کے اِن بیس برسوں کو ماہرین نے اس طرح کے کسی نئے نام یا نئی اصطلاح سے پہچانے جانے کی وکالت نہیں کی۔

---

* صدر، شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ، ہندوستان

یہ بات بھی یاد رہے کہ ایک بڑا طبقہ ۱۹۸۰ء سے اب تک کے دور کو مابعدِ جدیدیت ہی تسلیم کرنے کے لیے رضامند ہے۔ روادارانہ طور پر ایک حلقہ اس بات پر بھی اپنی رائے پیش کرتا رہا ہے کہ ۱۹۸۰ء سے موجودہ عہد تک کے چالیس برسوں میں چوں کہ بنیادی ادبی رویّوں میں کوئی واضح خطِ امتیاز نظر نہیں آتا، اس لیے جنھیں مابعدِ جدید کی اصطلاح سے احتراز ہو، وہ کوئی دوسرا نام متعین کر سکتے ہیں مگر اِن چار دہائیوں کو اوصاف کے اعتبار سے یکجا رکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے۔ اسی لیے ایک طبقہ ہم عصر ادب کی اصطلاح کو بہ طورِ متبادل آزمانے کی وکالت کرتا ہے۔ بعض لوگوں کو ناموں کے سلسلے سے اِس رقیق صورتِ حال سے خاصی پریشانی ہوتی ہے مگر ادب کی تاریخ میں بار بار ایسی صورت اُبھرتی رہی ہے۔ خود ترقی پسند ادب کے موئدین ایک مدّت تک نیا ادب کی اصطلاح لکھتے رہے اور متوازی طور پر نیا ادب اور ترقی پسند ادب ہمارے استعمال میں قایم رہے۔ بعد میں جب ''ترقی پسند'' (۱) کو اصطلاحی طور پر لوگوں نے قبولیت بخش دی، اس کے بعد سے ''نئے ادب'' کو اصطلاح کے طور پر استعمال کرنے کا سلسلہ بند ہوا۔

موجودہ گفتگو اگرچہ تنقید کے حوالے سے ہونی ہے اور دائرۂ کار اکیسویں صدی مقرر ہے مگر عنوان میں ہی 'نئی' کا اضافہ حقیقی ادبی صورتِ حال کی شمولیت کی غرض سے کیا گیا ہے اور ہماری یہ کوشش ہوگی کہ جدید تنقید کے بعد جو نیا تنقیدی منظر نامہ مرتب ہوا، اس کے موضوعات و مسائل پر مرتکز رہ کر گفتگو کی جائے۔ جدید اردو تنقید بالخصوص شمس الرحمان فاروقی، وزیر آغا، شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ، محمود ہاشمی، وارث علوی اور وہاب اشرفی یا ان کے ہم عصروں کے توسّط سے سامنے آئی۔ اس کے بعض علم بردار اور سرخیل اب بھی سرگرمِ عمل ہیں۔ تھوڑے سے لوگ اب بھی خود کو جدید تنقید کا علم بردار کہتے ہیں مگر کچھ ایسے بھی ہیں بالخصوص گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی؛ جنھوں نے خود کو مابعدِ جدید نقاد کے طور پر پہچانے جانے پر اِصرار کیا۔ (۲) اپنے علمی کارناموں کی وجہ سے ان تمام کے امتیازات اعتبار کا درجہ رکھتے ہیں اور یہ بھی ایک سچائی ہے کہ ان میں سے سب نے ۱۹۶۰ء کی دہائی کے دوران تنقید نگاری کا آغاز کیا۔ ان سب کی پرورش و پرداخت اور علمی نشو ونما کا زمانہ وہی ہے جسے ادبی مؤرّخین جدیدیت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس لیے انھیں جدید نقادوں کے طور پر تسلیم کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ اور وہاب اشرفی

نے اگرچہ مابعدِ جدید نظریۂ ادب اور اس کے اطلاقی امور پر خاصی گفتگو کی ہے اور اس بات پر اصرار کیا ہے کہ انھیں جدیدیت کی نسل سے الگ تصور کیا جائے مگر سچائی یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر جدید نقادوں میں ہی شامل ہیں اور ان کا یہ اضافی کام ہے کہ وہ اس تحریک کے بعد کے دور کے ادب کی تعبیر و تشریح اور نئے زاویہ ہائے ادب کے حوالے سے تفہیم شعر و ادب کا کام کرنے کے لیے بھی سرگرم ہوئے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ۱۹۸۰ء یا مابعدِ جدیدیت کے آغاز سے پہلے ہی یہ دونوں یا مذکورہ تمام نقاد اپنی شناخت قائم کر چکے تھے اور ان کی اہم تحریریں یا کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں۔ اسی لیے اُنھیں جدیدیت کے عہد کا ہی پروَردہ کہا جانا چاہیے حالاں کہ وہ اس کے بعد بھی بدلتے ہوئے ادبی رویوں کی ہم رکابی میں آگے بڑھتے رہے۔

اکیسویں صدی یا نئے ہزاریے کی دو دہائیوں میں یوں تو تنقید نگاروں کی کئی نسلیں باضابطہ طور پر سرگرمِ تنقید و تحقیق ہیں۔ جدید اور مابعدِ جدید نقادوں کے ساتھ ساتھ ایک ایسی نسل بھی اچھا خاصا سرمایۂ تنقید پیش کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے جسے تازہ واردانِ بساطِ ادب کے نام سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ (۳) گذشتہ دو دہائیوں میں ان میں سے کئی ایسے اہم لکھنے والے ہیں جنھوں نے دو ہزار عیسوی کے آس پاس اپنی اوّلین تحریریں پیش کیں اور ان بیس برسوں میں اُن کی پانچ سات کتابیں نہ صرف یہ کہ منظرِ عام پر آئیں بلکہ یہ بھی ایک خوش آیند بات ہے کہ ان کے کارناموں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا ہے اور ان کی تحریروں میں کچھ نہ کچھ ایسی خاص بات ضرور شامل رہی ہے جسے سرسری نہیں کہا جا سکتا اور نہ ایسے وقیع کام کرنے والوں کو مبتدی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس طبقے میں بڑی تعداد ایسے لکھنے والوں کی ہے جنھوں نے اپنا اختصاصی میدان بھی منتخب کیا ہے اور جن میں تحقیقی اور تنقیدی آمیزہ تیار کرنے کا شوق بھی ہے۔ اس وجہ سے اکیسویں صدی کی یہ نسل اپنی تنقید میں تحقیق سے مدد لے کر اپنی باتوں کو زیادہ باوزن اور با اعتبار بنا رہی ہے۔

جدید نقادوں کے بعد کی وہ نسل جو باضابطہ طور پر ۱۹۸۰ء کے بعد اپنی شناخت اور اپنے معتبر کاموں کے ساتھ میدانِ عمل میں آئی، اُن میں سے عتیق اللہ اور ابوالکلام قاسمی یا قاضی افضال حسین وغیرہ عمر کی ساتویں دہائی مکمل کر رہے ہیں۔ اِن سب میں جدیدیت کا پُر جوش انداز نظر نہیں آتا اور حسبِ ضرورت

۱۹۸۰ء کے بعد کے نئے قومی اور عالمی ادبی رویّوں کی طرف توجہ کرنے کا میلان نظر آتا ہے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ اِن کی تنقید کے ایک بڑے حصے پر جدید تنقید کے بنیادی موضوعات اور مخصوص مزاج کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ دو ادبی رویّوں کے درمیان جو نسل سامنے آتی ہے اُن میں ایسے فکری اور علمی تذبذب سے گریز کی راہیں کم کم نکلتی ہیں۔ اس لیے مذکورہ نقادوں کے ابتدائی بیس برس کے سرمایے پر جدیدیت کے اثرات اور آخری بیس برس کے دوران مابعدِ جدید موضوعات کی عکاسی ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے۔ شاید اِسی لیے اِن کے یہاں ایک غیر فطری اور جبریہ وسیع المشربی پیدا ہوئی مگر بالعموم اُنھیں روادارانہ تنقیدی رویّے کا حامل فرد نہ سمجھا گیا۔ اب بھی کبھی اُنھیں جدید اور کبھی مابعدِ جدید تنقیدی رویّوں کے علم بردار کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ ابوالکلام قاسمی کو تو اُن کی بعض تحریروں کے حوالے سے کلاسیکی انداز کے نقّاد کے طور پر بھی پہچاننے والے مل جائیں گے۔

اردو تنقید و تحقیق میں ۱۹۸۰ء کے آس پاس ایک نئی نسل سامنے آئی۔ اُس دور میں جدید افسانہ نگاروں اور شعرا کے مقابلے بڑی تعداد میں افسانہ نگاروں اور شاعروں کا قافلہ بھی سامنے آیا۔ ہر چند اُس دور میں شمس الرحمان فاروقی اور گوپی چند نارنگ کا آفتابِ تنقید نصف النہار پر تھا مگر وقت کی نبض پر اُن کی خاموش اُنگلی اس بات کا اشارہ کر رہی تھی کہ ادب کا سلسلہ اب بدلنے والا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے باضابطہ طور پر کلاسیکی ادبی متون کی طرف صرف رجوع نہ کیا بلکہ لغات، اصطلاحات اور ادبی مخصوصات کے حوالے سے بھی کلاسیکی یا نو کلاسیکی عہد کا اشارہ کر رہے تھے۔ ہر چند وہ بار بار اس بات پر بہ شدّت اظہارِ خیال کر رہے تھے کہ جدیدیت کے بعد اب تک کچھ نیا نہیں آیا اور ابھی گذشتہ ادبی رویّے ہی بہ دستور جاری ہیں مگر 'شب خوں' کی اشاعت میں وہ تواتر نہ رہا اور پُرانے موضوعات کے لیے گذشتہ جوش میں بھی شمس الرحمان فاروقی کے یہاں عملی طور پر کمی نظر آئی۔ جس کی توثیق کے لیے 'شعرِ شور انگیز' کی جلدیں اور داستان سے متعلق اُن کی تصنیفات کا بہ غور مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی سامنے آتا ہے کہ فاروقی کی نگاہ میں بھی ۱۹۸۰ء کا زمانہ ایک نئے ادبی رویّے کی آمد آمد کا تھا جسے وہ اعلانیہ طور پر قبول نہیں کر سکتے تھے مگر اِس کے جبر میں وہ ادب کی دوسری دنیا کی طرف بڑھ چکے تھے۔

۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ء کے دوران گوپی چند نارنگ نے اپنی تنقیدی تحریروں سے اِس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ ایک نیا ادبی رویّہ سامنے آ رہا ہے۔ انھوں نے ساختیات، پس ساختیات اور مابعدِ جدیدیت کی اصطلاحوں کی تعبیر و تشریح اور عالمی سطح پر اِن اصطلاحات اور رجحانات کی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند اُن کی تحریروں پر بعض افراد نے سرقہ اور درست یا نادرست ترجمے کے الزامات بھی عائد کیے مگر انھوں نے اپنی تنقیدی اور اس سے بڑھ کر تنظیمی صلاحیتوں سے مابعدِ جدیدیت نواز حلقے کی ایک صورت پیدا کی اور ۱۹۸۰ء کے بعد اُبھرنے والے شعرا، افسانہ نگاروں اور نقادوں کو جمع کر کے اِس پیغام کو عام کرنے میں کامیابی پائی کہ جدیدیت کے اثرات ہمارے ادب پر فی زمانہ نہ رہے اور دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اردو بھی مابعدِ جدید علمی اور فکری عہد میں داخل ہو چکی ہے۔ ابتدائی دور میں انھوں نے ما بعدِ جدید نقطۂ نظر سے جو تعبیرات پیش کیں، انھیں اطلاقی سطح پر مابعدِ جدید تسلیم کرنے والے لوگ کم تھے اور محمود ایاز یا دوسرے جدید لکھنے والوں نے بجا طور گوپی چند نارنگ کی تعبیر و تشریح کو نئے فکری رویّے کی آمد آمد ماننے سے معذرت ظاہر کی تھی۔ رفتہ رفتہ گوپی چند نارنگ اور اُن کے حلقے کے ایسے لوگ بھی اُبھر کر سامنے آ گئے جنھوں نے ادب کی نئی تفہیم کے لیے نئے اصول و ضوابط کو آزمایا جس سے یہ بات انجام کو پہنچی کہ ۱۹۸۰ء کے بعد واقعتاً نیا ادبی رویّہ سامنے آ چکا ہے۔

ممتاز جدید شاعر مظہر امام نے ۱۹۹۰ء میں رسالہ 'کتاب نما'، نئی دہلی (۴) میں مہمان اداریہ لکھتے ہوئے نئی نسل کے دو شعرا عالم خورشید اور خورشید اکبر کی تازہ نثری تحریروں کے حوالے سے گفتگو کی تھی جس کا عنوان 'ایک لہر آتی ہوئی' تھا۔ مظہر امام نے ترقی پسندی اور جدیدیت سے آزاد فکر والی ایک نسل کے دل میں جو جذبات تھے، انھیں پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ تخلیق کاروں کے سلسلے سے گوپی چند نارنگ کے ذریعے منعقدہ دہلی اردو اکادمی اور ساہتیہ اکادمی سے می ناروں میں بڑی تعداد میں لوگ سامنے آئے۔ کوثر مظہری نے بھی جواز و انتخاب کے سلسلے سے اُس نئی نسل کے شاعرانہ اظہار کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ اُس دوران اِس بات پر بھی بحث ہوتی رہی کہ اِس نئی نسل کو یا نئے ادبی رویّوں کو کس نام سے پہچانا جائے۔ شوکت حیات نے تو انام نسل اور انامیت کا راگ چھیڑا جو صرف اُن ہی کی زبان سے سُنا گیا مگر نفسِ مضمون کے اعتبار سے

وہ بات غلط نہیں تھی۔ آلِ احمد سرور نے بھی تناظریت کی اصطلاح پیش کی مگر دیر سویر مابعدِ جدیدیت ہی اِس عہد کا نام قرار پایا اور ۱۹۸۰ء کے بعد کی اِن چار دہائیوں کو پہچاننے کے لیے اِس اصطلاح کو قبولِ عام زمرے میں رکھنے میں کوئی دشواری نہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد جن نئے نقادوں نے اُس عہد اور اُس کے موضوعاتِ ادب کی افہام و تفہیم میں خصوصی توجہ صرف کی اُن میں شافع قدوائی، نظام صدیقی، کوثر مظہری اور مولا بخش کو اہمیت دی جاسکتی ہے۔ اِن نقادوں نے اصولی اور عملی دونوں جہات سے اردو کے نئے ادبی منظر نامے کو سمجھنے کی اور نئے سرمایۂ ادب کو مابعدِ جدید اصول وضوابط کے حوالے سے پیش کرنے میں کامیابی پائی۔ اِسی دوران کچھ پُرانے نقادوں نے اِس عہد کے ادب کے امتیازات بھی واضح کیے۔ قاضی افضال حسین، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، عتیق اللہ اور شمس الرحمان فاروقی نے ۱۹۸۰ء کی نسل کے علمی اور ادبی سرمایے کو موضوع بنایا اور چند نمایندہ یا پسندیدہ فن کاروں کی خدمات کا جائزہ لیا۔ اس عمل میں کئی بار یہ بھی کوشش ہوئی کہ خاموشی سے یہ بتایا جاسکے کہ اِن پر جدیدیت کے بعض اثرات موجود ہیں اور کم از کم اِنھیں جدیدیت کی توسیع تو قرار دیا ہی جاسکتا ہے۔ خالد جاوید، صدیق عالم، جینت پرمار، عرفان صدیقی، اسعد بدایونی، صدیقی مجیبی وغیرہ کے سلسلے سے بعض تنقیدی تحریروں میں ایسے اشارے کیے گئے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد کے ایسے افسانہ نگاروں کو بھی دورانِ تنقید اِسی طرح سمجھنے کی کوشش ہوئی جن پر ابتدائی دور میں جدیدیت کے واضح اثرات تھے۔ سلام بن رزّاق، شوکت حیات، حسین الحق، ساجد رشید، سید محمد اشرف وغیرہ کی خدمات کے حوالے سے جو تنقیدی سرمایہ بزرگ نقادوں کے ذریعے پیش کیا گیا، اُن میں غیر ضروری طور پر یہ اشارہ موجود ہے کہ یہ فن کار جدیدیت کے علم بردار ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اِن کی ابتدائی تحریریں ہی جدیدیت کی عصری فضا میں سانس لے رہی تھیں (۵) اور بعد میں اُن کا پورا ادبی سرمایہ اِس بات کے لیے پہچانا جاسکتا ہے کہ نئے ادبی رویّوں کی ایک پوری نسل اِنھی سے تیار ہوئی۔ مگر اِس پر بہ وجوہ توجہ نہ دی گئی اور استنباطِ نتائج میں کوتاہی ہوئی۔

نئی اردو تنقید میں وہ لوگ جو دبستانی چپقلش یا مخصوص ادبی رویّوں کے دائرۂ کار میں لازمی طور پر مخصوص چوکھٹے کے حوالے سے افہام و تفہیم کی کوششیں نہیں کرتے اور ادب کے خود مکتفی ہونے کو قبول

کرتے ہوئے تعبیر وتشریح کے فرائض انجام دے رہے ہیں اُن میں ہندستانی نقادوں میں کم از کم ایسے ایک درجن اصحاب نظر آتے ہیں جو تازہ ادبی اور علمی کارناموں یا ادبی اور علمی معاملات پر اپنی تنقیدی نگارشات پیش کرنے میں باضابطہ طور پر کاربند ہیں۔ابوبکر عباد، خالد اشرف، شہاب ظفر اعظمی، نسیم احمد نسیم وغیرہ کی تنقید وتحقیق کا بنیادی محور اردو فکشن ہے اور اس حوالے سے اِن کی کاوشیں سنجیدہ علمی حلقوں میں توجہ سے دیکھی جاتی ہیں۔راشد انور راشد، عاصم شہنواز شبلی، سرور ساجد، انور ایرج، قمر صدیقی، عادل حیات، احمد کفیل ،سرورالہدیٰ وغیرہ نئے نقادوں میں ایسے نام ہیں جو خاص طور سے شعری سرمایے کے احتساب کے لیے لگاتار اپنی تحریریں پیش کررہے ہیں۔

۱۹۸۰ء کے بعد اُبھرنے والا ایک سنجیدہ علمی حلقہ وہ بھی ہے جس نے تحقیق کے خمیر سے اپنی تنقید کو مضبوط کیا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے تنقید وتحقیق کے مشترکہ فیضان کو عام کرنے میں نمایاں کام انجام دیے۔ظفر احمد صدیقی، ظفر کمالی، شمس بدایونی، شہاب الدین ثاقب، جمشید قمر، قمرالہدیٰ فریدی، عمیر منظر وغیرہ ایسے نام نظر آتے ہیں جنھوں نے جدیدیت کے بعد کے تنقیدی ادب کی تحقیقی شان کو اپنے کارناموں سے امتیاز ووقار بخشا ہے۔اِن میں سے بعض کی فی زمانہ ادبی وعلمی حیثیت اب بہ طورِ مثال پیش کی جاتی ہے۔اِن کی کتابیں اور بعض مقالے موجودہ علمی وادبی منظرنامے کا معیار ہیں۔مگر یہ بات اسی دوران لکھے گئے اُن مقالاتِ علمیہ کے لیے نہیں کہی جاسکتی جنھیں تحقیقی وتنقیدی مطالعے کے طور پر یونی ورسٹیوں میں داخل کرکے ایم۔فل اور پی ایچ۔ڈی کی سندیں حاصل کی گئیں۔بہ مشکل دس فی صد ایسے مقالے شایع ہوکر تحقیق وتنقید کا اعلا معیار پیش کرسکے۔ایک اور بات اس دوران اس نئی نسل میں دیکھنے کو ملی کہ سینکڑوں کی تعداد میں ایسے افراد نشان زد کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اپنے مقالاتِ امتحانیہ کے بعد کوئی بڑا تنقیدی وتحقیقی کام نہ کیا۔جب کہ اُن کی تدریسی یا علمی زندگی کی کئی دہائیاں گزر چکیں۔ایسی نسل سے ہمارے علم وادب اور بالخصوص ہم عصر ادبی منظرنامے کا معیار متعین نہیں ہوتا۔

گذشتہ دہائیوں میں متفرق تنقیدی مضامین کے مجموعے بڑی تعداد میں سامنے آئے۔جن کے لکھنے والے جدیدیت کے بعد اپنی ادبی سرگرمیاں روا رکھنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ان میں بزرگ

اساتذہ، نئے اساتذہ اور نو آموز لکھنے والے شامل ہیں۔ عمر پر توجہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ۲۵ ربرس سے ساٹھ ستر برس کی عمر کے افراد اِس کام میں منہمک ہیں۔ ایسی کتابوں میں سب سے بڑی تعداد نو آموزوں کی ہے۔ رسائل اور اخبارات کے ساتھ ساتھ کتابوں کی اشاعت میں آسانی نے اِس ادبی سرمایے کو استحکام دیا ہے مگر معیار اور ادبی اہمیت کی بات کریں تو اِسے قابلِ اعتنا کہنا مشکل ہے۔ اس میں پختہ قلم نوجوان خال خال نظر آتے ہیں اور ادبی متن کے بطن میں اُتر کر نئے معنی و مفاہیم تلاش کر کے علمی دنیا کے سامنے پیش کرنے والے تو بالکل برائے نام ہیں۔ یہاں یہ توجیہہ پیش کی جا سکتی ہے کہ بزرگ اور دہائیوں سے مشقِ ادب کرنے والے افراد کے یہاں بھی یہ علمی پختگی اور بہترین مضامین لکھنے والے مٹھی بھر ملتے ہیں۔ یہ سچائی ہے اور اسی لیے کتابوں کی بھیڑ میں تنقیدی اور علمی اعتبار سے زیادہ توجہ سے پڑھی جانے والی کتابیں بہت کم نظر آ رہی ہیں اور ایسی تحریریں جو صفحۂ اوّل سے صفحۂ آخر تک پڑھنے اور غور و فکر کرنے کے لیے مجبور کر دیں، اُن کا واضح فقدان ہے۔ اسی لیے نئے نقادوں میں بہت کم ایسے ہیں جنھیں صفِ دوم میں بھی آپ جگہ دے سکتے ہیں۔ صفِ اوّل میں ہم عصر تنقید میں کسی شخص کو جگہ دینا معیار کے ساتھ سمجھوتا کہا جائے گا۔ اردو تنقید میں نئی نسل کے لکھنے والوں میں تیسرے اور چوتھے درجے کے لکھاڑی زیادہ ہیں اور ایسے افراد سے کسی زبان کی ترقی اور معیار کا تعین نہیں ہو سکتا۔

پُرانے نقادوں کو اُن کی مجموعی علمی حیثیت کے حوالے سے آسانی سے کم تر قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ حالی اور شبلی کے دور سے کلیم الدین احمد اور آلِ احمد سرور یا احتشام حسین اور شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ یا شمیم حنفی وغیرہ کی بساطِ تنقید کی یہ خاص بات ہے کہ اُن کی پُشت پر اپنی زبان اور دوسری زبانوں کے تخلیقی و تنقیدی سرمایے سے استفادہ کا باضابطہ نظم تھا۔ انھوں نے اپنے مطالعے اور مشاہدے سے اپنی تحریروں کو باوزن بنایا جس سے اُن خاص موضوعات پر ایک عالم نے استفادہ کیا۔ اِس کے علاوہ اُن نقادوں کے زبان و اسلوب کے حوالے سے ایک مخصوص تربیت تھی جس کی وجہ سے اُن کی تصانیف یا متفرق تحریریں اپنی زبان کی روایت میں بہت آسانی سے مقام و مرتبہ حاصل کر سکیں۔ اب اگر اِن دونوں معیاروں یعنی وسیع علمی اور مطالعاتی جہت کے ساتھ ساتھ زبان و اسلوب کی سلیقہ مندی کو پیمانہ بنائیں تو گذشتہ

چالیس برس کی تنقید کی دنیا میں جو نئی نسل سامنے آئی اور اپنی پہچان بنانے میں کامیاب رہی، اُن میں سے اپنے اپنے موضوعات کے تھوڑے بہت ماہرین تو نظر آجاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے یہاں زبان وبیان کا شعور پختہ تر معلوم پڑتا ہے مگر عمومی صورتِ حال حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ادب کے بڑے عالم اور مختلف زبانوں کے ادبی سرمایے کے واقف کار اِس نئی نسل میں کون سے لوگ ہیں؟ جنھوں نے نئے نئے موضوعات پر ایک آدھ کتابیں لکھ ماری ہیں، اُن کا بھی مکمل علم اُس سے بڑھ کر نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ اُس موضوع کے کُل وقتی ماہرین کی فہرست میں کہیں بھی گِنے نہیں جاتے۔ ایسے لوگوں کا علمی دبدبہ بھی قایم نہیں ہوسکتا، اِسی لیے اب نقادوں کا منصبی دبدبہ ہی کام کر رہا ہے اور مشکل سے کوئی یہ جان پاتا ہے کہ وہ کسی خاص موضوع کے ماہر اور گہرے جاننے والے ہیں۔ اب ہر نقاد ہر موضوع کا ماہر یا Practitioner ہے۔ مختصر علمی بصیرت پر جب کام چل جائے تو زندگی بھر کا علمی جنجال پالنے سے کیا فائدہ؟ اِسی نے ہمارے ادبی معیار کو متاثر کیا ہے۔

ہندستان سے باہر کے ایسے نقادوں پر ایک نگاہ ڈالیے جو ۱۹۸۰ء کے بعد اُبھرے اور جن کی شناخت اپنے ملک کی سرحدوں سے بڑھ کر قایم ہوئی، اُن میں پاکستان سے ناصر عبّاس نیّر، تحسین فراقی، اورنگ زیب نیازی، خالد ندیم، شعبۂ اردو ڈھاکا یونی ورسٹی کے استاد محمود الاسلام، کینیڈا میں مقیم تقی عابدی اور ایسے کئی اہم لکھنے والے ہیں جن کے کاموں کو اِس دور کی ادبی پہچان کے طور پر یاد رکھنا چاہیے۔ ہندستان، پاکستان یا بنگلا دیش میں کتب ورسائل کی آپسی مبادلے کی بہت موہوم سی کڑی کام کر رہی ہے۔ جس کے سبب ایک دوسرے کا تازہ علمی کام ٹھیک سے سب کی نظر میں نہیں ہے۔ یہ بھی ایک بڑی رکاوٹ ہے جس سے عہدِ حاضر کا علمی سرمایہ اپنے معیار کا ادھورا دعوا کر پاتا ہے اور اُسی آدھے ادھورے سرمایے پر ہم فیصلہ کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ اردو کا وسیع وعریض حلقہ برِّ صغیر سے باہر یورپ اور دوسرے برِّ اعظموں میں نظر آتا ہے وہاں تخلیق کاروں کے مقابلے نقادوں موجودگی بہت محدود ہے۔ اس لیے اردو تنقید کی جو نئی دنیا اور اُس کے بالکل نئے لکھنے والوں کی تلاش میں ہمیں بڑے دماغوں اور وسیع علم یا اطلاعات کی بنیاد پر تنقیدی فیصلے لینے والے افراد بڑی تعداد میں نہیں ملتے۔ (۶) اب سے تین دہائیاں پہلے تک کتب ورسائل کے لین

دین کی وجہ سے دونوں یا تینوں ملکوں کے ادبی معیار کا پتا چلتا تھا اور بہ راہِ راست فیصلے کی گنجایش پیدا ہوتی تھی مگر اَب اگر کوئی تنقیدی فیصلہ سامنے آتا ہے تو اُس میں بالعموم وہ نقاد اپنے ملک کی سرحد سے باہر نہیں نکلتا اور اگر باہر نکلنے کا موقع ملا تو گنے ہوئے یا چنے گئے چند نام اور چہرے ہوتے ہیں جن کی گردان پر تنقید کا حق ادا کر دیا جاتا ہے مگر غالب کے لفظوں میں: 'حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا'۔

نئی تنقید ایک طرف اطّلاعات کی فراوانی میں یہ بھروسا قایم کرتی ہے کہ آج کے نقاد کا دائرۂ علم کسی بھی زمانے سے زیادہ وسیع ہے۔(۷) اپنی اُنگلی کی نوک پر وہ تمام طرح کی علمی و ادبی اطّلاعات کو آزمانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر کیا اِس فراوانی کے مقابلے آج کے نقاد کے پاس وہ کسوٹی ہے جس سے جانچ پرکھ کر کے وہ بتا سکے کہ اپنے مضمون یا کتاب میں اپنے عہد کے جن افراد کو انھوں نے منتخب کیا اُن کی حیثیت نمایاں فن کار کی تھی؟ یہ پیچیدہ اور مشکل کام ہے۔ آج نقادوں کا حقیقی عمل یہ ہے کہ انھیں جن کے بارے میں اطّلاع مل گئی، وہی معتبر اور جس کو نہیں جانا وہ نامعتبر۔ اطّلاعات کی بھیڑ میں الگ سے معتبر اور نامعتبر کے بیچ ذاتی امتیاز کی لکیر کھینچنا کسی نقاد کے لیے اور خاص طور سے اُس کے لیے جس نے سوشل میڈیا اور عمومی ذرایع اطّلاعات پر تکیہ کر رکھا ہو، مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ اِسی لیے ہم عصر تنقید میں ذاتی پسند و ناپسند کی بنیاد پر فیصلوں کا بول بالا ہے۔ آج یہ آسانی سے نہیں کہا جا سکتا کہ چار مشہور نقادوں نے جس کتاب کو اپنی تحریر سے اعتبار بخشنے کی کوشش کی وہ کتاب واقعتاً اپنے معیار کی ضامن ہے۔ اِسی طرح جس مصنّف یا کتاب کو نقاد نہ ملے یا بعض نقادوں نے ملامت کے غبار میں سیاہ بختی کا تمغہ پہنایا؛ اُس مصنّف یا کتاب کے بارے میں لازمی طور سے یہ مان لیا جائے کہ وہ معیار سے گری ہوئی شَے ہے، کبھی کبھی دھوکے کا باعث ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ کہ آج کے نقاد کے فیصلوں پر عام قاری پورے طور پر اعتبار کر لے تو دین و دنیا دونوں جگہ سے وہ راندۂ درگاہ ہو سکتا ہے۔

آج کی تنقید یا ہمارے دور کے نقاد کی پسپائی یہ ہے کہ نہ اُن کے علم پر ایک زمانہ تکیہ کر رہا ہے اور نہ ہی اُن کے فیصلے کو حرفِ آخر کہا جا رہا ہے۔ اُنھیں صاحبِ علم اور گہرا ادبی شعور رکھنے والا بھی کون مان رہا ہے۔ بڑی مجلسوں میں اِن کی باتیں غور سے سننے والے کم اور چٹخارے کے طور پر اِن کی طرف توجہ کرنے والے زیادہ نظر آتے ہیں۔ مطالعے کا عمومی رجحان کم تر ہوا اور آسانیوں کے باوجود دوسری زبانوں کے

علمی سرمایے سے رغبت بھی گھٹی ہے۔ ذاتی غور وفکر اور بے لاگ فیصلے کا حوصلہ ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گننے لایق افراد کے پاس بھی بہ مشکل ہو؟ آزادانہ مطالعے کا حال نقادوں کے یہاں اتنا بُرا ہے کہ جن موضوعات پر انھیں کچھ لکھنا ہے، اُنھی کے دائرے میں وہ گھومنا آخری کام سمجھتے ہیں۔ آزادانہ مطالعہ اور شوقِ آوارگاں اب صرف اور صرف گذشتہ لوگوں کی کہانی ہے۔ رسائل و جرائد بھی پہلے کی طرح تازہ لہو کے چھینٹوں سے اپنی زبان کی طاقت کو اور مستحکم کرنے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے۔ افسانے ناول لکھے جا رہے ہیں، شاعری میں روز نئے چہرے سامنے آ رہے ہیں مگر تنقید کا یہ حال ہے کہ قد آور ایک آدمی نظر نہیں آتا۔ پُرانے دور کے لوگ اب بھی حکمراں کی طرح بساطِ تنقید پر چھائے ہوئے ہیں۔ نئی نسل کے نقاد جب تک بہترین علمی سرمایہ پیش نہ کرتے ہیں، اس وقت تک اس بات کا اقرار کرنے میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں محسوس کرنا چاہیے کہ ہمارے زمانے کا تنقیدی سرمایہ ترقی پسند یا جدید سرمایۂ نقد سے کم تر درجے کا ہے اور نقاد یوں بھی صفِ اوّل میں کوئی آیا ہی نہیں۔ یہ حقیقت افسوس ناک ہے مگر ہمیں اُس دن کا انتظار کرنا چاہیے جب آج کا نیا نقاد اپنے بے پایاں علم، اپنے بے لاگ فیصلے اور گہرے مطالعے اور تجزیے کی بنیاد پر جو تنقیدی شہہ پارہ پیش کرے گا، اُسے بڑا تنقیدی نمونہ قرار دیا جائے گا۔ اُسی وقت نئی نسل کے حالی اور شبلی، کلیم الدین احمد یا فاروقی اور نارنگ میسّر آئیں گے۔

حواشی:

(۱) اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک از خلیل الرحمان اعظمی صفحہ۔۸۷، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۲۰۰۶ء

(۲) مابعدِ جدیدیت: مضمرات و ممکنات از عبدالوہاب اشرفی صفحہ۔۱۲۶، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

(۳) تاریخِ ادبِ اردو (جلد سوم) از وہاب اشرفی، صفحہ ۱۱۳۲۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء

(۴) رسالہ کتاب نما، صفحہ ۳، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء

(۵) جدیدیت کی فلسفیانہ اساس از شمیم حنفی، صفحہ۔۷۳، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء

(۶) اردو کی نئی بستیاں از گوپی چند نارنگ، صفحہ ۴۵، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، ۲۰۰۶

(۷) کیٹلاگ: ریختہ ڈاٹ آرگ از ڈاکٹر عبدالقدّوس، صفحہ ۵-۴، لولو پرنٹرس، حیدرآباد۔ ۲۰۲۰

اکیسویں صدی میں مغربی بنگال کا اردو افسانہ اور عصری مسائل

صوفیہ شیریں*

غیر منقسم بنگال (جس میں بنگلہ دیش بھی شامل ہے) عہد قدیم سے ہی اردو زبان وادب کا مرکز رہا ہے۔ ادب کا کوئی بھی مورخ فورٹ ولیم کالج، ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور ان کے دیگر رفقائے کار کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ کا کہنا ہی ہے کہ ''اردو نثر کی ابتدا فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی'' (1)

صرف نثر ہی کیوں آپ اردو کے سب سے پہلے پریس کا ذکر کریں تو فورٹ ولیم پریس اور سیرام پور پریس کا ذکر ضرور آئے گا۔ سب سے پہلے اردو رسالے کی بات کریں تو اپریل ۱۸۲۳ء میں کلکتہ سے نکلنے والے ہفت روزہ ''جام جہاں نما'' کا نام آئے گا۔

صوفیائے کرام کی آمد کی بدولت چودھویں صدی کے اواخر ہی سے مقامی زبانوں کی شکست و ریخت کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ سترھویں صدی کے اوائل سے یہ زبان شمال میں مغرب سے مشرق تک رابطے کی زبان بن گئی اور جہانگیر نگر (آج کا ڈھاکہ) ایک نیا علمی وتہذیبی مرکز بن کر ابھرا۔ بنگال کی خوش نصیبی کہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا جو کہ اردو نثر کا پہلا اور اہم گہوارہ تھا۔ بنگال میں علم وادب کے فروغ میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے اور اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ واجد علی شاہ کے مٹیا برج میں بند ہونے کے بعد جو کبھی ویرانہ تھا دوسرا لکھنؤ بن گیا۔ غرض زمانہ قدیم سے اب تک بنگال اردو زبان وادب کی بیش بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔

ہم جب کسی پودے کی ارتقائی منازل کی بات کرتے ہیں تو بیج، انکور، تنے اور شاخوں کا ذکر

---

*اسسٹنٹ پروفیسر (SACT)، سریندر ناتھ ایوننگ کالج، کولکاتا، انڈیا

ناگزیر ہو جاتا ہے ٹھیک اسی طرح افسانے پر گفتگو کرتے وقت اس کی ابتدائی ترقی پذیر اور ترقی یافتہ شکلوں سے گریز نہیں کیا جا سکتا۔ افسانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بلاشبہ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ بنگال' افسانوی ادب کی جنم بھومی ہے۔ کیوں کہ فورٹ ولیم کے مشہور منشی حیدر بخش حیدری کی وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں جو بنگال آرمی کی ترجمانی کے لئے ''حکایت لطیف'' کے عنوان سے مرتب شدہ مجموعہ میں شامل ہے جسے کلکتہ ایشاٹک لیتھو پریس نے ۱۸۳۰ء میں چھاپا اس میں مختصر افسانے کی اکثر خصوصیات مل جاتی ہیں۔ عبادت بریلوی کی اس رائے سے اختلاف ممکن نہیں کہ: ''یہ کہانیاں مختصر افسانے کی فنی روایت میں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔''(2)

اس کے علاوہ میر امن کے ''باغ و بہار'' سے اس نام نہاد ربط کو ہٹا دیجئے جس کے ذریعہ اس کے الگ الگ قصوں کو جوڑا گیا تو اس کتاب کو طویل افسانوی مجموعہ کہہ سکتے ہیں ساتھ ہی انشاء اللہ خاں انشاء کا طبع زاد سلیس اور بامحاورہ اردو میں لکھا ہوا وہ قصہ یاد کیجئے جس میں ''رانی کیتکی کی کہانی'' بیان کی گئی ہے جسے ایران سوسائٹی نے ۱۸۱۶ء تا ۱۸۱۷ء کے درمیان شائع کیا۔ یقیناً ان کا شمار افسانوں میں نہیں ہوگا لیکن یہ کہنا جائز ہے کہ انہوں نے افسانے کی بنیاد فراہم کی۔

جب بات افسانے تک پہونچ گئی ہے تو عرض کروں کہ افسانہ انسان کے جذبۂ بے اختیار کے تراشیدہ اظہار کا حسین اور پر اثر پہلو ہے اور کسی بھی عہد میں انسان اس جذبے سے خالی نہیں رہا۔ جذبۂ بے اختیار اپنی شکل بہتر سے بہتر تراشتا رہا اور مختلف حالات و حادثات کے دوران اپنی ابوالعزمی کا ثبوت فراہم کرتا رہا۔

بنگال میں باضابطہ طور پر افسانہ نگاری کی ابتداء ترجموں سے ہوئی جلد ہی ارضِ بنگالہ نے افسانوں کو ترجموں کی گود سے نکال کر تخلیقیت کے کرب سے آشنا کیا اور یوں بنگال کی سرزمین متعدد افسانہ نگاروں کی نگارشات سے لہلہا اٹھی۔ ل احمد' عندلیب شادانی (ڈھاکہ)' جمیل مظہری' سلیمان واصف' راحت آرا بیگم' یونس احمد' نشاط الایمان' صالحہ بیگم مخفی' شائستہ سہروردی' حسن نجمی' جوہر غازی پوری' شمس صابری' شین مظفر پوری' شمس ندیم' سالک لکھنوی' ظفر اوگانوی اور جاوید نہال بنگال کے افسانوں کے وہ علم

بردار ہیں جن کا تعلق بیسویں صدی سے تھا۔

بیسویں صدی میں بنگال کے افسانوں نے کبھی ترقی پسندی کی شاہراہوں میں چلتے ہوئے ''شانتی زندہ ہے'' کے نعرے لگائے تو کبھی جدیدیت کے ہمراہ علامتوں کے جنگلوں میں بھٹکتے ہوئے ''بیچ کا ورق'' ہی کھو بیٹھا تو کبھی کہانی کی واپسی کے ساتھ ''ڈوبتے سورج کے کرب'' سے آشنا ہوکر ''اب وہ اترنے والا ہے'' کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی یہ انتظار ختم ہی نہیں ہو پایا تھا کہ افسانہ چپکے سے اکیسویں صدی میں داخل ہوگیا جہاں مشینی زندگی میں گم ہوتا ہوا انسان' عدم وجود کے تحفظ کا احساس' بکھری ہوئی قدریں' انسانیت کا المیہ' سائنس وٹکنالوجی کے منفی اثرات، ملکی وغیر ملکی سیاست' فرقہ وارانہ مسائل' اخلاقی پستی جیسے مسائل اس کا موضوع بنے۔ ان مسائل کے سبب انسان جن صدموں سے دوچار ہے ان کو اکیسویں صدی کی تقریباً دو دہائیوں میں مغربی بنگال کے اردو افسانہ نگاروں کے درپن میں دیکھا جاسکتا ہے کہ ادیب اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ نئے نئے مسائل وموضوعات اس کے دل پر دستک دیتے ہیں۔ سماج میں ہونے والی اتھل پتھل کے اثرات اسکے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں۔ ایک حساس فنکار ان عصری مسائل وموضوعات کو تخیل کی بھٹی میں پکا کر مشاہدہ کی کسوٹی پر پرکھ کر خونِ جگر کی آمیزش کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔

سعید پریمی' اقبال کرشن' نذیر احمد یوسفی' مشتاق اعظمی' فیروز عابد' انیس رفیع' ف س اعجاز' اظہار الاسلام' محمود یاسین' انیس البنی' صدیق عالم' عشرت بے تاب' شہیرہ مسرور' کمال احمد' شہناز نبی' مشتاق انجم اور جلیل عشرت وغیرہ اکیسویں صدی کی دہلیز پر مغربی بنگال میں اردو افسانے کے پیش رو ہیں۔ ان بزرگ افسانہ نگاروں نے کم وبیش ہر تحریک سے خود کو منسلک رکھا اور اپنے عہد کے شعلہ بار موضوعات کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔

سعید پریمی اپنی کتاب ''میرے اپنے'' کے ذریعہ قاری کو دعوتِ فکر دیتے نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے کا ایک افسانہ ''آواز کا سحر'' ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے سماجی مسئلے کو پیش کرتا ہے جو صدیوں سے ہے اور صدیوں رہے گا۔ ایک اندھی لڑکی کی آواز کے سحر میں کھو کر راوی کا اس سے رشتۂ ازدواج میں بندھنے کی خواہش اور پھر باپ کا یہ کہنا کہ: ''لیکن ایسا ممکن نہیں' آنکھ والوں کے شہر میں میری اندھی بیٹی کھو جائے گی'' (3)

قاری کو چونکاتا ہے کیوں کہ آخر تک قاری کو یہی گمان رہتا ہے کہ اپنی اندھی بیٹی کے لئے پنڈت جی ہاتھ جوڑ کر کہیں گے ''میں آپ کا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ رشتے کی بکھرتی ٹوٹتی کڑیوں کے عہد میں سعید پریمی کے یہاں ''آواز کا سحر'' میں پدری محبت کی رمق تیز ہے۔ اس کے برعکس نذیر احمد یوسفی کا افسانہ ''کنکری'' ناخلف اولاد کے کرتوت کی کہانی ہے۔ انسانی قدروں کی شکست وریخت کا مسئلہ افسانہ کے لئے کوئی نیا نہیں ہے لیکن اکیسویں صدی کا معاشرہ جدید ٹکنالوجی اور جدید ذہن کا معاشہ ہے جہاں زندگی کے بدلتے لمحات اور وقت کی تیز دھار نے انسانی قدروں اور رشتوں کے بھرم کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ جس کا بھرپور عکس ہمیں افسانہ ''کنکری'' میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ حج کے لئے پائی پائی جمع کرنے والے باپ کی رقم جب اس کا بیٹا چوری چھپے بینک اکاؤنٹ سے نکال لیتا ہے تو وہ خانہ کعبہ کے شیطان کو کنکری مارنے کے بجائے اصل شیطان کو کنکری مارنے کا سپنا دیکھتا ہے۔ افسانہ کنکری انسانی رشتوں کی سفاکی کا مظہر ہے۔

آج کی نسل نہ صرف بے حس ہے بلکہ ذہین اور ہونہار بھی ہے۔ اسے ماحول اور حالات کا گہرا احساس ہے لیکن اس نسل کے پاس بوڑھے والدین کے لئے نہ وقت ہے نہ دل میں محبت اور نہ گھر میں جگہ۔ ہمارے بزرگوں کی بے گھری اکیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے فیروز عابد افسانہ ''منزل بے منزل'' میں نئی نسل کی اس عیاری کو عیاں کرتے ہیں:

> ''ڈونٹ بی سلی پاپا! ہوم میں آپ کو ہر طرح کا آرام ملے گا اور آپ کے ہوم چلے جانے کے بعد ہمیں بھی اطمینان نصیب ہوگا۔ میں اپنا کام بحسن وخوبی کرسکوں گا۔ کیا آپ میری ترقی نہیں چاہتے پاپا'' میرے بیٹے کے الفاظ میں میری بہو کے الفاظ شامل تھے۔''4

جدید شاعری ہو یا افسانہ بنگال کے لکھنے والوں نے کبھی سیاست اور سماج کی زندہ مسائل سے رو گردانی نہیں کی مغربی بنگال میں بائیں بازو کی انقلابی تحریک اور طویل عرصے تک حکومت نے لکھنے والوں کو وہ سیاسی شعور اور سماجی آگہی عطا کی ہے جس سے ترقی پسندی کے بعد کا ادب بڑی حد تک عاری ہو چلا تھا۔ بنگال کا افسانہ سیاست سے پیدا شدہ مسائل کو نہ صرف اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہے بلکہ ان سیاست دانوں

کے کالے کرتوت کو ہو بہو صفحۂ

قرطاس پر منتقل کر سماج کو آئینہ دکھا رہا ہے۔ فیروز عابد کا افسانہ ''تشنہ لب'' سیاسی جماعتوں کی بے مروتی کی کہانی ہے جس میں مرکزی کردار برسوں تک پارٹی کا جھنڈا تھامے نظام بدلنے کی خواہش میں دنیا سے چلا جاتا ہے پر خود غرض سیاستداں اس کی پوری زندگی کی محنت کا معاوضہ ایک انڈین ہوائی کمپنی کے رعایتی بورڈنگ کارڈ کے ذریعہ چکاتے ہیں۔ ''لالو تو نہ کہتا تھا تیری چچی کو ٹیکسی پر نہ بٹھا سکا دیکھ میری موت نے اسے ہوائی جہاز پر بٹھا دیا۔'' (5)

یہ افسانے کا وہ طنزیہ جملہ ہے جو سیاسی پارٹیوں کے تمام قبائیں ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ انیس البنی کا افسانہ ''بھرت راج'' عصری تناظر میں لکھا گیا ایک اچھا افسانہ ہے جس کے مختصر کینوس پر نظریاتی جنگ بر سر پیکار ہے۔ اس افسانے کا تھیم ''رام راج'' کے تصور کو یکسر مسترد کرتا ہے اور پیغام دیتا ہے کہ صبر و ضبط' تہذیب و شرافت جس قائد کے اندر ہو اس کو آئیڈیل مان کر تخت و تاج کی جنگ لڑنی چاہئے۔ ''بھرت راج'' کے تحت سیاسی متعصبانہ رویوں کو روشناس کیا گیا ہے۔ پیغمبر لوط کے عہد کی واپسی کا اشارہ مشتاق اعظمی کا افسانہ ''نارسیدہ'' ہے۔ جو عہد حاضر کا ایک پے چیدہ موضوع بن گیا ہے کہ اسے قانونی تحفظ بھی حاصل ہو چکا ہے۔ اس افسانے میں نفسیات اور خود لذتی کی آمیزش ہے لیکن کراہیت اور فحاشی نہیں۔ اس افسانے میں ایک مخصوص عمر میں اپنے ہم جنس کی طرف ملتفت ہو جانا کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کا ایک اور افسانہ ''رول نمبر ۴۷'' بھی ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرتا ہے کہ اس میں عصرِ حاضر کے ایک بڑے مسئلے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ باصلاحیت لوگوں کا رد کیا جانا۔ کامیابی کی دوڑ میں ان کا پیچھے رہ جانا اور چاپلوسی و سفارش کے بل بوتے پر نا اہلوں کا عہدہ بر آ ہونا آج کے عہد میں عام بات ہے۔ رول نمبر ۴۷ پروفیسروں کا منظور نظر تھا کیوں کہ وہ نہ صرف ان کے گھریلو کام کرتا بلکہ ان کی فرمائش پر مقامی اخبارات میں ان پر مضامین بھی لکھتا رہتا اور اپنی اسی خوبی کے بدولت وہ کامیابی کے زینے طے کرتا رہتا۔

بنگال کے افسانے قومی' سیاسی' معاشرتی یا سماجی سطح پر ہی نہیں ہیں بلکہ اکیسویں صدی میں پیدا ہونے والے عالمی مسائل کو بھی افسانوی قالب میں ڈھالنے کا فریضہ بہ حسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔

دہشت گردی اور فرقہ وارانہ فسادات آج کے دور میں ایک عالمی مسئلہ بن چکا ہے۔ نذیر احمد یوسفی کا افسانہ ''دوسو قدم کا ڈر'' فرقہ وارانہ فساد سے پیدا شدہ سانحات اور بھاری بوٹ والوں کے قہر کا ہو بہو نقش واضح کر رہا ہے۔ فرقہ وارانہ فساد سے یکا یک افراتفری مچتی ہے۔ ہراساں لوگ بھاگتے پھرتے ہیں۔ شہر کی مخدوش فضا، مظاہرین کے نعرے اور پھر سر پھرے بلوائیوں کی من مانی سے پریشان ہو کر گیان جی آفس سے نکل کر گھر کی طرف پیدل ہی چل پڑتے ہیں کہ گاڑیاں اور سواریاں کہیں نظر نہیں آتیں۔ راستے میں بھاری بوٹوں کی گونج قریب محسوس ہوئی تو جائے پناہ کے لئے وہ کچرے کے ڈبے میں جا چھپے اور پھر جو گیان جی نے کچرے کے ڈبے میں چھپ کر سنا وہ سوہان روح ہے۔

> ''ایک شور سا ہوا۔ لگا' بوٹ والے کسی بند دروازہ کو کھلوانے کی کوشش میں ہیں ۔۔رات کا کون سا پہر تھا' وہ کہہ نہیں سکتے تھے' آوازوں میں عاجزی اور خوف کی آمیزش نمایاں تھی۔۔۔۔ایک کرخت آواز ابھری۔۔۔ چلاتی کیا ہے' آدھے گھنٹے کی تو بات ہے۔۔۔ مردانہ احتجاج ایک پرشور ڈانٹ اور پھر آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ دراز۔ پھر کیواڑ کھلنے اور بند ہونے کے دوران تڑ تڑ کی کریہہ آوازیں اور لامتناہی سناٹا۔'' (6)

بھاری بوٹوں کی آواز' یہ آواز تو ہم سالوں سے کشمیر سے لے کر دلی اور بنگال تک سنتے آرہے ہیں۔ دہشت گردوں کے آتنک سے شاید ہم بچ بھی جائیں پر ان پر بھاری بوٹ والوں کے آتنک سے عوام کو کون بچائے۔ انیس رفیع کا افسانہ ''کرفیو سخت ہے'' بھی فرقہ وارانہ فساد پر بہترین افسانہ ہے۔ ٹکنیک اور اسلوب مختلف ہے۔ مذکورہ ذکر افسانے میں ہندوستان کی صدیوں پرانی گنگا جمنی تہذیب کے بکھراؤ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ہندو مسلمان دونوں قومیں صدیوں اس ملک میں ساتھ ساتھ رہے اور گنگا جمنی تہذیب کو پروان چڑھایا کہ اچانک سورج لاپتہ ہو گیا۔ یہاں سورج کا لاپتہ ہونا کسی اہم بات کی طرف اشارہ ہے۔ ملک کی آزادی اور تقسیم کے ساتھ ہی نفرت و نفاق کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور پھر بابری مسجد کی شہادت سے گنگا جمنی تہذیب کا جنازہ ہی نکل گیا۔ ہندوستان کے کرفیو زدہ ماحول میں مسلمانوں کی حالت اپنے ہی ملک میں

اجنبیوں سی ہو کر رہ گئی۔ ان سنگین حالات میں جی رہے لوگوں کی کسمپرسی عیاں ہے۔ افسانے کے آخری مرحلے میں افسانہ نگار نے اپنی پوری فکر سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دونوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اسی آواز کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہر دو چار مکانوں کے بعد انہیں ملے نظر آئے اور ان ملبوں سے لہولہان لوگ نظر آئے۔ جہاں کہیں بھی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ وہاں مسجد ضرور ہوگی۔ ہزار ہا پل بیتتے چلے جا رہے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھائے اٹھائے کتنا لمبا سفر طے کیا۔ مگر ایک نقطہ بھی آیا جہاں انہیں آواز کا آخری سرا مل گیا۔ لوگ نماز کے لئے باجماعت کھڑے تھے اور سب کے ہاتھ اوپر اٹھے تھے۔ وہ دونوں بھی جماعت میں کھڑے ہو گئے مگر انہیں حیرت اس وقت ہوئی جب ان کے ہاتھ بھی اوپر سے نیچے نہ آ سکے۔'' (7)

عالمی مسائل کی پیشکش میں بنگال کے افسانوں کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں کا افسانہ محض خونی کھیل کا منظر ہی نہیں پیش کر رہا بلکہ یہ دہشت گردوں کے نہاں خانوں میں اتر کر ان کی ذات و کردار کا تجزیہ بھی کر رہا ہے۔ ف۔س۔ اعجاز کا افسانہ ''خدا کے نام خط'' امن عالم کے موضوع پر لکھا گیا ایک اچھا اور پر تاثر افسانہ ہے جس میں مشرق وسطیٰ میں ہو رہے مظالم کی روداد فن کاری کے ساتھ پیش کر کے مغربی دیواروں سے رحم کی التجا کی جا رہی ہے۔ مذکورہ ذکر افسانہ دہشت گردوں کے اصلی چہرے پر چڑھے نقاب کو نوچ کر پھینک دیتا ہے اور عالمی سطح پر حالیہ برسوں کی تباہی و بربادی کی داستان سناتا ہے۔

> ''وطنیت خون میں نہ اتری ہو تو وطن کی محبت دل میں کب پیدا ہوگی۔ جو لوگوں وطن سے بندھے نہ ہوں۔ زمین کی سرکشی پر معمور ہوں وہ نفرت اور سوفسٹی کیٹڈ ہتھیاروں کی تجارت کے سوا کیا کر سکتے ہیں۔'' (8)

نئی صدی میں سانس لینے والا انسان کے دل سے مروت اور محبت دم توڑ چکی ہے۔ وہ اپنی جسمانی خواہشات کو تقویت دینے کے لئے اپنے خونی رشتے کا بھی خون کرنے سے نہیں چوکتا۔ صدیق عالم کا افسانہ ''جانور'' عصرِ حاضر میں انسان نما جانور اور جانور نما انسان کی کہانی بڑے لطیف انداز میں سناتا

ہے۔ ہم لاکھ کوشش کرلیں اپنے اندر کے جانور کو مکمل طور پر نہیں مار سکتے جب کہ تھوڑی سی کوشش سے ہی جانور انسانوں کے درمیان رہنا سیکھ لیتا ہے۔ افسانہ ''جانور'' میں ماں باپ اپنے Abnormal بچے کو بیس سال شفقت و محبت سے پالنے کے باوجود اس پر ایک ہیبت ناک جانور کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی اولاد جانور کے سودائی کے حوالے کردیتے ہیں کہ ایسا کرنے سے انہیں ایک پرسکون زندگی ملتی ہے اور اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے مواقع بھی۔ یہ افسانہ انسان کی نفسیات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ جانور کے سودائی کے چند جملے ملاحظہ کریں:

> ''میں جو جانور لے جارہا ہوں اس سے ہمارا کوئی جذباتی تعلق نہیں۔ جس طرح جو جانور میں چھوڑے جارہا ہوں اس سے آپ لوگوں کا کوئی جذباتی رشتہ نہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ سودا واقعی برا نہیں۔ یہ انتظام سب سے بہتر ہے بلکہ اس انتظام کے تحت زندگی زیادہ بہتر طریقے سے گزاری جاسکتی ہے۔'' (9)

کمال احمد کا افسانہ ''کاندھے سے نکی لاش'' بھی سڑے گلے معاشرے کی تصویر دکھاتا ہے۔ یہ افسانہ علامتی پیرائیہ میں بیان کیا گیا ہے جس میں شناخت کے مسئلے کو موضوع بنایا گیا ہے افسانے کا مطالعہ یہ تاثر دیتا ہے کہ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں وہاں زندہ تو کیا مردہ کی بھی شناخت ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ افسانہ نگار نے کہانی کی ابتدا سرد خانے سے کی ہے جہاں سے راوی اپنی بیوی کی سرد اور اکڑی ہوئی لاش کاندھے پر ڈالے بھاگتا ہے اور جلد از جلد قبرستان پہونچنا چاہتا ہے۔ لاش کو دفنا کر وہ جب وہ گھر واپس آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کے گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ ہے۔ ایک خاتون اس سے آکر پوچھتی ہے:

> ''کہاں چلے گئے تھے تم؟ جنازہ کب سے تیار پڑا ہے اس سے دین مہر معاف کراؤ اور میت اٹھنے کی اجازت دو۔'' (10)

اظہار الاسلام کا افسانہ ''وہ آدمی' جو آج کی بے ضمیری اور بے مروتی کی تھیم پر لکھا گیا ہے۔ ہمارے عصر کا سب سے شعلہ بار موضوع ہے رشوت خوری جس کے نیچے دب کر انسانیت مرگئی ہے کہ بے ضمیر انسان زندہ لاش بن کر رہ گیا ہے۔ ایک انسان جب تک رشوت خوری سے اپنا دامن بچاتا ہے رہتا ہے

اس کا ضمیر اس کا ساتھ دیتا ہے جس کی وجہ سے اسے طمانیت قلب کا احساس ہوتا ہے اور دور کھڑا ''وہ آدمی'' جو دراصل اس کا ضمیر ہے اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ جس دن وہ رشوت قبول کر لیتا ہے اسی دن وہ بھی اندر سے مر جاتا ہے اور اس کا ضمیر اسے دور سڑک پر مردہ حالت میں دکھائی دیتا ہے۔ حالانکہ اس نے ضمیر کا سودا مجبوری میں کیا تھا۔ غرض یہ افسانہ انسان کی بے ضمیری کے ساتھ ساتھ مادیت کی طرف اس کے رجحان کا اشاریہ ہے۔

دنیا میں شہر کاری Urbanisation میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ عظیم تر اور منصوبہ بند شہروں کا تصور ابھر کر سامنے آ رہا ہے۔ جہاں چند کمروں پر مشتمل فلیٹ کلچر کمزور پڑتی اخلاقی قدروں اور بے پناہ ماحولیاتی آلودگی کے ساتھ آپ کا استقبال کر رہا ہے۔ اکیسویں صدی میں کسی حد تک بنگال کے افسانہ نگاروں نے دیہاتوں سے اپنا رشتہ توڑ کر شہری مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے مشتاق انجم کا ایک افسانہ ''بجھا ہوا سگریٹ'' جس میں شہری زندگی کی گھٹن، درد و الم اور کثیف ہوا کی فضا ملتی ہے جس سے اکتا کر فنکار دیہی زندگی کی پرسکون آغوش میں پناہ چاہتا ہے۔ گویا دیہات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔ اس افسانے میں نئی نزاکتوں کو اس طرح برتا گیا ہے کہ عصری آگہی کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

عورتوں کا جسمانی و ذہنی اور جذباتی استحصال افسانے کا موضوع ہمیشہ سے رہا ہے اور اکیسویں صدی میں بھی یہ مسائل ہمارے سامنے جوں کے توں کھڑے ہیں لیکن اکیسویں صدی میں ان مسائل کی نوعیت تھوڑی مختلف ہے۔ نئے معاشرے، نئی تہذیب میں عورت کی حیثیت محض ایک الکٹرانک مشین کی سی ہو کر رہ گئی۔ استعمال کیا اور پھینک دیا معاف کیجئے مار کر پھینک دیا۔ اکیسویں صدی کا معاشرہ عورت کی حیثیت کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن ہنوز ان کا حق دینے سے قاصر ہے لیکن آج کی عورت نے احتجاج کرنا اور اپنے لئے فیصلہ لینا سیکھ لیا ہے۔ شہیرہ مسرور کا افسانہ ''نسلوں کی کیل میں ٹنگا رشتہ'' معاشرے میں صدیوں سے عورت کی بنی امیج کو توڑتا نظر آتا ہے۔ عورت اپنی شخصیت اور خاص فطرت کی وجہ کر ہی رشتوں کو سنبھال کر رکھ پاتی ہے اور خاص کر جب وہ ماں بن چکی ہو تو اس کے مزاج میں ایک خاص قسم کا جھکاؤ پیدا ہوتا ہے جسے ہم حالات سے سمجھوتا بھی کہہ سکتے ہیں۔ سمجھوتا کرتے کرتے وہ تھک چکی ہے اور احتجاج کر رہی ہے۔

''یہ ساری مائیں جھکتی کیوں ہیں؟'' یہ ہماری قسمت ہے۔'''' ماں کہتی ہے

''نہ کہ ہماری کمزوری''۔ میں پوچھتی ہوں۔

''ان سے ٹوٹے رشتے جڑتے ہیں اور جڑے رشتے مضبوط ہوتے ہیں'' ماں نے کہا

''جھکنے سے اگر رشتے بنتے'' مضبوط ہوتے ہیں تو ایسے رشتے بچا کر فائدہ کیا۔

میں تو باقی نہیں بچوں گی'' میں نے احتجاج کیا۔ (11)

اسی طرح شہناز نبی کا افسانہ ''کبڑوں کی بستی'' میں کملا ایک کمزور عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے جس کا رمیش مالی طور پر استعمال کرتا ہے۔ کملا جسمانی طور پر کبڑی ہے پر وہ رمیش کی زیادتیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور مرد کے اس ذہنی کپڑے پن پر انکار کا طمانچہ جڑ دیتی ہے جو عورتوں کو پیروں کی جوتی سمجھتا ہے اور ان ہی کی کمائی پر زندہ رہنا چاہتا ہے۔

''کملا نے پورے اعتماد اور سکون سے کہا اور پھر دھیرے دھیرے رمیش کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ رمیش نے اس کی شعلہ بار آنکھوں سے بچتے ہوئے کچھ کہنا چاہا پر اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

میرا مطلب ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کملا نے اسے باہر کا رستہ دکھاتے ہوئے کہا، مجھے کبڑوں میں کوئی دلچسپی نہیں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' (12)

ان افسانہ نگاروں کے علاوہ شبیر احمد، فہیم اختر، سلیم سرفراز، عظیم اللہ ہاشمی، سہیل ارشد، جاوید نہال حشمی، شکیل افروز، ریاض دانش، شیران اسماعیلی، ارشد نیاز، عمران قریشی، محمد علی حسین شائق، صابرہ خاتون حنا، یاسمین اختر اور شاہین سلطانہ کے یہاں ایسے ہی کرب انگیز ماحول پر تخلیقات ہیں جو اپنے عصر کی کربناکی، سفاکیت، بے ضمیری، بے بسی اور بے حیائی کے پردے کو چاک کرتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں بنگال کے افسانہ نگاروں نے اپنے گردوپیش کی زندگی سچائی کے ساتھ پیش کر کے عام قاری کو عصر حاضر کے مسائل کا آئینہ دکھایا ہے اور سماج سے لے کر سیاست تک تمام مسائل کو

افسانے کے دامن میں سمیٹا ہے۔ بحر حال اکیسویں صدی کی دہلیز پر اردو افسانے کی جڑیں زندگی اور اس کے مسائل کی مٹی میں پیوست نظر آتی ہیں لیکن اردو افسانے کی زرخیز مٹی میں یہ موضوعات کی آخری تخم ریزی نہیں ہے۔ بلکہ ابھی ارتقاء کے کئی منازل طے کرنے باقی ہیں۔

حوالہ جات

(۱) رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، خاتون مشرق اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۱۹۶۶ء

(۲) ڈاکٹر شمیم رضوی، اردو ادب کے فروغ میں حیدر بخش حیدری کا حصہ، لکھنؤ، ۲۰۰۸ء

(۳) سعید پریمی، میرے اپنے، مژگان پبلی کیشنز، کلکتہ، ۲۰۰۸ء

(۴) عابد ضمیر، بھیگی پلکیں، اثبات ونفی پبلی کیشنز، کلکتہ، ۲۰۰۳ء

(۵) فیروز عابد، تشنہ لب، ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، اکتوبر، ۲۰۰۷ء

(۶) صدیق عالم، مرے ہوئے آدمی کی لالٹین، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۹ء

(۷) کمال احمد، کاندھے سے ٹکی لاش، سہ ماہی تسلسل، آسنسول، جولائی تا ستمبر، ۲۰۱۲ء

(۸) نذیر احمد یوسفی، دو سو قدم کا ڈر، اثبات ونفی پبلی کیشنز، کلکتہ، ۲۰۰۷ء

(۹) انیس رفیع، کرفیو سخت ہے، عزیز رفیع، پٹنہ ۲۰۰۳ء

(۱۰) ف۔س۔اعجاز، پلوٹو کی موت، انشاء پبلی کیشنز، کلکتہ، ۲۰۱۲ء

(۱۱) شہیرہ مسرور، نسلوں کی کیل پر ٹنگا رشتہ، ماہنامہ آج کل، نئی دہلی، مارچ، ۲۰۰۹ء

(۱۲) شہناز نبی، کیڑوں کی بستی، استعارہ، نئی دہلی، جنوری تا جون، ۲۰۰۶ء

بنگلہ دیش میں اردو

(ماضی اور حال کے آئینے میں)

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد*

اردو کے بارے میں کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ اردو کے دو لفظ اگر اندھیرے کمرے میں گونج جائیں تو ہر طرف شمع سی جل اٹھتی ہے اور روشنی سی ہونے لگتی ہے اور شاید اردو زبان کی اسی روشنی اور خوشبو کی وجہ سے پوری دنیا میں اس کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور اب یہ زبان پوری دنیا میں ایک اہم زبان کی حیثیت سے جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ برصغیر سے باہر بہت سے ممالک خاص طور پر مصر، ترکی، جاپان، جرمنی، تاشقند میں اردو کی تعلیم و تدریس اور تحقیق کا اعلیٰ انتظام ہے۔ ان میں سے بعض ملکوں میں باضابطہ اردو کے شعبے قائم ہیں اور وہاں اعلیٰ پائے کی تحقیقات اردو کے حوالے سے ہو رہی ہیں۔ باہری ممالک سے بہت سے ایسے نام ہیں جن کی اردو خدمات قابل رشک ہیں اور انھیں اس زبان سے بے پناہ محبت بھی ہے۔

اردو ہندوستان میں پلی بڑھی ہے۔ ہندوستان اس کی جنم بھومی ہے مگر پوری دنیا میں اس کی عظمت کا پرچم بلند ہے۔ گارساں دتاسی ہوں، ڈاکٹر اشپرنگر ہوں، جان گل کرسٹ ہوں یا رالف رسل، سب اردو کے عاشق رہے ہیں۔ ان شخصیات نے اردو کی ثروت میں گراں قدر اضافے کیے ہیں اور اردو کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کیا ہے۔ نامانوس علاقوں میں بھی ان شخصیات نے اردو کی شمع روشن کی ہے۔ اب دنیا کی کون سی ایسی جگہ ہے جہاں اردو بولنے والے نہیں ہیں۔ معروف رسالہ 'ساقی' کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل کے نام ایک خط میں لکھا تھا

---

*ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، انڈیا

''کہ آپ دنیا میں جہاں چاہے چلے جائیں اردو بولنے والے آپ کو مل ہی جائیں گے اور صاحب یہ غضب کی ڈھیٹ زبان ہے، بڑی سخت جاں، عجب بلا ہے کہ یونانی ضمیات کے ہائیڈرا کی طرح اگر اس کا سر قلم کیا جاتا ہے تو ایک کے بدلے دو سر نکل آتے ہیں۔''

شاہد احمد دہلوی نے ایک اور اچھی بات کہی تھی کہ

''جو حلاوت، عذوبت اور شیرینی اردو زبان میں ہے کسی اور زبان میں موجود نہیں ہے۔ یہ وہ پودا ہے جس کو بادشاہوں نے اپنے خون سے سینچا، اُمرا نے اس کی نشو ونما کی اور ہندوستان کے مایہ ناز اہل قلم نے اپنے رشحات قلم سے اس کی آبیاری کی— اور ہم یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ وہ پودا کہ جس نے بادہائے مخالف کے سیکڑوں تھپیڑے سہے اور زمانے کے سرد وگرم کی لاکھوں خزائیں جھیلیں، آج یہ خوشنما درخت بن گیا ہے۔''

یہی وہ خوشنما درخت ہے جسے ہرا بھرا رکھنے کے لیے ہمیں مزید جد وجہد کرنی ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ زبان اتنی توانا اور مستحکم ہوگئی ہے کہ اس کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں۔ اس زبان نے اپنی زندگی کے سارے امکانات اور مقامات بھی تلاش کر لیے ہیں۔ امکانات میں جدید ترین ٹیکنالوجی سے اِس زبان کی ہم آہنگی ہے تو مقامات میں یوروپی ممالک، امریکہ، برطانیہ، جرمنی، جاپان، روس، فرانس، چین اور ایران وغیرہ شامل ہیں اور وہ خلیجی ممالک بھی جہاں اردو تیزی کے ساتھ پنپ رہی ہے۔ ان ممالک میں اس زبان کے تئیں جوش وجذبہ بھی ہے، وہاں کی ادبی اور ثقافتی تنظیمیں بھی اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں— یہ سب ہمارے لیے خوش آئند ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ ہندوستان سے جس اردو زبان نے سفر کیا تھا آج وہ پوری دنیا میں اپنی عظمت کے نقوش قائم کرتی جارہی ہے۔

بنگلہ دیش بھی ایک ایسا ملک ہے جس سے ہمارا نہ صرف سیاسی، سماجی، معاشی، صنعتی رشتہ ہے بلکہ ایک ثقافتی اور ادبی رشتہ بھی ہے۔ بنگلہ دیش سے ہماری قربت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ متحدہ ہندوستان کا حصہ رہا ہے۔ دونوں ملکوں کا ایک مشترکہ تاریخی اور ثقافتی ورثہ بھی ہے اور آج دونوں ممالک کے رشتے بہت سی

سطحوں پر اور مستحکم ہو گئے ہیں۔ بنگلہ دیش اور ہندوستان کے درمیان گہرے دوستانہ مراسم ہیں۔ دونوں ملکوں کے دانشوروں اور سیاست دانوں کا مسلسل رابطہ بھی قائم ہے۔ سماجی، سیاسی اور معاشی تعلقات کے علاوہ دونوں ملکوں کے مابین ایسا ایک مضبوط لسانی رشتہ بھی ہے جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ یہاں کی زبان گو کہ بنگلہ ہے مگر اردو یہاں کے لیے کبھی اجنبی نہیں رہی۔ بنگلہ اور اردو زبان میں سیکڑوں الفاظ مشترک ہیں۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ اور اجمل خان جیسے محققین نے اردو اور بنگلہ کے مشترک الفاظ کی نشان دہی کی ہے۔

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ نے بنگلہ زبان میں اردو الفاظ کی ایک فہرست بھی دی ہے۔ ان کے مطابق بنگلہ میں افیم، بڑا صاحب، بھوسی، چڑیا خانہ، چپراسی، چال باز، خرچہ، سپاہی، شامیانہ، لنگی جیسے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح بنگلہ میں اردو محاورے اور ضرب الامثال بھی استعمال ہوتے رہے ہیں اور اردو میں بھی بہت سے بنگلہ الفاظ شامل ہیں جیسے بابو، آلتا، چینی، ڈاب، رس گلا، ہلسا، ماگر، رجنی گندھا۔ شانجتی رنجن نے اپنی کتاب 'بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ' میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

سنیتی کمار چٹر جی اور سکمار سین کے مطابق ڈھائی ہزار عربی اور فارسی کے الفاظ ہیں جو بنگلہ زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح دیکھا جائے تو اردو اور بنگلہ زبان کا تعلق بہت مضبوط نظر آئے گا۔ جب تک بنگلہ دیش وجود میں نہیں آیا تھا وہاں کے بعض علاقے اردو کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے۔ اٹھارویں صدی سے ہی وہاں اردو کا بول بالا ہوا۔ خاص طور پر ڈھاکہ میں اردو کا بہت چلن تھا۔

حکیم حبیب الرحمٰن نے اس تعلق سے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ:

> ''ڈھاکہ میں ہمیشہ سے راج محلی دھوبی ہیں جو راج محلی کہتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام خان کے ساتھ راج محل سے ڈھاکہ آئے تھے۔ یہ سب کے سب اندر باہر مقامی اردو بولتے ہیں... اس میں ایک جماعت راج محلی کہاروں کی ہے، یہ اردو بولتی ہے... یہاں عرب، عراق، ایران اور بخارا کے سادات موجود ہیں۔ شیوخ میں ہر قسم کے شیخ، صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری قریشی سبھی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کثیر تعداد میں ان

مسلمانوں کی اولاد بسی ہوئی ہے جو یہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے، جیسے کشمیری۔ چنانچہ اب بھی شہر کے انتہائی مغربی حصے میں کشمیری ٹولہ موجود ہے۔ انہی کشمیری مسلمانوں میں نوابانِ ڈھاکہ ہیں۔ بنگال میں اس خاندان کی وجہ سے اردو کو بڑا فروغ ہوا اور ڈھاکہ کے باشندوں کی اکثریت اردو بولنے لگی۔''1

ڈھاکہ اور چاٹگام میں بہت سی اردو کی تنظیمیں تھیں ان میں دائرۂ ادب ڈھاکہ چاٹگام بھی تھا۔ جس کے اراکین افسر ماہ پوری، عابد دانا پوری اور وفا راشدی جیسی شخصیتیں تھیں۔ انجمن تحریک اردو ڈھاکہ بھی تھی جس کے مدیر خواجہ محمد عادل جہانگیر نگری تھے۔ انجمن تعمیر ادب چاٹگام، بزم ادب چاٹگام جیسی بہت سی تنظیمیں متحرک اور فعال تھیں۔

مرزا جان طپش، عبدالغفور نساخ، خواجہ عبدالغفار اختر، حکیم اشرف علی مست وغیرہ جیسی شخصیتوں کا تعلق سرزمین بنگلہ دیش سے ہی رہا ہے۔

اقبال عظیم لکھتے ہیں:

''مشرقی بنگال کو اس بات پر فخر ہے کہ مرزا جان طپش دہلوی جیسا معروف صاحب کمال بھی اس کے دارالحکومت ڈھاکہ میں ایک مدت تک مقیم رہ چکا ہے اور ان کے سلسلے سے کچھ ہی دنوں پہلے تک خواجہ میر درد کا خانوادۂ شاعری اس شہر میں زندہ تھا۔ چنانچہ مرزا غلام حسین آتش ولد مرزا کریم اللہ بیگ وکیل عدالت دیوانی ڈھاکہ جو یہیں کے باشندے بھی تھے، طپش دہلوی کے داماد اور شاگرد تھے اور آتش کے سلسلے سے مولوی فرجام علی بے خود باشندہ بنیا چوک ضلع سلہٹ، شیخ احمد جان عطش ساکن ڈھاکہ، مولوی رحمٰن علی طپش، مصنف تواریخ ڈھاکہ اور مرزا لطیف گستاخ باشندہ ڈھاکہ سب کے سب بالواسطہ اس خانوادہ سے منسلک ہیں۔''2

خواجگان ڈھاکہ میں سے ایسے بھی رہے ہیں جنھیں مرزا غالب سے تلمذ حاصل رہا ہے۔ اس تعلق سے اقبال عظیم نے لکھا ہے کہ:

خواجگان ڈھاکہ خاندان میں دو بزرگ ایسے گزرے ہیں جنھیں مرزا غالب سے براہِ راست شرف تلمذ حاصل تھا یعنی خواجہ عبدالغفار اختر اور خواجہ حیدر جان شائق۔ یہ بات اس زمانے کی ہے جب احمد علی اصفہانی اور مرزا غالب کے درمیان برہانِ قاطع سے متعلق مشہور ادبی معرکہ چھڑا ہوا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اس معرکے میں سارا بنگال ایک طرف تھا اور مرزا غالب تن تنہا دوسری طرف۔ ایسے نازک وقت میں مرزا کا ساتھ دینے والے صرف دو حضرات تھے یعنی میر غلام مصطفیٰ اور خواجہ حیدر جان شائق۔"3

حافظ اکرام احمد ضیغم، خواجہ عبدالرحیم صبا، حاجی عبداللہ آشفتہ، خواجہ احسن اللہ شاہین، منشی رحمٰن علی طیش وغیرہ وہ نام ہیں جنھوں نے اردو شعر و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان میں سے حافظ اکرام احمد ضیغم استاد شاعر تھے۔ عبدالغفور نساخ جیسی شخصیت نے ان سے کسب نور کیا۔ مشکل صنعتوں اور زمینوں میں شعر کہتے تھے۔

مشرقی بنگال میں اردو زبان کی جڑیں بہت مضبوط رہی ہیں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہاں کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہاں سے بہت سے رسائل اور اخبارات بھی شائع ہوئے۔ 'المشرق' اور 'جادو' کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ شانتی رنجن بھٹا چاریہ لکھتے ہیں:

"آزادی کے بعد مغربی بنگال سے اردو کا ایک بڑا حلقہ مشرقی بنگال میں جا بسا اور ڈھاکہ سے کئی اخبارات اور رسائل جاری رہے جن میں روزنامہ 'پاسبان' ڈھاکہ کے علاوہ ادبی رسائل میں مفکر، خاور، ندیم اور فنکار کے نام کم از کم لیے جانے چاہیے جو ادبی لحاظ سے اچھے رسالے رہے ہیں۔"4

ڈاکٹر محمد غلام ربانی نے اپنے مضمون 'بنگلہ دیش میں اردو صحافت: ماضی اور حال' مشمولہ 'اردو صحافت کے دو سو سال' (قومی اردو کونسل نئی دہلی) ماہنامہ المشرق، جادو، ماہنامہ اختر، سہ روزہ اقدار، مشرقی پاکستان، 'روزنامہ پاسبان، ماہنامہ خاور، دلربا، ہفتہ وار امین، منشور، سرفراز، ندیم، ماہنامہ شہاب، ماہنامہ رباب، سہ

ماہی مشرق، المہاجر، روزنامہ انقلاب، روزنامہ انگارہ، روزنامہ ستارہ، روزنامہ ہماری آواز ہفت روزہ سب رنگ، بصارت، حقیقت، قدم، انصاف، روداد، جریدہ، ماہنامہ خرام، شہکار، دائرہ، عزمِ نو، بادبان، دبستانِ مشرق، عقاب، مصحف، سنگ میل، فکرنو، نیا آدم، رفتار، افشاں، ضیا ہفت روزہ اخبار، اخبارِ بنگلہ دیش، انتخاب، قلم کار، صدائے آگہی، شمس گزٹ، صبح امید، ضیاءِ صبح، دین و دانش، انکشاف، دستک، مجلس، خیال، پیغام، ادب، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف پرشین اینڈ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو جیسے اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ بعض اخبارات اور مجلّات بہت ہی اہمیت کے حامل تھے، ان میں رسالہ 'اختر' بھی تھا جس کے متعلق وفا راشدی کی بڑی قیمتی رائے ہے:

> ''1924 میں خالد بنگالی نے بولائی جیسے مقام سے ماہنامہ 'اختر' جیسا کامیاب اور معیاری صحیفہ جاری کر کے اردو زبان سے والہانہ محبت اور ادب کی بے لوث خدمت کا جو ثبوت دیا اس کی مثال اردو کی تاریخ میں خال خال ہے۔ اس پرچہ کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ اس کے اوراق ملک کے مشاہیر اہل قلم وحشت کلکتوی، ناطق لکھنوی، آرزو لکھنوی، نیاز فتح پوری، دلگیر الہ آبادی، مائل الہ آبادی وغیرہ کے رشحات لطیف وجمیل سے مزین ہوئے۔''5

بنگلہ دیش میں اردو صحافت کی صورت حال بہت بہتر رہی ہے اور وہاں اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی خاصی تعداد بھی رہی ہے۔ اس تعلق سے طارق بنارسی نے ضیاءِ صبح کے ایک اداریے میں لکھا ہے کہ:

> ''آج بھی اس ملک میں تقریباً تین ہزار مدارس ہیں۔ آٹھ لاکھ سے اوپر طلبا۔ اردو زبان وادب کے ساتھ دینی تعلیمات کی تکمیل کرتے ہیں۔ اللہ کے کرم سے ہر سال لاکھوں طلبا اردو لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھ رہے ہیں۔''6

اردو صحافت کے فروغ میں شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے کہ انہی کی سرپرستی اور ادارت میں المشرق اور جادو جیسے رسالے شائع ہوئے۔ انھوں نے انجمن اردو کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی جس کے ذریعے اردو ادب کے فروغ کا بہت ہی اہم کام انجام دیا جاتا رہا۔ وہ ڈھاکہ کی بہت ہی

ممتاز شخصیت تھے جنھوں نے بہت ساری کتابوں کے علاوہ 'ثلاثہ غسالہ' جیسی اہم کتاب لکھی اور ایک اہم بات یہ ہے کہ مرزا جان طپش جیسی شخصیت نے اردو محاورات اور روز مرہ پر اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف 'شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان' قیام ڈھاکہ کے دوران ہی لکھی تھی۔ عبدالغفور نساخ جیسی عظیم شخصیت کا تعلق بھی ڈھاکہ سے رہا ہے جن کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد کلکتہ میں ہے۔ اس کے علاوہ جب 1921 میں ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو وہاں اردو اور فارسی کے شعبے بھی تھے اور اس کے سب سے پہلے صدر شعبہ، خان بہادر فدا علی خان تھے۔ اسی شعبے سے وجاہت حسین عندلیب شادانی کا بھی تعلق رہا جو اردو کے معروف شاعر، نقاد اور کہانی کار تھے جن کی کتابوں میں نشاطِ رفتہ، تحقیقات، دور حاضر اور اردو غزل گوئی بہت مشہور ہیں۔ انھوں نے ہی ڈھاکہ سے ماہنامہ خاور جیسا وقیع ادبی مجلّہ شائع کرنا شروع کیا تھا جس کے بہت سے شمارے نکلے اور ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے۔ عندلیب شادانی 1947 میں شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر بنے اور تین مرتبہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس کے عہدے پر فائز رہے۔ اسی ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ماہر لسانیات شوکت سبزواری کا بھی تعلق تھا جن کی کتابیں لسانی مسائل، اردو لسانیات، اردو زبان کا ارتقا، معیار ادب، نئی پرانی قدریں قابل ذکر ہیں۔ جدید لسانی مسائل و مباحث میں شوکت سبزواری کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے اور آج کے دور میں بھی ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر جیسی ممتاز ادبی شخصیت کا تعلق ڈھاکہ یونیورسٹی سے ہے جن کے تحقیقی اور تنقیدی مقالے دنیائے ادب میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی (حیات اور کارنامے) بنگلہ دیش کا پہلا ضخیم تحقیقی مقالہ ہے۔ ان کے علاوہ کنیز بتول، جعفر احمد، ڈاکٹر ام سلمہ، کے ایم سیف الاسلام خان اور ڈاکٹر محمد غلام ربانی جیسی شخصیتیں ہیں جو اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے بہت اہم کام کر رہی ہیں۔

یہاں اردو بولنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہر دور میں رہی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ بنگلہ دیش کے اردو شعبوں کی وجہ سے اردو کو ایک نیا علاقہ میسر آیا اور اردو کو ایسے قاری بھی ملے جو اردو سے نا آشنا اور نابلد ہیں یعنی اردو کی بہت سی شاہکار تحریریں بنگلہ زبان میں منتقل ہو کر ان افراد تک پہنچیں جن کا اردو سے کوئی رشتہ یا علاقہ نہیں ہے۔ یہ اردو پر بنگلہ زبان اور ڈھاکہ یونیورسٹی کا بہت بڑا احسان ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ

ڈھاکہ یونیورسٹی اردو کے فروغ کے لیے بہت مستعد اور فعال ہے۔ اس یونیورسٹی میں جہاں اعلیٰ سطح کی ادبی تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے وہیں ادبی کانفرنسز کے ذریعے فروغِ اردو کی کوشش بھی ہو رہی ہے۔

حوالے

1. حکیم حبیب الرحمٰن: ڈھاکہ پچاس برس پہلے، کتاب منزل لاہور، 1949، بحوالہ شانتی رنجن بھٹا چاریہ، بنگال کی زبانوں سے اردو کا رشتہ، ص 66-165
2. سید اقبال عظیم: مشرقی بنگال میں اردو، مشرق کوآپریٹو پبلی کیشنز، 97، آغا، صادق روڈ ڈھاکہ، اگست 1984، ص 25
3. ایضاً، ص 30
4. شانتی رنجن بھٹا چاریہ: آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو۔ 2/1، ای اشوک نگر، رجینٹ پارک، کلکتہ، 1973، ص 35
5. وفا راشدی: بنگال میں اردو، مکتبہ اشاعت اردو، حیدر آباد، پاکستان، جنوری 1955، ص 86
6. اداریہ ضیائے صبح، حلقۂ فکر و دانش، چاٹگام 1980، ص 11 بحوالہ پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، بنگلہ دیش میں اردو صحافت، مشمولہ اردو صحافت کے دو سو سال، مرتب: پروفیسر ارتضیٰ کریم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2017، ص 91-90

ارمان شمسی اور ان کی افسانہ نگاری

پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی*

[بنگلہ دیش کے اردو افسانے نگار غلام محمد، شام بارکپوری، شہزاد منظر، ایوب جوہر، احمد سعدی، راحت آرا بیگم وغیرہ کے بعد اردو افسانہ کو آگے بڑھانے والے اور بنگلہ دیش کا نام اردو دنیا میں روشن کرنے والے افسانہ نگار ارمان شمسی ہیں۔ ان کے کل دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''آشنائی کا کرب'' (۲۰۰۳)، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' (۲۰۰۶)، ''خواب ریزے'' (۲۰۰۹)، ''پیاسی ندیا'' (۲۰۰۹)، ''شناخت'' (۲۰۱۱)، ''کالی پری'' (۲۰۱۳)، ''ریشم کا جال'' (۲۰۱۴)، ''پرچھائیاں'' (۲۰۱۷)، ''چاند نگر'' (۲۰۱۷)، ''پرائی آنکھیں'' (۲۰۲۰) منظر عام پر آئے ہیں۔ ارمان شمسی تقریباً ۱۶۰ افسانے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف جرائد ''آجکل (دہلی)، ''انتساب'' (بھوپال)، ''شاعر'' (ممبئی)، ''رنگ'' (دھنباد)، ''بیسویں صدی'' (دہلی)، ''شمع'' (دہلی)، ''آنند ڈائجسٹ'' (پٹنہ) میں چھپتے رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کردار حقیقی ہوتا ہے۔ دلکش انداز سے روز مرہ پیش آنے والا واقعات کو بڑی آسانی سے افسانہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ ارمان شمسی عموماً مزدور، غریبی، مفلسی، سرمایہ دارانہ طبقے کی جنس پرستی، اکثریتی فرقے کے مظالم، حکومتی اداروں کی عیاری، انسانی نفسیات، طبقاتی نابرابری جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں۔]

بنگلہ دیش میں افسانہ نگاری کے میدان میں اس وقت صرف پانچ چھ افسانہ نگار باحیات ہیں۔ ارمان شمسی، س م ساجد، ڈاکٹر لطیف احمد، اے نعیم اور قاسم انیس کے قلم اس وقت اردو افسانہ نگاری میں رواں ہیں۔

* شعبۂ اُردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

قاسم انیس کے 'کرب وجود'، 'بہتے الاؤ' اور ایم نعیم کے 'محافظ'، 'پس پردہ' وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔ راجشاہی یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد کے کل چوبیس افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا ''شام ڈھلے'' افسانوی مجموعہ ۲۰۱۹ میں شائع ہو چکا ہے۔اس میں بارہ افسانے ہیں اور دوسرا افسانوی مجموعہ بھی شائع ہونے والا ہے۔ ان میں 'مہوئے کے پھول'، 'کالی تتلی'، 'کل چمن تھا آج صحرا ہوا'، 'وہ کون تھی'، 'سرحد'، 'خیر سے بدھو گھر واپس آئے'، 'مولسری تلے' 'دل نے تجھے پھر یاد کیا'، 'شیشہ کی دیوار' قابل ذکر افسانے ہیں۔[1] س م ساجد افسانہ نگاری میں ایک وقفہ کے بعد پھر منظر میں آ گئے ہیں۔ ۲۰۱۷ء میں ان کا ''ایک سوال انگن انگن'' افسانوی مجموعہ شائع ہوا ہے۔اس کے پہلے ۱۹۸۳ء میں احمد سعدی کے ساتھ ''دود چراغ محفل'' شائع ہوا تھا۔[2] 'معمولی سی بات'، 'اوور ٹائم'، 'پاگل'، 'کتے'، 'کہانی کا قتل' اور 'ایک سوال انگن انگن' ان کے قابل ذکر افسانے ہیں۔[3]

بنگلہ دیش کے اردو افسانے نگار غلام محمد، شام بارکپوری، شہزاد منظر، ایوب جوہر، احمد سعدی، راحت آرا بیگم وغیرہ کے بعد اردو افسانہ کو آگے بڑھانے والے اور بنگلہ دیش کا نام اردو دنیا میں روشن کرنے والے افسانہ نگار ارمان شمسی ہیں۔ان کے کل دس افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔''آشنائی کا کرب'' (۲۰۰۳)، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' (۲۰۰۶)، ''خواب ریزے'' (۲۰۰۹)، ''پیاسی ندیا'' (۲۰۰۹)، ''شناخت'' (۲۰۱۱)، ''کالی پری'' (۲۰۱۳)، ''ریشم کا جال'' (۲۰۱۴)، ''پرچھائیاں'' (۲۰۱۷)، ''چاند نگر'' (۲۰۱۷)، ''پرائی آنکھیں'' (۲۰۲۰) منظر عام پر آئے ہیں۔ ''سپنوں کی چراندھ'' اور ''گھونسلے کی گھٹن'' نام سے ارمان شمسی کے اور دو افسانوی مجموعہ زیر طبع ہے۔

ارمان شمسی تقریباً ۱۶۰ افسانے لکھ چکے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف جرائد ''آجکل (دہلی)، ''انتساب'' (بھوپال)، ''شاعر'' (ممبئی)، ''رنگ'' (دھنباد)، ''بیسویں صدی'' (دہلی)، ''شمع'' (دہلی)، ''آنند ڈائجسٹ'' (پٹنہ) میں متواتر چھپتے رہے ہیں۔انکی افسانوں کے بنگلہ ترجمے بھی ہوتے رہے ہیں۔جن کی اشاعت اخبارات ''جگنٹھو'' اور ''جائے جائے دن'' میں ہوتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ ارمان شمسی کے

افسانوں کا بنگلہ ترجمہ جعفر عالم نے 'اردو گلپو' اور 'اوپ مہادیشیر اردو گلپو' مترجم افسانوی مجموعے میں شامل کیا ہیں۔ اس کے علاوہ ''بنگلہ دیشیر اردو چھوٹو گلپو'' ۲۰۱۸ میں جلد اول اور ۲۰۱۹ میں جلد ثانی شائع ہوا ہے جس میں ہیکل ہاشمی نے ارمان شمسی کے دو افسانے کا بنگلہ ترجمہ شامل کیا ہیں۔

ارمان شمسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''آشنائی کا کرب'' میں 'منجدھار'، 'رکھیل'، 'جیون ایک الاؤ'، 'بھونچال'، 'مہک'، 'آشنائی کا کرب'، 'میڈم راسپوٹن'، 'جواب'، 'درد کی تنہائیاں'، 'روشن دان'، 'جھوٹن'، 'چھوٹا گھر'، 'گلچیں کا خمار'، نامی ۱۳ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' میں 'ایک مٹھ مائی'، 'فینخاسی کنگڈم'، 'سپنے کا خوف'، 'ڈھلان سے ابھرتا سورج'، بقا کی خاطر'، 'ساوتری'، 'مرغ پلاؤ'، 'ضمیر کا زخم'، 'روزگار'، 'بھوک کا شکنجہ'، 'جھوٹے سپنے سچے خواب'، 'بھنور'، 'پگلی'، اور 'تاریک جھروکے' نام سے ۱۴ افسانے ہیں۔

ارمان شمسی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''خواب ریزے'' میں 'نقطۂ نوگریز'، 'ممتا کی چاہ'، 'نمک حرام'، 'سلگتی روشنی'، 'کھلونا'، 'شکست وفا کے سایے'، 'رینگتی حسرتیں'، 'جنت کا متلاشی'، 'تشنہ کام'، 'پھولوں کے گھاؤ'، 'آتشی پھول'، 'خواب ریزے' نام سے ۱۲ افسانے ہیں۔

چوتھا افسانوی مجموعہ ''پیاسی ندیا'' میں 'سماج سدھار'، 'شب خون'، 'پیاسی ندیا'، 'بچھیا'، 'سناٹا'، 'مردانہ سماج'، 'اندھاپن'، 'سکھ'، 'عزت کی روٹی'، 'استغفراللہ'، 'گھٹن'، 'بیداری'، 'حنا کے زخم' جیسے ۱۳ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا پانچواں افسانوی مجموعہ 'شناخت' ہے۔ اس میں ۱۳ افسانے ہیں۔ 'شناخت'، 'الماس نگر کے قیدی'، 'جنگل کا قانون'، 'بہاروں کی آہٹ'، 'اجڑ تا درخت'، 'فطرت زدہ'، 'جلتی دھوپ ٹھنڈی چھاؤں'، 'موتی اگلتی سیپیاں'، 'سمجھوتے کا ہنر'، 'اعلیٰ نسل'، 'بڑے شہر کا باشی'، 'دلدل'، 'پڑوسی' اس میں شامل افسانے ہیں۔

ارمان شمسی کا چھٹا افسانوی مجموعہ 'ریشم کا جال' ہیں۔ اس میں 'ریشم کا جال'، 'کوڑھ'، 'آگہی'، 'جنم جلی'، 'آنکھ مچولی'، 'تسمہ پا'، 'چیخ'، 'چمتکاری'، 'چارہ گر'، 'ہجرت زدہ'، 'فرض شناس' نام سے ۱۱ افسانے ہیں۔

ساتواں افسانوی مجموعہ ''کالی پری'' میں ''آسیب'، 'ہرجائی'، 'نیادور'، 'مردذات'، 'بوجھ'، 'سنجوگ 'نجمہ اونجمہ'، 'بنوخالہ'، 'وقت کے رنگ'، 'دہکتی جنت'، 'کالی پری'' جیسے ۱۱ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی کا آٹھواں افسانوی مجموعہ ''پرچھائیاں'' ہے۔اس میں 'پرچھائیاں'، 'جینے کی راہ'، 'بوائے فرینڈ'، 'احساس'، 'بلی کے بکرے'، 'گدھ'، 'جلاہوا کارتوس'، 'مزدورعورتیں'، 'تارا'، 'وارث' نام سے ۱۰ افسانے ہیں۔

۹واں افسانوی مجموعہ ''چاندنگر'' میں 'چاندنگر'، 'ٹھنڈک'، 'آدمی کا پلا'، 'سن آف بنگلہ دیش'، 'نروان'، ' مسیحا'، کڑواسچ'، 'حسن کی گنگا'، 'تاریک جھروکے'، 'گلابوں کے کھنڈر'، 'بن باس'، 'زنجیر رشتہ' جیسے ۱۲ افسانے شامل ہیں۔

دسواں افسانوی مجموعہ ''پرائی آنکھیں'' میں 'پرائی آنکھیں'، 'شکاری'، 'برہنہ بے کسی'، 'عہد ستم ختم ہوا'، 'سپنوں کی راکھ'، 'معصوم رسیا'، 'گل بانو'، 'سڑک کنارے'، 'حلالہ'، 'وظیفہ جاری رہیں گا'، 'نطفہ'، 'جنوں کے سائے' عنوان سے ۱۲ افسانے شامل ہیں۔

ارمان شمسی بنگلہ دیش میں مقیم ہیں۔ان کی پیدائش ہندستان کے یوپی صوبہ کے بریلی ضلع میں قصبہ آنولہ میں ہوئی۔ تاریخ ولادت ۲۱ اگست ۱۹۴۳ء بروز ہفتہ ہے۔والد کا نام منظور احمد اور والدہ کا نام نشا بیگم۔ان کی پیدائش کے ڈھائی سال بعد ان کے والد کی وفات ہوگئی۔اس وقت سے بہت غربت میں زندگی بسر کرنی پڑی۔ان کی امی نے تین بیٹیاں اور رارمان شمسی کو نہایت محنت ومشقت اور استقلال کے ساتھ پرورش کی۔ ارمان شمسی بہت ذہین ہونے کے باوجود تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے میں انہیں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ''میں بچپن سے ہی حساس اور تیز تھا جو پڑھ لیا یاد ہوگیا۔ ہمیشہ فرسٹ آتا،قصبہ آنولہ میں ایک ماسٹر تھے پریم شنکر۔ان کی سی انگلش پورے قصبے میں کسی کی نہ تھی، اردو و فارسی و ہندی اور سنسکرت کے بھی ماہر تھے۔ مجھے گھر پر ٹیوشن پڑھانے آتے۔ دس روپے فیس تھی۔ جبکہ اس

وقت ایک سو دس روپے تولہ سونا تھا۔ میں خود دو دو روپے مہینے کی ٹیوشن پڑھاتا اور اسکول سے آکر ایک کارخانہ کی چورن بھرنے کیلئے کاغذ کی نلکیاں بناتا جس کی مزدوری ایک آنا فی سیکڑہ تھی۔ یوں لشتم پشتم ماسٹر صاحب کی دس روپے فیس کی ادائیگی ہو پاتی۔ پھر بہت جلد تھک گیا تو ماسٹر صاحب کو منع کر دیا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ حکم ہوا تم جیسے لڑکوں کا پڑھنا بہت ضروری ہے۔ اب تم پڑھنے کے لئے میرے مکان پر آیا کرو۔ یہاں انہوں نے ایک کوچنگ اسکول قائم کر رکھا تھا۔ وہ میرے سپرد کر دیا اور میں چھوٹے بچوں کو پڑھانے لگا خود بھی پڑھتا۔ ان کے یہاں بی اے کے لڑکے پڑھا کرتے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ وردمینٹنگ اور ڈکٹیشن سب کا میرے ہی ذمہ تھا جب کہ میں خود انٹر میں تھا۔ میری محنت کے عوض ماسٹر صاحب نے میری فیس معاف کر دی۔''[۴]

انٹر تک تو وہ یوپی میں پڑھ لیا تھا۔ بعد میں وہ غربت کے مارے کولکاتا آ گیا۔ ایک دکان پر سیلز مین کی ملازمات شروع کی۔ وہ ملازمت کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ امتحان میں شریک ہوتے رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور ادیب ماہر میں فرسٹ اور کامل میں سکنڈ ڈویژن سے پاس کیا۔ بی اے کا داخلہ لیا تو تھا لیکن ۱۹۶۴ میں کلکتہ میں فساد ہو گیا، کالج کا مکان بھی جلا دیا گیا، ابتری پھیل گئی تو ہجرت کرنا پڑا اور سلسلہ تعلیم بھی بند ہو گیا۔

تنگ دستی کی وجہ سے دکان کی ملازمت کرنی پڑی۔ بڑی مشکل سے گھر کی اخراجات کا گزارہ ہوتا تھا۔ ان کی فیملی کی بری حالت کو اپنی افسانے ''گلچین کا خمار'' میں اپنی بہن کی شادی کی بات کو افسانوی پیرایہ میں اظہار کرتے ہیں:

''آپ تو قیامت آجائے گی جب بھی یہی کہیں گے کچھ نہیں ہوا۔''

جواب میں چندا میاں جھلا کر بولے ''یہ جو تم نے مہ پارہ کی بات طے کر رکھی ہے یہ لڑکا کون سا تیس مار خاں ہے۔ جانتی ہو.... اس کے چال چلن کے لیے جب پوری برادری نے اس کو نہیں پوچھا تو انھوں نے تمھارے گھر کا رخ کیا ہے اور اگر وقت پر جہیز وغیرہ کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو کیا کروگی ہے کچھ پاس پلّے ؟ عمر بھر بیٹیوں کو کولھے سے لگائے رکھنا یا ایک دن صبح اٹھ کر انہیں

ملتے ملتے دیکھنا کہ وہ گھر سے بھاگ گئیں۔ نفیسہ ابھی تو فاقے فقر سے کٹ رہی ہے لیکن ذرا آنے والے خوفناک دنوں کے بارے میں سوچو...؟ میں نے مانا تمھاری بیٹیاں خوبصورت ہیں، حسین ہیں لیکن میری بہن صورت کے ساتھ ساتھ لوگ کچھ اور بھی چاہتے ہیں جس میں مال دولت، عزت، خاندان وغیرہ سب کچھ ہی شامل ہے۔ اس سماج میں غریب کی عزت ہی کیا ہے اور وہ بھی گھر گھر گھوم کر کپڑے سینے والی کی؟

چندا میاں نے جذبات میں بھر کر سچ کا زہر ایک ہی سانس میں اگل دیا جیسے کوئی مینڈک زہریلے سانپ کا من گھبرا کر اگل دے اور اب روشنی ہی روشنی تھی جس سے نفیسہ بانو کی آنکھیں چندھیائی جارہی تھیں۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور گہری گہری سانسیں لینے لگیں۔

پھر چندا میاں یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔ ''تم اچھی طرح غور کرلو۔ میں کل آؤں گا۔''

دوسرے دن جب چندا میاں بہن کے گھر پہنچے تو نفیسہ بانو منہ سر لپیٹے پڑی ہوئی تھیں۔ مہ پارہ اور قمر آرا دونوں سینے پرونے کے کام میں مصروف تھیں۔ بہن کو اٹھایا۔ حال پوچھا تو معلوم ہوا آج صبح سے چولھا نہیں جلا ہے۔ سب کو فاقہ ہے۔ دونوں لڑکیاں کام مکمل کر رہی ہیں پیسے آئیں گے تو چولھا جلے گا۔ چندا میاں الٹے قدموں واپس ہو گئے۔ گھر سے کھانا لائے سب کو کھلایا۔ پھر بہن سے مخاطب ہوئے ''تم اپنا دل چھوٹا مت کرو، چھوڑو اس رشتے کی بات کو۔ اپنا کام دھندا دیکھو۔ اللہ مالک ہے، وہ جیسا چاہے گا وہی ہوگا۔''[۵]

ان کی مفلسی ایک دن ختم بھی ہوگئی تھی۔ تجارت میں ساڑھے بارہ فی صد شرکت بھی مل گئی۔ دو برس دکان میں پارٹنر رہے۔ ۱۹۶۴ء میں ہندو مسلم فساد شروع ہوا تو وہ کولکاتا سے ڈھاکہ ہجرت کر کے چل آئے۔ ڈھاکہ میں دو برس بہت بدحالی میں گزرے، کوئی ملازمت بھی نہ ملی۔ آخر ایک تجارت کا بندوبست ہوا تھا۔ اس تجارت کی اونچ نیچ اور ترقی اور تنزل کو بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''آخر اپنے ایک دیرینہ دوست سے کچھ رقم قرض لی اور ساڑھے تین سو روپے میں ایک بند پڑا ہوا پلاسٹک کا سامان بنانے کا کارخانہ خریدا جس میں صرف دو ہینڈ مشینیں تھیں اور

بال پین بنانے کا کام شروع کر دیا، کام چل نکلا اور میں ترقی کی راہ پر لگ گیا۔ ایک بار پھر تعلیم کی فکر ہوئی تو میں وائی ایم سی اے YMCA کا ممبر بن گیا۔ تعلیم جاری کر دی لیکن قسمت پھر جُل دیا۔ بنگلہ دیش کی تحریک شروع ہوگئی اور انقلاب کے بعد جب بنگلہ دیش بنا تو میں برباد ہو چکا تھا۔ ہاتھ خالی تھے، کاروبار بند تھا، دوبارہ کارخانہ کھولا، قسمت سے زور آزمائی شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج میری فیکٹری میں تین آٹو میٹک مشینیں چل رہی ہیں، کاروبار لاکھوں تک پھیل گیا ہے، اپنی فیکٹری کا میں اکاؤنٹنٹ اور ٹیکنشین بھی خود ہی ہوں۔ ڈائیاں اور مشین تک بنالیتا ہوں۔ یہ سب میری والدہ کی کوششوں اور دعاؤں کا ثمرہ ہے اور شاید میری ترقی کی وجہ میرا سماج اور متمول اعزا کا وہ رویہ بھی ہے جب لوگوں کی نگاہوں میں میں اپنے لئے ہلکا پن اور تحقیر دیکھتا تھا، اپنی اس بے توقیری نے میرے اندر ایک آگ بھر دی۔ ایک جنون پیدا کر دیا اور آج خدا کا شکر ہے کہ میں ہم سری کا دعویٰ کر سکتا ہوں۔''[۶]

انہوں نے ایام طفلی سے دیکھے ہوئے غربت اور افلاس کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ ان کا پہلا افسانہ تو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔[۷] اس کا نام ''بھوک کا شکنجہ'' سے پتہ چلتا ہے اس کا موضوع کیا تھا۔ یہ افسانہ دہلی کے عوامی رسالہ '' بیسویں صدی'' میگزین میں شائع ہوا۔ اس کے بیس سال بعد ۲۰۰۳ء میں پہلا افسانوی مجموعہ '' آشنائی کا کرب'' شائع ہوا بیسویں صدی میگزین مطبع سے۔ اس پہلے مجموعہ کے لیے بہار اردو اکیڈمی، ہندوستان کی جانب سے ان کو ایوارڈ ملا تھا۔ اس سے ارمان شمسی کی فکر و سوچ کو مزید حوصلہ افزائی ہوئی۔[۸]

بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے اردو افسانہ نگاری دراصل بہت مشکل ہے۔ افسانہ شائع ہونے کے بعد افسانہ نگار کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن بنگلہ دیش سے تو کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا ہے۔ بیرون ملک سے افسانہ شائع کرنے کے لیے بھیجنے کے بعد انتظار میں بہت وقت گزر جاتا ہے۔ اسی حالت کو ارمان شمسی ۱۵ اپریل ۲۰۰۷ء کا ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دراصل میں تو یہ سمجھ رہا تھا مذکورہ افسانہ ''ریشم کا جال'' آپ کے یہاں چھپ چکا ہوگا۔ کسی بھی افسانے کی مجھے خبر نہیں ملتی کہ وہ کب شائع ہوا، ہوا بھی یا نہیں۔ عموماً اسی

پرچے کی جانب سے مجھے خبر مل جاتی ہے۔ یا رسالہ پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں بنگلہ دیش میں اردو کے پرچے نہیں آتے۔''[9]

ارمان شمسی بنگلہ دیش میں بیٹھ کر ساری دنیا سے رابطہ رکھتے ہیں۔ وہ مشہور سب افسانہ نگاروں کے افسانہ پڑھتے ہیں اور کبھی کبھی متاثر بھی ہوتے ہیں۔ وہ خود اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ''اس میں شک نہیں کہ منٹو مجھے پسند تھا۔ لیکن عصمت، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین، پریم چندر، علی عباس حسینی اور خواجہ احمد عباس نے بھی متاثر کیا۔''[10]

وہ صرف مذکورہ افسانہ نگاروں سے ہی متاثر ہوئے، یہ نہیں بلکہ وہ بنگلہ دیش کے سماج، معاشرہ، سیاست، تہذیب اور مہاجروں کی سنگین مسائل سے متاثر ہو کر افسانے لکھتے رہے۔ وہ خود ''پرچھائیاں'' میں لکھتے ہیں:

''میں جس ملک میں سکونت پذیر ہوں وہاں کی زبان و تہذیب و تمدن گو کہ ہندو پاک سے قدریں مختلف ضرور ہے۔ لیکن مسائل انسانی ایک جیسے ہی ہیں، افلاس ہے، لوٹ گھسوٹ ہے، استحصال ہے یعنی وہ سب کچھ ہے جو ایک غریب ملک کے لئے ناگزیر ہو سکتا ہے۔ ایک ادیب جب اس دکھ کو محسوس کرتا ہے تو وہ خود بھی دکھی ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ قلم اٹھاتا ہے تو صفحہ قرطاس پر دکھ پھیل جاتے ہیں۔ پھر یہ دکھ قاری بھی محسوس کرتا ہے۔ قاری کا یہ دکھ معاشرے کا مداوا بھی بن سکتا ہے۔ ایک ادیب اسی امید پر اپنے دن رات کا چین تیاگ کر کہانیاں بُنا کرتا ہے۔

ان سماجی مسائل کے علاوہ ایک اور مسئلہ میرے دل و دماغ میں جان گزیں رہتا ہے وہ ہے مہاجرت اور مہاجروں کی کسمپرسی گو کہ یہ واقعہ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد وقت کی دھول میں دب کر ماند پڑ گیا ہے لیکن مسئلے کی سنگینی اپنی جگہ موجود ہے اس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تقسیم ہند کے زمانے میں جو قتل و غارت گری ہوئی اس پر پاک و ہند دونوں جانب سے کافی کچھ لکھا گیا۔'' پر افسوس! سقوط پاکستان کے بعد بنگلہ دیش میں اردو زبان اور اسکے بولنے والوں کی جو درگت بنی اس پر نہیں لکھا گیا۔ میں ہندوستان جاتا ہوں تو آج بھی اردو حلقہ اپنی زبان کے بارے میں پوچھتا ہے دیوانہ تو مر گیا ''لیلیٰ پہ کیا بیتی''[11]

ارمان شمسی کے افسانوں کا کردار حقیقی ہوتا ہے۔ دلکش انداز سے روزمرہ پیش آنے والا واقعات کو بڑی آسانی سے افسانہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ ارمان شمسی ان کی افسانہ نگاری کا موضوع عموماً کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں مرزا رفیق شاکر ایک تبصرہ میں ذکر کرتے ہیں:

> ارمان شمسی اپنے ماحول، سماج، مذاہب اور تہذیب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ عمیق اور مطالعہ بہت زیادہ ہے۔ وہ بچہ، مزدور، غریبی، مفلسی، سرمایہ دارانہ طبقے کی جنس پرستی اکثریتی فرقے کے مظالم، حکومتی اداروں کی عیاری انسانی نفسیات طبقاتی نابرابری جیسے موضوعات پر لکھتے ہیں۔
>
> ارمان شمسی کی زبان سلیس اور رواں ہے۔ جس میں ادب کی چاشنی ہے۔ استعارے اور کنایہ کے ذریعہ بہت کچھ کہہ دیتے ہی۔ جہاں کچھ نہیں کہتے وہاں بھی قاری پر گہری چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ [۱۲]

ارمان شمسی اپنے افسانوں کا پلاٹ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر منتخب کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی نوجوانی اسی جگہ گزری۔ اس لیے ہندوستانی شعور، جذبات اور بنگلہ دیشی تجربہ کو مخلوط کر کے وہ انوکھے پلاٹ تیار کرتے ہیں۔ جس میں قاری ڈوب کر افسانوں کے پلاٹ اور کرداروں میں اپنے ماضی کی تصویریں دیکھتے ہیں۔ یہاں شدت احساس اور گہرے تجربے کا بھرپور عکس ملتا ہے۔ وہ نئے حالات، نئے مسائل کو اپنے افسانے میں جگہ دینا پسند کرتے ہیں۔ ان کے طرز تحریر، موضوعات اور پلاٹ کے بارے میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں:

> ارمان شمسی نے بے حسی، بے غیرتی، جبر و ظلم اور نا عاقبت اندیشی و خود غرضی جیسے موضوعات کو بھی افسانے کا حصہ بنایا ہے اور ٹوٹتے بکھرتے نظام کے معاشرتی پہلو کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ علامت تجریدیت اور وجودیت کے فلسفے سے وہ متاثر ضرور ہیں لیکن بیانیہ انداز کی ایک الگ راہ انہوں نے اپنائی ہے۔
>
> حقیقت نگاری سے چل کر علامت تک کا سفر طے کر کے ابلاغ سے بچ نکلنا ان کی فنکاری ہے۔ زبان و مکان کے روشن مسائل کے تاریک پہلوؤں کی ترجمانی جس

مخصوص انداز بیان سے کرتے ہیں اس اسلوب سے نئے تقاضے کا ٹریٹمنٹ سامنے آتا ہے اور ارمان شمسی کے افسانوں کی جہت نمایاں ہوتی ہے۔[۱۳]

ارمان شمسی افسانوں میں کردار پر بہت زور دیتے ہیں۔ افسانے کے خاطر کردار منتخب کرتے ہیں۔ ہر کردار کی زبان و لہجے کو بھی الگ الگ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی کردار نگاری پر روشنی ڈالتے ہوئے شمیم زمانوی لکھتے ہیں۔

''وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ کردار نگاری کیا چیز ہے اور کردار کی زبان کیسی ہونی چاہئے۔ ان کے یہاں گھر کی چہار دیواری کی بیگمات اور بازار کی زبان میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ طوائف اور دلال کے لب و لہجے میں کیا باریک سا فرق ہونا چاہئے اور اس کے مؤکل کا طرز گفتگو کیسا ہو؟ غرضیکہ وہ اہل زبان ہیں اور اپنے کرداروں کی زبان بامحاورہ انداز میں بہت خوبی سے نبھاتے ہیں۔''[۱۴]

مکالمے افسانے کو قاریوں کے نزدیک بہت مقبول بنا دیتا ہے۔ جب مکالمہ حقیقت پر مبنی ہو تو یہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ارمان شمسی نے اپنی زندگی میں بھوک کو سامنے سے دیکھا۔ ایک فاقہ مست انسان کی سوچ اور بات چیت کس طرح کی ہو سکتی ہے اسے ارمان شمسی کے افسانہ ''بھوک کا شکنجہ'' میں دیکھیں۔

''جب فاطمہ بی بی کے سامنے ٹرے میں گرم گرم بھات، شوربہ، دال اور کدّو کی بھاجی آئی تو ان کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دو روز کی فاقہ کشی کے بعد اچانک عین دوپہر کھانے کے وقت روزہ کشائی گرما گرم کھانے سے ہوگی۔ انہوں نے اپنی ملگجی آنکھوں سے اسٹول پر رکھی ہوئی ٹرے کو جھک کر اچھی طرح سے دیکھنا چاہا تو چاولوں سے اٹھتی ہوئی گرم بھاپ تیر کی طرح ان کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی اور بے اختیارانہ ان کے منہ سے خوشی کی ایک قلقاری نکل گئی۔

مگر اچانک کسی خیال سے ان کے دماغ پر یاسیت چھا گئی اور وہ بڑی حسرت سے اپنی کھوئی کھوئی آنکھوں سے اس کھانے کو تکنے لگیں۔ غیر شعوری طور پر ان کی گرفت کھانے کی ٹرے پر مضبوط

سے مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی اور وہ سحر زدہ سی اپنی کانپتی ہوئی ٹانگوں کو لرزنے سے روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں کہ ایک نرس کا ادھر سے گذر ہوا اور اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''اے بڑھیا کیا کر رہی ہے۔ کھانا کیوں نہیں کھا لیتی، یوں ہی ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' فاطمہ بی بی نے بے اختیاری میں نرس کا ہاتھ تھام لیا اور بولیں۔

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

نرس نے بڑی نخوت سے ان کی طرف دیکھا اور کرخت لہجے میں بولی

''تجھ سے پیسے دینے کو کون بولتا ہے خواہ مخواہ بدنام کرتی ہے یہ کھانا مفت ہے۔''

اور ''کھانا مفت ہے۔'' ''کھانا مفت ہے۔'' ''کھانا مفت ہے۔'' کی بازگشت فاطمہ بی بی کے کانوں کے گرد طواف کرتی رہی۔ دراصل انھیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ قسمت اس طرح بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ انہوں نے گھبرا کر نرس سے پوچھا۔ ''تو کیا میں کھانا کھا لوں!'' نرس نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں ہاں کھاؤ نا روکا کس نے ہے تمہیں۔'' نرس کی آواز سنتے ہی فاطمہ بی بی کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی اور ان کے کمزور فاقہ زدہ ہاتھ باز کے مضبوط پنجوں کی طرح کھانے کی طرف لپکے مگر وہاں کسی قسم کی مزاحمت تو تھی نہیں کہ کھانے میں دشواری ہوتی وہاں تو سیدھے سادے ابلے ہوئے چاول اور ترکاری تھی۔

ایک بار وہ ملغوبہ مٹھی کے شکنجے میں پھنستا تو سیدھا حلق کی راہ پیٹ کے اندھے کنوئیں میں دھنستا چلا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا تھال خالی ہو گیا۔ تھال سے منہ لگا کر فاطمہ بی بی نے بچی کھچی دال بھی غٹ سے چڑھا لی اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

ہسپتال کی پوری گیلری میں بیڈ ہی بیڈ تھے اور ان کے پاس اسٹول رکھے تھے جن پر کچھ عورتیں بیٹھی اب بھی کھانا کھا رہی تھیں۔

پاس سے گزرتی ہوئی نرس کو انھوں نے روک کر پوچھا۔

''کیا پانی مل سکتا ہے؟'' نرس نے قہر آلود نگاہوں سے انہیں دیکھا اور ان سے بولی۔ ''ہم کیا تمھارے نوکر ہیں جو پانی بھی لا کر دیں۔ باہر نل لگا ہوا ہے خود جا کر پانی پی لو۔'' [۱۵]

ارمان شمسی نے غربت کو خاص طور پر اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ 'ڈھلان سے ابھرتا سورج'، 'ساوتری'، 'مرغ پلاؤ'، 'ضمیر کا زخم'، 'بھوک کا سکنجہ'، 'گلچین کا خمار' وغیرہ افسانہ میں فاقہ زدہ انسان کی تصویر کشی کا حق پوری طرح سے ادا کرتے ہیں۔

ارمان شمسی مذہب پسند شخص ہیں۔ ان کے آباواجداد مذہبی عالم تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

''میرے چچا مرحوم جو عنفوان شباب میں رحلت کر گئے دیوبند کے عالم اور دستار بند تھے۔ دادا بھی قصبہ کے مشہور عالم مانے جاتے تھے۔ میری پیدائش کے تین سال بعد ہی میرے والد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔''۱۶

انہوں نے مذہبی لوگوں کو قریب سے دیکھا۔ 'منجدھار' افسانہ میں گاؤں کے قرآنی مکتب کا ایک نقشہ اس طرح پیش کرتے ہیں:

''پری بانو اپنی حویلی کے لق ودق آنگن میں چٹائی پر بیٹھی دھوپ کھاتی جارہی تھیں اور بچوں کا سپارہ بھی سنتی جارہی تھیں۔ سامنے قطار سے بیٹھی بچے اپنا اپنا پچھلا سبق لہک لہک کر پڑھ رہے تھے جہاں کوئی اٹکتا یا غلطی کرتا تو وہ فوراً ہی اس کو ٹوک کر تصحیح کرتیں اور پوری آیت دہرادیتیں۔ طالب علم پھر فراٹے بھرنے لگتا۔ ہر روز وہ کوئی درجن بھر بچوں کی آوازوں پر کان لگائے بیٹھی رہتیں۔ گو کہ وہ حافظہ نہیں تھیں پر مہارت کا یہ عالم تھا کہ پورا قرآن شریف انھیں ازبر تھا۔

اب یہ ان کا مشغلہ بھی بن گیا تھا اور ضرورت بھی کہ وہ دن بھر بچوں کے ساتھ سپارے رٹتی رہیں۔ کوئی آل نہ اولاد اگلے پچھلے سب مرکھپ چکے تھے۔ حویلی میں ان کے علاوہ ان کی ایک پھوپی تھیں۔ وہ بھی جب لیٹے لیٹے اکتا جاتیں تو پاس آکر بیٹھ جاتیں اور بھول ہونے پر لقمہ دینے لگتیں۔'' ۱۷

ارمان شمسی کی نگاہ انسانی نفسیات پر بہت گہری ہے۔ انسانی جبلت اور نفسیات کے موضوع پر انھوں نے بہت افسانے لکھے ہیں۔ ان میں ایک افسانہ 'اسیر فطرت'۔ اس افسانہ میں دیکھا جاتا ہے کہ ایک طالب علم راتوں کو چھپ چھپ کر بند کمرے میں موسیقی اور غنائیت میں مشغول ہوجاتا ہے لیکن تنگ نظر معاشرے کی

نگاہوں سے وہ بچ نہیں پاتا۔اس کو سزا دی جاتی ہے۔اس کہانی کے بارے میں شمیم زمانوی لکھتے ہیں:

یہ انسانی فطرت اور روایت کے مابین تصادم کی ایک عمدہ کہانی ہے۔افسانہ پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے کہ کیا مولوی کو انسان نہیں فرشتہ ہونا چاہیے؟ جو دنیا کی تمام لذتوں سے منہ پھیر کر صرف قال اللہ اور صوم وصلوۃ تک ہی محدود رہے۔یا پھر حلال وحرام کے دائرے میں رہتے ہوئے اس دنیا کی نعمتوں سے مستفیض ہونے کا اسے بھی حق ہے۔[۱۸]

ارمان شمسی مذہبی تعصب کے خلاف تھے۔تعصب سے معاشرہ کا کیا نقصان ہوتا ہے اس کی نشاندہی کرتے ہوئے بابری مسجد کے بارے میں وہ لکھے ہیں:

''میرا استغراق اس وقت ٹوٹا جب میری سماعت سے لا الہ کی عظیم صدا ٹکرائی۔میں نے اپنا سر اٹھا کر جامع مسجد کے میناروں کو دیکھا۔یہ سرزمین ہند پر پھیلے ہوئے ہزاروں مینار اپنی دلکش میں بے مثال مساجد، مقابر، قلعے یہ سب کس کا سرمایہ ہیں۔ہمارا....ہم سب کا.....مسلمانوں کا.....ہندوؤں کا، ہندستانیوں کا۔ پھر ہم اپنے سرمائے کے دشمن کیوں ہیں؟ بابری مسجد کیوں منہدم کردی گئی۔اب متھرا اور کاشی کی مساجد کے انہدام کی باتیں ہورہی ہیں تو کیا....تو کیا کل بات تاج محل اور لال قلعے تک بھی پہنچ سکتی ہے..... ہاں ہاں.....! نفرت اور تعصب کے الاؤ میں سب کچھ جل سکتا ہے۔اپنا گھر بھی بلکہ اپنا وجود بھی۔''[۱۹]

ارمان شمسی منظر نگاری میں اچھا خاصہ دخل رکھتے ہیں۔جس چیز کا منظر پیش کرتے ہیں وہ گویا قاری کے سامنے نظر آنا شروع ہوجاتا ہے۔منظر نگاری کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''عروسہ نے پہلے منع کیا پھر سلطان کے آگے اسکی نہ چل سکی طے پایا کل صبح سات بجے دونوں روانہ ہوجائیں۔

پُتایا (Pataya) کے ساحل پر پہنچ کر عروسہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔حد نگاہ تک ہلکورے لیتے ہوئے نیلے سمندر پر چھوٹی چھوٹی رنگین بادبانی کشتیاں تیرتی پھر رہی تھیں۔ساحل کے کنارے کنارے زعفرانی رنگ کا موٹا بالو بکھرا ہوا تھا اور نیلی پیلی بڑی بڑی چھتریوں کے سائے میں لوگ لانگ چیر پر نیم دراز سمندر سے اٹھتی ہوئی موجوں کا نظارہ کررہے تھے۔دور

ساحل کے کنارے کنارے ایک ہی ڈیزائن پر بنی سفید عمارتوں بڑا خوش نما منظر پیش کر رہی تھیں۔نم آلود ہوا سبک روی سے بہہ رہی تھی کبھی کبھی ہوا میں کچھ تیزی آجاتی تو پچھلی جانب سڑک کے کنارے قطار در قطار کھڑے ناریل کے درخت جھوم اٹھتے۔

واقعی بہت خوبصورت ساحل ہے عروسہ بے خود ہو کر بولی!''[۲۰]

وہ افسانہ نگاری صرف دلجوئی کے لئے نہیں کرتے بلکہ ہر پراگراف سے قاری کو بہتر زندگی کی طرف بلاتے ہیں۔وہ مبلغ کی حیثیت انسان کو اچھے سے اچھے تر ہونے کا مشورہ دیتے ہیں۔ازدواجی زندگی میں پیش آنے والا کشمکش کو دور کرنے کے لئے 'بوجھ' افسانے میں لکھتے ہیں۔

''فرحت جہاں کی بات کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے میں نے معین سے کہا آپ انہیں ایک مہینے کا خرچ اور رامپور کا ٹکٹ دے کر ٹرین میں سوار کرا دیجئے۔رامپور کے اسٹیشن پر ان کے ابا ان کو لینے آجائیں گے۔ان کے ہمراہ خود آپ کو جانے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ دونوں کو چاہئے کچھ دن الگ رہیں۔پھر یہ دوری خود بخود اکتاہٹ اور بیزاری کو چاہت اور رفاقت میں تبدیل کر دے گی جتنے دن آپ لوگ ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔اتنا ہی محبت میں اضافہ ہوگا چاہئے آزما کر دیکھ لیجئے۔

میں نے جواب طلب نظروں سے معین کی جانب دیکھا تو انہوں نے گردن جھکا لی خاموشی نیم رضامندی کو سمجھتے ہوئے میں نے فرحت سے کہا آپ مائیکے جانے کی تیاری کیجئے۔''[۲۱]

دوسری شادی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''اے ہے خیال نہیں معلوم ہوتا ہے میں کیا خاک نامحرم کو ہاتھ لگاؤں گی؟ ذرا لحاف بھی چاروں طرف ٹھیک سے لپیٹ دینا تاکہ ہُپ آجائے۔پھر دونوں میاں بیوی انکے پاس بیٹھے انہیں سمجھاتے رہے۔تمام باتوں کا لب لباب ایک ہی تھا کہ میاں جی کو نکاح کر لینا چاہئے۔اچانک بڑی بی بولیں اے ہے میں کہوں میاں جی کی آنکھ لگ گئی ہے اور میں نگوڑی ماری بک بک کئے جارہی ہوں چلو اٹھو انہیں آرام کرنے دو۔جب دونوں میاں بیوی چلے گئے۔تو مقبول حسین

نے جو دم سادھے ایک ہی کروٹ پر پڑے ہوئے تھے کروٹ بدلی اور اپنے خیالوں میں کھو گئے ۔ میں بڑھاپے میں قدم رکھ رہا ہوں اور لڑکی جوان ہے۔ لیکن یہ مناسب نہیں ہوگا مگر لڑکی بیوہ بھی تو ہے؟ جوان ہے تو کیا ہوا؟ شریف بھی ہے اور غریب و مجبور بھی اسکے ساتھ نبھ سکتی ہے۔ نہیں.... نہیں میں ایسا نہیں کر سکتا، نجمہ بھی شریف تھی۔ نجمہ کا خیال آتے ہی انھوں نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں پر دوسری جانب کروٹ بدلی تو کمریں ایک زوردار ٹیس اٹھی اور اس کے ساتھ ہی درد کی لہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تو وہ بے اختیار کراہنے لگے۔ پھر ان کی سماعت سے بڑی بی کی آواز ٹکرائی یہ کم بختوں کا مارا بخار ہووئے ہے، تو کمر تختہ ہو جاوے ہے۔ بدن الگ دکھتا ہے۔ اب بھلا ان کا بدن کون دابے؟ نکاح کرتے نہیں۔ نکاح کر لیتے تو دکھ سکھ کا سہارا ہو جاتا۔'' وہ سوچتے رہے اور کراہتے رہے آہستہ آہستہ بخار نے تیزی پکڑ لی اور ان پر غفلت طاری ہوگئی۔ پھر انکی بڑی ہمشیرہ کی آواز سنائی دی ''مقبول حسین لو یہ دوائی کھالو۔ بھلا ایسے کیسے کام چلے گا۔ تم نے اپنی یہ کیا گت بنا رکھی ہے، بچے اسکول کالج چلے گئے اور تم تنہا ایک ایک بوند پانی کو ترس رہے ہو، مرنے والی مرگئی اب لوٹ کر تو آتی نہیں، تم مرد بچے ہو، مرد ہی شادی کیا کرتے ہیں۔ ایک یا دو یا چار چار بھی۔ یہ تمہاری ضرورت ہے۔ پر کیا شرمانا کہ اولادیں بڑی ہیں کیا سوچیں گی، اب تم ٹھیک ہو تو خیر سے نکاح کرادوں گی'' ۲۲

ارمان شمسی نے جگہ جگہ سچی محبت اور مجازی عشق میں بھی فرق دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ 'خواب ریزے' میں دیکھا جاتا ہے اپنی معشوقہ کی خاطر معشوقہ کے شوہر کی تندرستی کے لئے اپنا گردہ دے دیتے ہیں ۔ گردہ دینے کے بعد اس عاشق کی موت ہو جاتی ہے۔ ناصر کی محبت کو ارمان شمسی اس طرح پیش کرتے ہیں:

''وہ لڑکی عروسہ کا گریبان چھوڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر اس نے عروسہ کو مخاطب کر کے اس سے انگلش میں پوچھا تم ہی عروسہ ہو؟ بتاؤ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے میرا محبوب مجھ سے چھین لیا؟

سلطان نے آگے بڑھ کر لڑکی سے سوال کیا تم انہیں کیسے جانتی ہو؟

میں تو تمہیں بھی پہنچانتی ہوں غالباً تمہارا نام سلطان ہے اور تم عروسہ کے شوہر ہو جس کا آپریشن

ہوا ہے۔تمہیں شاید خبر بھی نہیں تمہاری حالت بگڑی تو اسپتال میں گردہ دستیاب نہیں تھا جانتے ہو تمہیں گردہ کسکا لگا ہے؟

سلطان نے نفی میں گردن ہلائی تو وہ بولی.....ناصر کا.....

ناصر کا عروسہ چیخ پڑی مگر ناصر ہے کہاں؟

وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا وہ تو تمہارے نام کا دیوانہ تھا۔ستم رسیدہ پاگل اور ایک کامیاب مصور وہ تمہیں بھلا نا نہیں چاہتا تھا اس وجہ سے وہ تمہاری ہر سال ایک تصویر بنایا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا دیکھو میری عروسہ میں کتنی تبدیلی آتی جارہی ہے۔'' ۲۳

ارمان شمسی نے بچوں کی نفسیات پہ لکھا 'فینٹاسی کنگڈم' افسانہ لکھا۔اس افسانے میں بچے سیر کے لئے جاتے ہیں۔ان بچوں کے ساتھ گھر کا نوکر بھی جاتا ہے۔بچے تو فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہو جاتے ہیں۔لیکن گھر کا نوکر منان کو باہر ہی رکنا پڑتا ہے۔اس لیے منان پھر ارادہ کرتا کہ ایک روز وہ بھی خود یہاں آئے گا۔پھر وہ تنخواہ سے کچھ کچھ رقم جمع کر کے فینٹاسی کنگڈم میں جاتا ہے۔لیکن ٹکٹ کے لائن میں ہی اس کی جیب کتر جاتی ہے۔اس وجہ سے ان کو فینٹاسی کنگڈم میں داخل ہونا ممکن نہیں ہوتا۔اس کہانی کی اختتامی دو پراگراف ملاحظہ ہو:

''لائن دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔وہ اچک اچک ٹکٹ کاؤنٹر کو دیکھتا اور کبھی اپنے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کی گنتی گنتا کہ اب کتنے آدمی رہ گئے ہیں۔خدا خدا کر کے وہ ٹکٹ کاؤنٹر تک پہنچا تو اس نے اپنی گردن کو خم کر کے ایک ادائے بے نیازی سے ٹکٹ بابو کو دیکھا اور پتلون کے جیب میں ہاتھ ڈالا۔تو اس کا ہاتھ جیب سے پھسل کر یوں باہر نکل گیا جیسے جیب میں گھلا ہوا صابن لگا ہو۔اس نے گھبرا کر اپنی کٹی ہوئی جیب کو دیکھا اور جلدی جلدی اپنی پتلون کی دوسری جانب کی جیبیں ٹٹولنے لگا مگر وہ تو سب خالی تھیں۔

آن کی آن میں جیسے کسی نے اسے آسمان سے نیچے دھکیل دیا۔وہ نیچے اور نیچے گرتا ہوا زمین سے آٹکرایا۔ایک دھماکہ ہوا۔ فینٹاسی کنگڈم کے جلتے بجھتے قمقموں کا فیوز اڑ گیا۔چاروں طرف سے اندھیرا ہی اندھیرا۔وہ گلا پھاڑ کر چیخا۔''ہائے میرے روپے ...میری جیب کسی نے کاٹ لی....''

اس کو روتا بلکتا دیکھ کر دو منٹ کے لئے ٹکٹوں کی بکری رک گئی۔ آس پاس کھڑے لوگوں نے اس کی بات سنی۔ اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ کچھ لوگوں نے ہمدردی کے بول کہے اور کچھ کے چہروں پر یہ دکھ کے سائے بھی لہرائے تاہم ٹکٹوں کی فروختگی دوبارہ شروع ہوگئی۔ لوگ اسے دیکھتے، ہمدردی سے سر ہلاتے ٹکٹ خریدتے اور فیفا سی کنگڈم میں داخل ہوتے رہے۔'' ۲۴

مذکورہ افسانے میں معاشرہ کی تنگ دستی دکھائی گئی ہے۔ اس میں سب سے زیادہ تنگ رہتے ہیں بنگلہ دیش میں مقیم اہل اردو۔ یہ لوگ تو پہلے یوپی یا بہار سے سابق مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش میں آئے تھے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد ان لوگوں کی زندگی میں بہت نشیب و فراز آئے۔ کہیں کہیں تو قتل عام بھی ہوا۔ جس تسکین اور سرور کے لیے لوگوں نے گھر چھوڑا تھا وہ آج بھی شاید پورا نہیں ہوا۔ پھر بھی بنگلہ دیش میں وہ لوگ آج تک مقیم ہیں۔ بنگلہ دیش کے ساڑھے ۳ لاکھ لوگ کی مادری زبان آج بھی اردو ہے۔ وہ روانی کے ساتھ اردو کہہ سکتے ہیں۔ ۱۹۹۹ سے یونیسکو نے ۲۱ فروری کو یوم مادری زبان اعلان کیا ہے۔ اس دن کے بعد ہر شخص اپنی مادری زبان میں بات چیت کرنے کا پورا حق رکھتا ہے۔ اردو والے بھی اردو زبان و ادب کی ترقی میں جان توڑ کر محنت کر رہے ہیں۔ اس وقت'' ڈھاکہ یونیورسٹی سے جرنل آف اردو'' نام سے تحقیقی جرنل بھی شائع ہو رہا ہے۔ ''شاہکار'' نام سے تخلیقی مجلہ شائع ہو رہا ہے۔ مختلف اردو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، اس کے باوجود ہجرت کی تکلیف، صدمہ تو دل میں رہ گئی ہے۔ اس کو ارمان شمسی کی زبان میں پڑھئے۔

''کیا آپ سمجھتے ہیں، کسی مہاجر کا دل دکھ سے خالی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب یہ فعل ہجرت مقدس سے منسلک تھا لیکن اب یہ ہمارے لئے ایک لعنتی فعل بن گیا ہے۔ اس ہجرت کی وجہ سے میری زندگی تعفن زدہ ایک گھاؤ بن گئی ہے جس کی سڑاند کو میں ڈھکے ڈھکے پھرتا ہوں۔ کاش یہ گھاؤ اتنا بڑھ جائے کہ میرے وجود کو فنا کر دے۔'' ۲۵

ہجرت کے وقت اپنی جائداد، پڑوسی اور اقارب کو چھوڑ کر جانا پڑتا ہے۔ اپنی یادگار کو ترک کر کے دوسری نا معلوم راستہ میں چل پڑنا ہوتا ہے۔ وہ حالت کیسی ہوتی ہے وہ بھی ارمان شمسی کی قلم سے یوں ظاہر ہوتی ہے۔

''ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جارہے ہو، تمہارے جانے کے بعد یہ گلیاں محلے سب سنسان ہو جائیں گے، مکان حویلیاں کسٹوڈیں میں چلی جائیں گی، ان پر شرنا رتھی قبضہ کرلیں گے۔''

تمہارے جانے کے بعد ہماری تہذیب وتمدن کی رونق دم توڑ دے گی۔ ہمارے تہواروں کی شان چلی جائے گی، تمہاری اجداد کی ہڈیاں، جو یہاں دفن ہیں انپر کون فاتحہ پڑھا کرے گا''۔۲۶

مہاجرین کی زندگی اکثر بہت الجھن میں گزرتی ہے۔ خصوصا قیام بنگلہ دیش کے بعد بنگلہ دیش میں مقیم مہاجرین کی حالات بہت سنگین ہوگئی تھی۔ ارمان شمسی ایک افسانہ میں ان حالات کو یوں بیان کرتے ہیں:

میں اپنے بنگالی دوست کے گھر گیا ہوا تھا، اس کے ابا گھر میں موجود نہیں تھے۔ کچھ دیر میں وہ واپس آئے تو مجھے دیکھ کر چونکے ''ارے باقر تم یہاں ہو؟'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے ''خدا نے تمہاری جان رکھ لی۔ تمہاری کالونی پر حملہ ہوا ہے، تمہارے ابا اماں چھوٹے بھائی بہن سب کو شہید کر دیا گیا۔ ہنگامے کی آواز سن کر جب میں تمہارے مکان پر پہنچا تو سب دم توڑ چکے تھے۔ ظالم لوگ کہہ رہے تھے باقر کی لاش یہاں نہیں ہے، وہ شاید نکل بھاگا ہے۔''۲۷

ارمان شمسی کے افسانے میں جنسیات ہے۔ جنسیات کے لئے وہ مشہور بھی ہیں۔ انہوں نے جنسیات کو کیوں موضوع بنایا اور اس سے کیا ملا ہے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ''چاندنگر'' افسانوی مجموعہ کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ منٹو مجھے پسند تھا لیکن عصمت، بیدی، کرشن چندر، قرۃ العین، پریم چند، علی عباس حسینی اور خواجہ عباس نے بھی متاثر کیا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ جب میں نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ''آشنائی کا کرب'' لکھا۔ تو اسکے ڈانڈے کسی حد تک منٹو سے جا ملے۔ مجھے دبی دبی اور کبھی سخت تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ کلکتے میں میرے ایک شاعر دوست نے مجھ سے دریافت کیا۔ کیا تم منٹو بننا چاہتے ہو؟ دیکھو باز آؤ اس خیال سے اور خود کو اس قابل بناؤ کہ تمہاری کتاب شرفا

کے گھروں میں بھی رکھی جاسکے'' اس تنقید کے زیر اثر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جس طرح میں سوچتا ہوں شاید اس طرح ہر کوئی نہیں سوچتا۔ پھر میں نے ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' ''خواب ریزے'' دو مجموعے اور لکھے جو جنسی معاملات سے مبرا تھے۔ یہ پچیس عدد کہانیوں لکھنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں پایا۔ اس درمیان ''آشنائی کا کرب'' کو بہار اردو اکیڈمی پٹنہ کی جانب سے ایوارڈ ملنے کا اعلان سامنے آیا جو کہ میری پہلی کتاب تھی اور اسکی کہانیاں جنسی مسائل پر ہی مبنی تھیں۔

اب میری ہمت بڑھی اور میں نے نڈر ہو کر چوتھا مجموعہ پیاسی ندیا لکھا۔ جس کی تمام کہانیاں جنسی مسائل کو بنا کسی تلذذ کے اجاگر کرتی تھیں۔ اس کتاب کا بھی ''قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی'' کی جانب سے عندیہ ملا کہ تھوخریداری کی فہرست میں کتاب چلی گئی ہے۔ میرے لئے دور دراز کا معاملہ تھا۔ پبلیشر کتابیں فراہم نہ کر سکا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

اب حالت یہ ہے ادبی حلقوں کے ہر مکتب فکر کو خوش رکھنے کے چکر میں گھن چکر بن گیا ہوں لیکن منٹو کے سائے سے پیچھا نہیں چھڑا سکا وہ ''شناخت'' ہو۔ ''ریشم کا جال'' ہو یا ''کالی پری'' ہو، یا ''پرچھائیاں'' ان سب مجموعات میں بھی کچھ کہانیوں کا رخ منٹو کی جانب مڑ ہی گیا ہے۔''[۲۸]

ارمان شمسی کیوں منٹو کا اقتدار کرتے ہیں اس کے بارے میں وہ خود اور لکھتے ہیں:

''منٹو کو فحش نگار یا جنس زدہ کہنا مناسب نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسکے افسانوں میں عورت کے کوائف بیشیر نظر آتے ہیں وہ انکے دکھ اور بیچارگی کا اظہار بے باکی سے کیا کرتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ عورت کے جسمانی استحصال یا روحانی قتل کی منظر کشی قاری کی جنسی تسکین یا تلذذ کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ بے خوفی سے ہمیں آئینہ دکھلاتا ہے اب یہ ہمارا قصور ہے کہ آئینے کے منظر میں ایسے کھو جائیں کہ پس منظر کے بارے میں غور ہی نہ کریں۔''[۲۹]

ارمان شمسی کو اگر چہ جنسیات پسند افسانہ نگار کہا جاتا ہے مگر انہوں نے جنس کو موضوع نہیں بنایا بلکہ وہ جنس زدہ معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ احمد الیاس اس موضوع پر لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ان کے افسانوں کا موضوع جنس نہیں بلکہ وہ جنس زدہ معاشرہ ہے جہاں

عورت اور مرد دونوں استحصال کا شکار ہو رہے ہیں۔ ارمان شمسی کا کہنا ہے کہ ان کے افسانوں میں جنس سے زندگی کا تعلق گوشت اور ناخن جیسا ہے۔ لہذا ان کی کہانیوں میں گوشت سے ناخن کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں انسان کی داخلی زندگی اور خارجی ماحول کے درمیان تناؤ اور کشمکش کی تصویر کشی کی ہے۔ انکے یہاں علامت نگاری بہت کم نظر آتی ہے، یہ ان کی کہانیوں کی ایک اور خوبی ہے۔ جو بات انہیں جیسی لگی، علامت کا سہارا لے بغیر وہی بات انہوں نے اسی طرح پیش کر دی۔ البتہ اتنا ضرور خیال رکھا کہ انسانی تہذیب کی اعلی قدریں مجروح نہ ہوں۔''[۳۰]

احمد الیاس اور ایک مقالہ میں لکھتے ہیں:

''وہ اپنے ان کرداروں کے ذریعے ٹوٹتی اور گرتی ہوئی قدروں سے دوچار اپنے آس پاس کے انتشار زدہ سماجی اور معاشرتی نظام کی زبوں حالی کو اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں طبقاتی معاشرہ اور سماجی اقدار کا محاسبہ کرتے ہیں اور اس احتساب کے عمل میں وہ قاری کو کہیں بھی جنسی تجسس سے گمراہ نہیں کرتے بلکہ اس کے شعور کو احساس برہنگی سے جھنجوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں انہوں نے اپنی کہانیوں میں جنس نہیں بلکہ جنس زدہ معاشرے کو موضوع بنایا ہے جہاں عورت اور مرد دونوں کا استحصال ہو رہا ہے۔''[۳۱]

ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کے بارے میں نوشاد نوری کہتے ہیں۔ ارمان کی نظر انسانی جبلت اور احساسات کی جزئیات پر بھرپور ہے۔''[۳۲]

افتخار امام صدیقی نے ارمان شمسی کو بنگلہ دیش کے لئے اردو کا تنہا مجاہد قرار دیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ارمان شمسی کا ہر افسانہ اپنا سیاق وسباق اختیار کرتا ہے تو وہ اسے ربڑ کی طرح کھینچتے نہیں بلکہ جتنی اس میں سکت ہے وہیں تک اسے لے جا کر فنی کمال کو کاغذ بند کر دیتے ہیں، گویا قطرہ قطرہ تخلیقی نور کو پوری طرح نچوڑتے نہیں بلکہ اگلے کسی حساس موضوع میں سمو کر اسے بھی فن پارہ بنا دینے کی سعی کر کے سرخرو ہو جاتے ہیں۔''[۳۳]

ارمان شمسی کے بارے میں اظہار اثر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ وہ بنگلہ دیش میں مقیم ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کی داد دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ گلستاں کی سیر کر رہے ہوں تو آپ کو طرح طرح کے خوشنما پھول نظر آئیں گے جن میں سے ہر پھول آپ کا دل موہ لے گا۔ لیکن اگر آپ کسی بے آب و گیاہ صحرا سے گزر رہے ہیں جہاں میلوں تک سبزہ نظر نہیں آتا وہاں اچانک آپ کو چند پھول نظر آجائیں تو آپ کو پھولوں کی اصل قدر و قیمت کا احساس یقیناً ہوگا۔

بالکل احساس بنگلہ دیش کے ان افسانہ نگاروں کو پڑھ کر ہوتا ہے جو اردو میں افسانے لکھ رہے ہیں۔ چونکہ بنگلہ دیش میں اردو کو تقریباً ختم کر دیا گیا ہے اس لئے وہاں کے افسانہ نگار اپنی تخلیقات ہندوستان اور پاکستان کے رسائل میں شائع کرا کے اردو سے اپنی محبت کے جذبے کو تسکین دیتے رہتے ہیں۔ ارمان شمسی بھی بنگلہ دیش میں رہتے ہوئے اردو میں افسانے لکھتے ہیں اور ہندوستان کے رسائل میں شائع ہونے کے لئے بھیجتے رہتے ہیں۔ لیکن تخلیق کار کہیں کا بھی رہنے والا ہو اس کا اصل تعارف تو اس کی تخلیق ہوتی ہے اور اس کی تخلیقات قارئین کو دوہرا متاثر کرتی ہے۔''[۳۴]

ارمان شمسی کے بارے میں شمیم زمانوی لکھتے ہیں:

''انہوں نے زندگی کو بہت غور سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ ایک عام آدمی اپنے اردگرد رونما ہونے والے واقعات سے اتنا متاثر نہیں ہوتا جتنا، ایک ادیب اور شاعر ہوتا ہے۔ ارمان شمسی ایک اچھے ادیب کی طرح معاشرے کے اردگرد نگاہ رکھتے ہیں۔ معاشرے کی برائیوں اور دکھوں کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ انسانی نفسیات پر بھی بہت گہری ہے۔''[۳۵]

سرور غزالی بھی ارمان شمسی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

ارمان شمسی، ایسی تمام مایوس کن نہ سہی مگر ادب کی مشکل صورت حال میں ایک روشنی کا منبع ہیں۔ ان کی کہانیاں، افسانے صحیح معنوں میں شاہکار کہانیاں ہیں۔ زبان و اسلوب کا اعلیٰ معیار، کردار اور ماحول کی منظر کشی کا خوبصورت امتزاج، ان کا خاصہ

ہے۔اوراس کے ساتھ ساتھ وہ معاشرے کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو جس بے باکی کے ساتھ اٹھاتے ہیں اوراخلاق وتہذیب کی حدود کو پار کئے بغیر نہایت چابکدستی سے نباہتے ہیں وہ ان کا ہنر ہے۔کہانی ایسی گوندھی ہوئی کہ تسلسل ودلچسپی کا دامن تھامے قاری کو تخیل کے گھوڑے پر اڑائے لئے جارہی ہو۔،،۳۶

ارمان شمسی کی افسانہ نگاری کی خوبی بیان کرتے ہوئے قمر انجم لکھتے ہیں:

،، آج کل وہ انتہائی سنجیدہ مؤثر ادب لکھ رہیں۔انکی تحریر شگفتہ بھی ہے اور دلچسپ بھی۔زبان وبیان روزمرہ عام فہم ہے۔اسلوب بہت ہی پیارا ہے۔کردار نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے انکی کہانیاں پڑھتے وقت کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ آپ کہانی شروع کیجئے تو آپ کے بس کی بات نہیں رہتی کہ آپ انجام کے پہونچے بغیر کتاب ہاتھ سے رکھدیں اور جب انجام سامنے آتا ہے تو احساس کے تار جھنجھنا جاتے ہیں۔کبھی کبھی قاری سوچتا ہے کاش ایسا نہ ہوتا۔ پھر ایک مدت تک کہانی کے اثرات ذہن پر مرتسم رہتے ہیں۔،،۳۷

ارمان شمسی کے بارے میں احمد الیاس اور لکھتے ہیں:

،،ارمان اپنے افسانوں کے ذریعہ بنگلہ دیش سے باہر کی ادبی دنیا میں اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔میں انہیں نئی نسل کا افسانہ نگار سمجھتا ہوں اور مجھے یہ کہنے میں کچھ عار نہیں کہ وہ اپنے کرداروں،موضوعات،ماحول اور زبان وبیان کے حوالے سے بنگلہ دیش کے افسانہ نگاروں میں ایک الگ زاویۂ نگاہ اور ایک علیحدہ مقام رکھتے ہیں۔،،۳۸

ارمان شمسی نے اپنے نو افسانوی مجموعے سے بنگلہ دیش میں اردو افسانہ نگاری کا پرچم اونچا رکھا ہے۔بنگلہ دیش میں اردو کا ماحول نہ ہونے کی باوجود اردو افسانہ نگاری میں اپنا مقام پیدا کرلیا ہے۔

ارمان شمسی بنگلہ دیش کی اردو نثر نگاری کی شناخت ہے۔ ہم ان سے اور زیادہ تخلیقی کاوشوں کا خواہاں ہیں۔ وہ نئی نسل کے افسانہ نگار ہیں۔ نئی نسل بھی ان سے متاثر ہو کر بنگلہ دیش میں اردو افسانہ نگاری کو انشاء اللہ اور بھی آگے بڑھائے گی۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر لطیف احمد، ''شام ڈھلے''، راجشاہی یونیورسٹی، راجشاہی، ۲۰۱۹

۲۔ احمد سعدی، اور س م ساجد، ''دود چراغ محفل''، شاہکار پبلیکیشنز، ڈھاکہ، ۱۹۸۳ء، ص ۲

۳۔ س م ساجد، ''ایک سوال انگن انگن''، بنگلہ اردو ساہتیہ فاؤنڈیشن، ڈھاکہ، ۲۰۱۷ء، ص ۵

۴۔ ارمان شمسی، میری اپنی کہانی، ''سہ ماہی رنگ'' (مدیر: شان بھارتی اور ڈاکٹر مشتاق صدف) .....، ص ۸۔۹

۵۔ ارمان شمسی، گلچین کا خمار، ''آشنائی کا کرب''، بیسویں صدی میگزین، نئی دہلی، انڈیا، ۲۰۰۳، ص ۱۴۹

۶۔ ارمان شمسی، میری اپنی کہانی، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۱۰

۷۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی تنہا مجاہد... اردو مخالف دیش کا، ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰ء، ص ۵۶

۸۔ ارمان شمسی، حرف آغاز، ''پیاسی ندیا''، رنگ پبلی کیشنز، انڈیا، ۲۰۰۹ء، ص ۷

۹۔ ارمان شمسی کی نجی فائیل سے ماخوذ ہے۔

۱۰۔ ارمان شمسی، منٹو کا سایہ، ''چاند نگر''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴

۱۱۔ ارمان شمسی، سخن ہائے گفتی، ''پرچھائیاں''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۷ء، ص ۴

۱۲۔ مرزا رفیق شاکر، صحرائے اعظم میں نخلستان، ''کالی پری''، بزم افضل، کولکاتا، ۲۰۱۳ء، ص ۸

۱۳۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ارمان شمسی کے افسانے میں معاشرے کی تلخی، ''چاند نگر'' ص، ۲۶

۱۴۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۱

۱۵۔ ارمان شمسی، بھوک کا شکنجہ، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج'' بیسویں صدی بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۸۹۔۹۰

۱۶۔ سلطانہ مہر، ''گفتنی''، حصہ اول، مہر بک فاؤنڈیشن، کراچی ۲۰۰۰ء، ص ۳۶

۱۷۔ ارمان شمسی، منجدھار، ''آشنائی کا کرب'' بیسویں صدی میگزین، نئی دہلی، ۲۰۰۳، ص ۹
۱۸۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، سہ ماہی رنگ، ص ۲۲
۱۹۔ ارمان شمسی، ڈھلان سے ابھرتا سورج، ص ۱۰
۲۰۔ ارمان شمسی، خواب ریزے، ''خواب ریزے'' رنگ پبلی کیشنز، دھنباد، بھارت، ۲۰۰۹ء ص ۱۵۴
۲۱۔ ارمان شمسی، بوجھ، ''کالی پری''، ص، ۸۶
۲۲۔ ارمان شمسی، ممتا کی چاہ، ''خواب ریزے''، ص ۹
۲۳۔ ارمان شمسی، خواب ریزے۔ ''خواب ریزے'' ص ۱۵۹
۲۴۔ ارمان شمسی، فیخاسی کنگذم، ''ڈھلان سے ابھرتا سورج''، بیسویں صدی بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۶، ص ۲۵
۲۵۔ ارمان شمسی، سن آف بنگلہ دیش، ''چاندنگر'' ص۔ ۵۹
۲۶۔ ارمان شمسی، چاندنگر، ''چاندنگر''، ص ۲۳
۲۷۔ ارمان شمسی، سن آف بنگلہ دیش، ''چاندنگر'' ص۔ ۵۷
۲۸۔ ارمان شمسی، منٹو کا سایہ، ''چاندنگر''، ص ۱۴۔ ۱۵
۲۹۔ ایضاً، ص۔ ۱۲
۳۰۔ احمد الیاس، ارمان شمسی ایک منفرد افسانہ نگار، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۳۔ ۲۴
۳۱۔ احمد الیاس، ارمان شمسی۔ نئی نسل کا افسانہ نگار، نجی مسودہ، ص ۲
۳۲۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۱
۳۳۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی تنہا مجاہد۔ اردو مخالف دیش کا، ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰، ص ۵۶
۳۴۔ افتخار امام صدیقی، ارمان شمسی۔۔ اپنوں کی تنقیدی سان پر۔ ''شاعر''، اگست ۲۰۱۰، ص ۵۷
۳۵۔ شمیم زمانوی، ارمان شمسی: شخصیت کے آئینے میں، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۲۱
۳۶۔ سرور غزالی، ارمان شمسی، بنگلہ دیش میں آفتاب اردو، ''ریشم کا جال''، بزم افضل، کولکاتا، ۲۰۱۴، ص ۱۲
۳۷۔ محمد قمر انجم، ارمان شمسی عصر حاضر کا ادیب، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۱۷
۳۸۔ احمد الیاس، ارمان شمسی ایک منفرد افسانہ نگار، ''سہ ماہی رنگ''، ص ۳۶

اردو اور فارسی سے بنگلہ ترجمہ نگاری میں جاوید حسین کی خدمات

محمد غلام مولا*

[Javed Hussen (1976-Present) was born in Cumilla District in Bangladesh. He is a prolific writer and translator. However, he is more commonly known as Ghalib Researcher. As we know the progress of a nation is not an easy task. It depends upon the selfless work or noble sacrifice of some worthy sons of the soil. They work without rest and often without praise. While most of the people are busy for their own name comfort these few person can live and die to make life of their fellow men richer and happier. Javed Hussen is such an eminent figure who has been revolutionized in the fields of Urdu and Persian literary translation in Bangladesh. He worked extensively in Urdu and Persian translation areas. Still he is contributing to make a bridge between Urdu, Persian and Bangla Literature. The following article will be discussed Javed Hussen's contribution along with his translated books and articles which had been published in different journals and magazines nationwide.]

ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح مشرقی بنگال یعنی بنگلہ دیش میں بھی اردو کا چرچا جاری تھا۔ بنگلہ دیش میں اردو و فارسی کے چرچے کی تاریخ بہت ہی قدیم ہے۔ اس سلسلے میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں چند اردو شعرا دہلی، کلکتہ اور مرشد آباد سے بنگال آئے اور بود و باش اختیار کیا۔ دراصل انہوں نے ہی بنگال کے اس خطے میں اردو شعر و شاعری اور ادب کی داغ بیل ڈالی۔ اس کے علاوہ امرا اور شرفا نے بھی اس زبان و ادب

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

کی پرورش کی اور اسے پروان چڑھایا۔ جن میں عبدالکریم خاکی، سید بخت، فتح علی، منیر الدین یوسف اور نصیر الدین حیدر کے نام یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اور بھی چند شعراء ہیں جنہوں نے بنگلا دیش کی حصول آزادی کے بعد یہاں اردو شعر و شاعری کا چرچا جاری رکھے، ان میں سے رضا علی وحشت، سلیم اللہ فہمی، نوشاد نوری، جلال عظیم آبادی، احمد الیاس، شمیم زمانوی، صابر علی صابر، جمال مشرقی اور نظیر صدیقی مشہور ہیں۔

اس خطہ زمین پر اردو و فارسی زبان کے چرچے کے ساتھ ساتھ ان کے تراجم کا کام بھی بہت پہلے ہی شروع کیا گیا۔ اس دور میں اردو و فارسی سے بنگلہ ترجمہ اور بنگلہ زبان کی بہت ساری کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا گیا۔ جس کا مقصد تھا کہ بنگلہ، اردو اور فارسی ادب کے درمیان باہمی رشتہ پیدا کرنا اور لوگوں کو ان زبان و ادب کے بارے میں کافی علم فراہم کرنا۔ ایک اور مقصد یہ تھا کہ ان زبانوں کے بولنے والوں کے درمیاں آپسی محبت و بھائی چارگی میں اضافہ ہو جائے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اس ملک میں بہت سارے ترجمہ نگار پیدا ہوئے جنہوں نے ترجمہ نگاری کے لئے اپنے فرائض کو اچھی طرح انجام دیا۔ ڈاکٹر عبداللہ نے بنگلہ دیش کے قومی شاعر قاضی نذر الاسلام کی نظموں اور غزلوں کا اردو میں ترجمہ کر کے اردو والوں کو اس کے بارے مطلع کیا اور ساتھ ساتھ انہوں نے اردو کے بہت سارے مقالے و مضامین کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا۔ اسی طرح احمد سعدی، سلیم اللہ فہمی، اسد چودھری، ہیکل ہاشمی، محمد غلام ربانی، مصطفیٰ ہارون، جعفر عالم، انور حسین منجو، فاطمہ جہان، شفیق النبی صمادی، محمد عنایت اللہ صدیقی اور جاوید حسین وغیرہ ترجمہ نگاری کے میدان میں پیش پیش ہیں۔ یہ سب کے سب اردو سے بنگلا میں ترجمہ کرنے میں دست مہارت رکھتے ہیں۔

اس میدان میں انہیں کی ثابت قدمی کی وجہ سے ہمیں اردو زبان و ادب کے زخیرہ سے معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ انکی محنت کے نتیجے میں ہی اردو ادب کا ژخیرے اب بنگلہ زبان میں آسانی سے ملتے ہیں۔

جاوید حسین کے متعلق ہم باتیں کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ دراصل ''محقق غالب'' ہیں اور ساتھ ساتھ مترجم کی حیثیت سے بھی اپنا قدم جمالیا۔ اس میدان میں انہوں نے اپنی علیحدہ ایک پہچان بنائی ہے اور بنگلہ دیش کے اردو ترجمہ نگاری میں وہ حد درجہ شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ انکے اردو سے بنگلہ زبان میں ترجمہ کئے ہوئے مضامین اور کتابیں لوگوں نے بے حد پسند کیا اور ذوق و شوق کے ساتھ پڑھتے رہے۔

جاوید حسین بنگلہ دیش کے کوملا ضلع میں پیدا ہوئے۔ وہ دراصل ''نظریہ مارکس'' کے حامی ہیں۔ اور اس نظریہ پر انکی کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے فن حساب پر 'ایم۔ اے' کی ڈگری حاصل کی اور میر تقی میر، فیض

احمد فیض اور منصور حلاج کی شاعری کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے اردو ترجمہ نگاری میں ہلچل مچا دیا۔ چونکہ پہلے ہی ہم کہہ چکے ہیں کہ اس موقع پر جاوید حسین کی اردو فارسی و ترجمہ نگاری پر بات کی جائے گی اس لئے ذیل میں بنگلہ دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں انہوں نے جو اضافہ کی اور اس میدان میں جو خدمات انجام دیں اسکے ساتھ تعارف کرائیں گے اور جن کتابوں کا اردو سے بنگلہ میں ترجمہ کر کے انہوں نے بنگلا دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں جو انقلاب پیدا کیا ہے ان کتابوں کی فہرست ذیل میں پیش کریں گے۔

اردو سے بنگلہ زبان میں ترجمہ کردہ کتابیں:

ا۔ ''کالو سانا'' (কালো সীমানা سیاہ حاشیہ)

یہ سعادت حسن منٹو کا لکھا ہوا اہم افسانہ ہے۔ جسے انہوں نے تقسیم ہند کے بعد لکھا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد وہ بمبئی چھوڑ کر لاہور میں بس گئے۔ یہ نیا ماحول اور جگہ انکے لئے بہت تکلیفدہ ثابت ہوا اور بہت سارے مصائب و مشکلات میں وہ گرفتار ہو گئے۔ پہلے ہی سے انکو شراب پینے کی عادت تھی مگر اب اسکو چھوڑنا پڑا اور سچائی کی باتیں بے ڈر کہنے کی جرائت تھی جسکی وجہ سے وہ دوسروں کے دشمن بن گئے تھے۔ اور دوسروں سے تنہائی اختیار کرنے لگے۔ اسلئے وہ اکیلا پن محسوس کرنے لگے۔ اسکی رو سے منٹو نے تقسیم ہند کی وجہ سے لوگوں کو کیا کیا مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس موضوع پر یہ کتاب لکھی۔ اس کے اندر بیان کئے ہوئے تمام واقعات اگر چہ چھوٹے ہیں مگر وہ سب کے سب معنی دار ہیں اور وہ افسانہ لوگوں کو فرحت بخشنے کے بجائے دکھ پہنچی۔ سب سے زیادہ فخر کی بات تو یہ ہے کہ منٹو کی یہ مشہور افسانہ ''سیاہ حاشیہ'' کا بنگلا ترجمہ حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ جاوید حسین نے اس ترجمہ شدہ کتاب کا نام دیا ہے (سیاہ حاشیہ)۔ ترجمہ نگاری میں انہوں نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے اور اچھی طرح کی ترجمانی کی ہے۔ منٹو کے بتائے ہوئے تمام واقعات کو جاوید صاحب نے اچھی طرح سمجھا اور اسکو آسان و سلیس بنگلا زبان میں ترجمہ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کما حقہ اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک کہانی ملاحظہ فرمائیے۔

بقول منٹو ''اطلاع موصول ہوئی ہے کہ مہاتما گاندھی کی موت پر اظہار مسرت کے لئے امرتسر گوالیار اور بمبئی میں کئی جگہ لوگوں میں شیرنی بانٹی گئی'' (سیاہ حاشیہ)

اسکا بنگلہ ترجمہ جاوید حسین نے اس طرح کیا ہے:

"খবর পাওয়া গেল যে মহাত্মা গান্ধীর মৃত্যুতে আনন্দ প্রকাশ করার জন্য অমৃতসর গোয়ালিয়র আর বোম্বের কয়েক জায়গায় মিষ্টি বিতরণ করা হয়েছে।"[১]

২۔ ''غالب پر یدی ہوتے'' (গালিবের হৃদয় হতে) جان غالب

یہ کتاب دراصل مرزا اسد اللہ خان غالب کی منتخب غزلوں اور نظموں کے ترجمہ اور تشریح ہے۔ اسکے مصنف انعام اللہ ناصر ہیں۔ جاوید حسین نے اس کا بھی بنگلہ ترجمہ کیا ہے اور اس کتاب میں اپنی طرف سے ایک مقدمہ بھی ہے۔ اس کتاب کے ترجمہ نگاری میں انہوں نے اپنی مہارت کا اظہار کیا ہے۔ دیکھا گیا کہ اصلی کتاب کا جو پیغام تھا بنگلا ترجمہ میں بھی وہ باقی ہے۔ جاوید حسین نے اس ترجمہ شدہ کتاب میں غالب کی اردو غزل کو مع بنگلا زبان کے ترجمہ میں پیش کیا اور ساتھ ساتھ غالب کے خطوط اور اس کا جواب بھی حسن انداز میں قارئین کے سامنے اجاگر کیا۔ جان غالب کے ترجمہ نگاری میں جاوید صاحب کا انداز بیان سب کو خوب پسند آیا۔ آخر میں یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جاوید حسین کی وجہ سے ہی آج بنگلا بولنے والوں کو غالب کے شعر و شاعری واقفیت حاصل ہونے لگی۔ نمونہ کلام:

ہیں اور بھی دنیا میں سخنوار بہت اچھے

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیان اور

اسکا بنگلا ترجمہ جاوید حسین نے اس طرح کیا ہے کہ:

পৃথিবীতে ভালো কবি অনেক আছে আরো

লোকেরা বলে গালিবের বলার ভঙ্গি অন্য রকম।[২]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جاوید حسین نے کما حقہ اسکا ترجمہ کیا ہے۔ جو کہ قابل تعریف بات ہے۔

۳۔''فیض احمد فیض ار کبیتا'' (ফয়েজ আহমদ ফয়েজ এর কবিতা) فیض احمد فیض کی شاعری)

یہ کتاب بھی جاوید صاحب کا ترجمہ شدہ ایک اچھی خاصی کتاب ہے۔ اسکے اندر انہوں نے فیض کی شاعری کو اتنی خوبی سے ترجمہ کر کے بنگلا بولنے والوں کے سامنے پیش کیا ہے کہ اب فیض قارئین کے سامنے ایک اونچے طبقہ کے شاعر بن چکے ہیں۔ یہ کمال صرف جاوید حسین کو جاتا ہے۔ ترجمہ نگار جاوید حسین کا کہنا ہے کہ یہ کتاب دراصل لاہور سے شائع شدہ فیض کے شعری مجموعہ سے ہے۔ نمونہ کلام:

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلاغتی ہوئی شام

دھول کے نگلی ابھی چشمہ مہتاب سے رات

جاوید حسین کی زبان میں اسکا ترجمہ:

নিভে যাচ্ছে বিমর্ষ দগ্ধ সন্ধ্যা
এখনই চাঁদের ঝরনায় স্নান করে বের হবে রাত।৩

۴۔ ''منصور حلاج پر کویتا'' (منسور হাল্লাজের কবিতা منصور حلاج کی شاعری)

یہ دیوان منصور حلاج سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ بھی جاوید حسین کا ترجمہ کی ہوئی ایک کتاب ہے۔ جس میں منصور حلاج کی سیاسی، سماجی شاعری اور انکی زندگی کے مختلف پہلو پر بات چیت کی گئی ہے۔ خود ترجمہ نگار جاوید صاحب نے اس کتاب کے دیباچہ میں ہی کہا ہے کہ اس کتاب میں صرف منصور حلاج کی شاعری پر بات نہیں ہوگی بلکہ ان کی زندگی کے سیاسی، سماجی اور دوسرے پہلوں پر بھی بات ہوگی۔ اس لئے دیکھا گیا ترجمہ کار نے اس کے اندر منصور حلاج کی زندگی اور شاعری کے ساتھ ساتھ ان کے ہمعصر سماجی وسیاسی نظریات پر اپنا قلم اٹھایا۔ حلاج کے بارے میں عقلمندوں کے لکھے ہوئے اقوال کو بھی جاوید حسین نے بنگلا زبان میں ترجمہ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا۔ ترجمہ نگاری میں انہوں نے کافی غور وفکر کے ساتھ ترجمہ کیا ہے تا کہ اصلی مواد وکہانی ترجمہ میں صحیح طور پر استعمال ہوگا۔ جس میں وہ کامیاب ثابت ہوئے۔

ترجمہ شدہ نمونہ کلام:

میں منھ نہ کھول کر حلق تک جو پانی پی لیا
وہ پانی میری منھ کو پھر بھی جزب کر لیا
আমি মুখ না খুলেই আকণ্ঠ পান করেছি যে জল
সেই অতি পরিচিত জল আমার মুখ নিয়েছে শুষে।৪

۵۔'' میر تقی میر ار کویتا ہوتے'' (میর তকি মীর : কবিতা হতে میر تقی میر: غزل سے)

ظاہر ہے کہ میر تقی میر کو اردو غزل گوئی کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ انکی منتخب غزلوں کو جاوید حسین نے بنگلا زبان میں ترجمہ کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا اور اس ترجمہ شدہ کتاب کا نام دیا ''میر تقی میر: غزل سے'۔ اس کتاب میں انہوں نے تقریبا میر کے چار سو سے زیادہ غزلوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اتنا اچھا ترجمہ کیا ہے کہ قارئین اس پر فدا ہو گئے۔ زبان کی بھر ماری، آسانی، سلاست اور شستگی اس کا اہم عنصر بن گئی ہے۔ اس ترجمہ شدہ کتاب کے مقدمہ میں مترجم نے میر کے بارے میں کافی معنی دار باتیں کہی ہیں۔ اسکے بعد غزلوں

کے ترجمہ پر دھیان دیا گیا ہے۔ مقدمہ میں ہی جاوید حسین نے میر کو اعلیٰ طبقہ پر بٹھایا جو کہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جاوید حسین حقیقتاً بہت بڑے ترجمہ نگار ہیں۔ نمونہ کلام میں میر کا شعر:

شعر میرے ہے گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

यदिও আমার কবিতা বিশিষ্টজনের পছন্দ
কিন্তু আমার কথা সাধারণের সাথে।[৫]

٦۔ بدھ بھومیر اتشب (বধ্যভূমির উৎসব جشن مقتل)

جشن مقتل دراصل احمد فراز کی اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔ جاوید حسین نے اس کتاب کو بنگلا زبان میں ترجمہ کر کے اس کا نام ''بدھ بھومیر اتشب'' رکھا ہے۔ مترجم نے اس کتاب میں احمد فراز کی منتخب غزلوں، نظموں اور چند اشعار کا ترجمہ کیا ہے۔ اسکے بارے میں خود جاوید صاحب نے ترجمہ میں کہا ہے: اس کتاب میں دو قسم کے اشعار کا بیان ہوگا وہ ہے غزل اور نظم۔ پہلے نظم اسکے بعد غزل کا بیان کیا جائے گا اور ساتھ ساتھ چند اشعار کا بھی ذکر ہوگا۔ غزل کے آغاز و ارتقا کے بارے میں بھی کافی دلچسپ باتیں کہی ہیں اور کہا کہ ہندوستان میں غزل بہت پسندیدہ صنف شاعری ہے۔ جس پر ہر شاعر اپنی قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ فراز کی غزل کا ترجمہ انہوں نے اچھا کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ایک شعر کا ذکر کیا جاتا ہے:

کٹھن ہے راہگزاں، تھوڑی دور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر، تھوڑی دور ساتھ چلو۔

جاوید حسین نے اس کا بنگلا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

বড়ই বন্ধুর এই পথ, কিছু দূর সঙ্গে চলো
অনিবার্য এই যাত্রা, কিছু দূর সঙ্গে চলো।[৬]

جاوید حسین نے لکھا ہے کہ احمد فراز ایک ترقی پسند شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی آزادی کا نعرہ گونجتا ہے۔ جسے انہوں نے اچھی طرح ترجمہ کر کے ہمارے سامنے پیش کیا۔ نمونہ کلام:

روح کوئی جو ئندان مضمون کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جو ئندان بن گیا۔

এই নশ্বর জগতে মজরুহ্ অনন্ত কি আছে
আমার কবিতা যাকে স্পর্শ করল সেই সীমাহীন হয়ে গেল।[۹]

دراصل احمد فراز کی شاعری میں جن باتوں کا بیان ہے اسے مترجم نے مکمل ترجمہ کیا۔

۷۔ ''দ্রুপদি উর্দু কবিতা'' (দ্রুপদি উর্দু কবিতা اردو کلاسیکل نظمیں)

اس نام سے جاوید حسین نے بنگلا دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں ایک نیا دور کا آغاز کیا۔ اس کتاب میں مترجم نے اردو کے تین مشہور ہستیوں کے بارے باتیں کی ہیں۔ جو کہ واقعی میں دل بہلانے والے ہیں۔ ان تین ہستیوں کے نام ہیں میر تقی میر، مرزا اسد اللہ خان غالب اور علامہ ڈاکٹر محمد اقبال۔ انکے بارے جاوید حسین نے لکھا ہے کہ میر تقی میر اردو شاعری کے شروعاتی دور کے شاعر ہیں اور انہیں کے دم سے اردو غزل اور شاعری کافی بلندی مقام پر پہنچی۔ غالب نے اس صنف شاعری کو ترقی پسندی کے زیور سے آراستہ کیا اور اقبال نے اس فن شاعری کو اور بھی مزید آراستہ کر کے ایک نئے رنگ سے رنگین کیا اور اردو شاعری میں نئے دور کی ترتیب دی۔ جو سچائی اور حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور اس کتاب میں مترجم نے آسان وسلیس بنگلا زبان میں اردو زبان وادب کے بارے میں بحث کی ہے۔ جو کہ قارئین کے لئے بہت ہی مددگار ثابت ہوئے۔ دراصل یہ کتاب بنگلا دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں بہت اہم اضافہ ہے۔ نمونہ کلام:

کیا کہئے رکھے ہم تجھ سے یار خواہش
ایک جان صد تمنا ایک دل ہزار خواہش (میر تقی میر)

اسکا بنگلا ترجمہ جاوید صاحب نے اس طرح کیا ہے:

প্রিয় কত কী যে চাই তোমার কাছে কী বলব সে গল্প
এক প্রাণ সহস্র বাসনা এক হৃদয় আর সহস্র চাওয়া।[۸]

۸۔ জাহিন শাহ তাজির গজল (ذہین شاہ تاجی ار غزل ذہین شاہ تاجی کی غزلیں)

ذہین شاہ تاجی صوفی قسم کے غزل گو شاعر تھے۔ ان کی غزل میں صوفیانہ انداز زیادہ ہے۔ ہندوستان کے ہر خطے میں ان کی غزل کو علحدہ پہچان سے قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی غزلوں کا جاوید حسین نے یوں ترجمہ کیا ہے۔

تو نے دیوانہ بنایا تو میں دیوانہ بنا
اب مجھے ہوش کی دنیا میں تماشا مت بنا

یوسف مصر تمنا تیری جلوہ کے نثار
میری بیداری کو خواب زلیخا نہ بنا

তুমি পাগল করেছো তাই আমি পাগল হয়েছি
এখন বুদ্ধিমানদের দুনিয়ায় আমাকে আর তামাশা বানিও না
মিশরের ইউসুফের বাসনা তোমার রূপে উজাড় হলো
আমার জেগে উঠাকে জুলায়খার স্বপ্ন বানিও না।[৯]

اسطرح انکی ترجمہ شدہ ایک اور مثال یہ ہے :

میں نعرہ مستانہ میں شوق رندانہ
یہ تشنہ کہاں جاؤں، پی کر بھی کہا جانا

আমি আকুল প্রেমের ডাকে মাতাল এলোমেলো চলা
এই তৃষ্ণা নিয়ে কোথায় যাই, তৃষ্ণা মিটলেও বা যাবো কোথায়?[১০]

افسانہ کا ترجمہ

''گلی'' (گلی) ''بنگلا ٹریبین'' اخبار میں جاوید حسین نے گلی عنوان سے ایک افسانہ ترجمہ کر کے شائع کیا۔ جو کہ دراصل انتظار حسین کی لکھی ہوئی اردو کہانی ہے۔ جسکے اندر ۱۹۴۷ کے بعد والے واقعات کا بیان کیا گیا ہے۔ جسے جاوید صاحب نے اسی نام سے بنگلہ زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ افسانہ ۲۰۰۹ء مئی ۹ کو شائع ہو چکا ہے

اخباروں میں شائع شدہ مضامین کا ترجمہ

الیس فیض کا مقالہ 'یاد کے سائے' کو انہوں نے 'سریتیر سائے' نام سے بنگلہ میں ترجمہ کیا ہے۔ الیس فیض، جو فیض احمد فیض کی بیوی تھی انہوں نے یہ مقالہ اپنی ۲۴ سالہ سنساری زندگی کی یادگار کے طور پر لکھی تھیں۔ جس میں انہوں نے اپنی شوہر فیض احمد فیض کے جیل جانے کے بعد انکی فیملی کو جو جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس پر روشنی ڈالی۔

'دل، دلّی اینگ میر' (دل، دہلی اور میر) مضمون کے نام سے جاوید حسین نے اپنی ترجمہ شدہ ایک اور مقالہ شائع کی تھی جس میں مترجم نے میر کی غزل گوئی، دہلی کے واقعات اور دلی کیفیات پر بحث کی۔

اخباروں میں اردو کے متعلق جاوید حسین کے شائع شدہ چند مقالے:

'موکتی جودد ھے لکھا اردو کیتا' (جنگ آزادی میں لکھی ہوئی اردو نظمیں) اس عنوان پر حال ہی میں جاوید حسین کا ایک مقالہ اخبار میں چھپ چکا ہے۔ جسکے اندر انہوں نے بنگلہ دیش کے دو مشہور شاعر نوشاد نوری کی نظم 'لہو میں شر ابور دن' اور 'مسلح فوج' اور احمد الیاس کی نظم 'کال بیساکھی' کا بنگلہ ترجمہ کر کے اردو ادب کو بنگلہ دیش میں بلند کیا۔ ان تینوں نظموں میں بنگلہ دیش کی جنگ آزادی کے بارے اچھا خاصا بیان ہے۔ جو ہر ایک کے دل کو بہلانے والے ہیں۔ اسکا ترجمہ بھی مترجم نے بہت سلیقے سے کیا ہے۔

'غالب ارر شیکتا' (غالب کی طنز و مزاح) اس عنوان پر جاوید حسین کا ایک مقالہ بنگلہ میں شائع ہو چکا ہے۔ جو کہ بہت ہی دلعزیز ہوا۔ انہوں نے 'اردو تے رابندر اناتھ' (اردو میں رابندر ناتھ) عنوان سے اور ایک مقالہ لکھا۔ جس میں انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی جو کتابیں اردو میں شائع ہو چکی ہیں اس کے بارے میں ہمیں اطلاع فراہم کیا اور اردو ادب میں رابندر ناتھ کے مرتبہ اور اہمیت پر بھی باتیں کیں۔

ساتھ ساتھ 'نیشنگ اکاشے یکا چاند' (تنہائی آسماں میں اکیلا چاند) اس عنوان کے تحت جاوید حسین نے مینا کماری ناز کی سوانح حیات اور ان کی چند غزلوں کو بنگلہ میں ترجمہ کر کے اخبار میں شائع کیا۔

اس کے علاوہ "'اردو کیتا رسور' (اردو رشاعری کی نغمے) اور ایک مقالہ لکھا جس میں انہوں نے اردو زبان کس طرح پیدا ہوئی، وہ کس علاقہ کی زبان ہے، اردو کے ساتھ ہندی کا تعلق کیا ہے، اسکی پرورش کس طرح ہوئی اور اسکی ترقی میں صوفی، شاعر و ادیب نے کیا کیا خدمات انجام دیں یعنی اردو زبان میں شروع سے لیکر آخر تک جو نگی تھی اسکے بارے میں جاوید حسین نے اس مقالہ میں اپنی بات کہی ہے۔

'منصور حلاج ار فیرے اشا' (منصور حلاج کا لوٹ آنا) عنوان پر جاوید حسین نے اور ایک مقالہ لکھا ہے۔ جس میں انہوں نے منصور حلاج کے بارے میں بات کہی۔ منصور حلاج دراصل فارسی زبان کے ایک صوفی شاعر تھے۔ ان پر بادشاہ وقت نے الزام عائد کر کے ان کو قتل کر دیا۔ ان کی شاعری میں جو صوفی رنگ ہے اسکو ابھی بھی دوسرے شعراء نے اپنی شاعری میں صوفی رنگ سے پیش کر رہے ہیں۔ یعنی جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ آج کی دنیا میں صوفی شاعری حلاج کے اس صوفی نظریہ کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔"

ٹھاکر سری رام کرشن کی مشہور غزلوں کو بھی جاوید حسین نے اچھی طرح ترجمے کئے ہیں۔ جو کہ کئی اخبار میں چھپ چکے ہیں۔ 'آوارہ خیال' دراصل آوارہ خیال یہ اسرار الحق مجاز کے تصنیف کردہ شعری مجموعہ ہے۔ جاوید

حسین نے اسکوار دوادب کے سلسلہ وار سریز کے نام سے ترجمہ کر کے 'لکھا لکھیر اوتھان' نامی ادبی رسالہ میں شائع کیا۔ جس میں انہوں نے اسرار الحق کے کئی اشعار کو ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دوست واحباب کے بارے میں باتیں کی ہیں۔

جاوید حسین نے غالب، احمد فراز اور میر تقی میر پر اکثر کام کئے ہیں۔ خاص کر کے غالب کی ادبی خدمات پر انہوں نے اپنی خاص توجہ دی ہے۔ جاوید حسین نے اردو زبان وادب کو بنگلہ دیش میں تعارف کرانے کے لئے ترجمہ نگاری کے ساتھ ساتھ بہت سارے پروگرام بھی منعقد کئے ہیں۔

فارسی سے بنگلہ میں ترجمہ شدہ کتابیں:

সারমাদ শহিদের রুবাইয়াত (رباعیات سرمد شہید)

یہ دراصل فارسی شعری مجموعہ ''رباعیات سرمد شہید'' کا اردو ترجمہ ہے جو کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے نکالا تھا۔ جاوید حسین اسکا بھی بنگلا ترجمہ شائع کر چکے ہیں اور اسکی وجہ سے بنگلا دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں ایک نیا باب کا اضافہ ہوا۔ بنگلہ میں اسکا نام ''سرمد شہید ارر باعیات'' (সারমাদ শহিদের রুবাইয়াত) رکھا گیا ہے۔ سرمد شہید فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اردو میں چونکہ اسکے اندر صرف سرمد شہید کی شاعری کا ذکر ہے اسلئے جاوید حسین نے بھی ترجمہ نگاری میں اسی پر اکتفا کیا۔ سرمد شہید کا واقعہ چونکہ تاریخی واقعہ تھا اسلئے ترجمہ نگار نے بنگلا زبان میں اس کا ترجمہ کر کے اہل بنگلا کو اسکے بارے میں اطلاع فراہم کی ہے۔ نمونہ کلام:

عمر است کے فسانہ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ بہم درروشن

بنگلہ میں اس کا ترجمہ:

বহুকাল কেটে গেছে মনসুরের গল্প বলার পর
এবার আমি বধ্যভূমিতে আনবো নতুন বিভা।[১১]

اسکے سوا انہوں نے حفیظ شیرازی کی غزل کا بھی بنگلا میں ترجمہ کیا۔ حفیظ شیرازی فارسی ادب کی بہت ممتاز اور اعلی طبقے کے شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی قاوشوں سے فارسی شعر وشاعری کو اتنا وقار بخشا جو آج بھی ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہر صورت سوجلوہ دلدار دیدم
باہر چیزے جمال یار دیدم

اس کا بنگلہ ترجمہ

সকল দিকে প্রিয়ার শোভা দেখছি
সকল কিছুতে বন্ধুর রূপ দেখছি।[۱۲]

حال ہی میں جاوید حسین نے مثنوی مولانا روم کو مع اردو حاشیہ کے شائع کیا ہے۔ یہ بھی بنگلا دیش کی اردو ترجمہ نگاری میں ان کے مرتبہ اور اہمیت کو کئی گنا بڑھا دیا۔ آخر کار اس بات کو اقرار کرنا چاہئے کہ جاوید حسین نے بنگلہ دیش کے اردو و فارسی ترجمہ نگاری کے میدان میں جگمگاتے ہوئے ستارہ ہے۔ اردو ترجمہ نگاری میں وہ اپنی خدمات اچھی طرح انجام دے رہے ہیں۔ انہوں نے ترجمہ نگاری میں اصلی مواد کو کبھی بھی راستے پھسلنے نہیں دیا بلکہ اردو میں جو موضوع جس طرح بیان ہوا ہے اسکو اسی طور پر سلیس اور آسان بنگلہ زبان میں ترجمہ کر کے پیش کیا۔ ان کا انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ سب نے اسے پسند کیا۔ اسی لئے بنگلہ دیش کے اردو و فارسی ترجمہ نگاری میں جاوید حسین کی خدمات پر بحث کرنا وقت کا تقاضہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید حسین، کالو شیمانا، پروتھما پروکاشن، ڈھاکہ، جنوری ۲۰۱۹ء، ص۔ ۲

۲۔ جاوید حسین، جان غالب، آتھئی پروکاشن، ڈھاکہ، فروری ۲۰۱۹ء، ص۔ ۲۶

۳۔ جاوید حسین، فیض احمد فیض کیتا، آتیز، ڈھاکہ، ۲۰۱۷ء، ص۔ ۴۱

۴۔ جاوید حسین، منصور حلاج ار کیتا، آتیز، ڈھاکہ، نومبر ۲۰۱۱ء، ص۔ ۴۸۔۵۲

۵۔ جاوید حسین، میر تقی میر: کیتا ہوتے، آتیز، ڈھاکہ، ۲۰۱۵ء، ص۔ ۵۷

۶۔ جاوید حسین، بدد وھو بھو میر اٹشب، آتیز، ڈھاکہ، ۲۰۱۹، ص۔ ۶۹۔۷۱

۷۔ ایضاً، ص۔ ۳۲

۸۔ جاوید حسین، اردو دروپادی کیتا، آتیز، ڈھاکہ، جولائی ۲۰۱۲ء، ص۔ ۶۸

۹۔ جاوید حسین، ذھین شاہ تاجی کی غزل، ایی پرکاش، ۲/فروری ۲۰۱۸ء، ص۔ ۸

۱۰۔ ایضا، ص۔ ۲۶

۱۱۔ جاوید حسین، سرمد شہید ار رباعیات، آتیز، ڈھاکہ، فروری ۲۰۱۹ء، ص۔ ۲۷۔۳۰

۱۲۔ جاوید حسین، حفیظ شیراز یر غزل، پروتھم آلو، ۱۶/ دسمبر ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۲

عالم اسلام میں اردو کی بازگشت

پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد*

اردو کی تاریخی اہمیت

اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں بہت کم سن ہے اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چار سو سال ہے جو کسی بھی زبان کی زندگی میں چار سو سال بہت تھوڑے ہی اس کا ہیولٰی ہندوستان میں تیار ہوا۔[1] اس مختصر سی زندگی میں اردو نے وہ کارہائے نمایاں کر دکھائے ہیں اور ترقی کی منزلیں جس تیزی سے طئے کی ہیں وہ ایک مثال ہے اور دنیا کی دوسری زبانوں کیلئے باعث رشک بھی۔

یہ زبان فوجی مستقروں میں، شاہوں کے درباروں میں اور درویشوں کی خانقاہوں میں بزرگوں کے سایہ عاطفت میں پلی بڑھی پروان چڑھی اور بہت جلد اس قابل ہوگئی کہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھیں لڑا سکے۔ اس کی ترویج وترقی میں ہندوؤں، مسلموں دونوں کا برابر کا ہاتھ ہے کیونکہ یہ ایک خالصاً ہندوستانی زبان ہے شروع میں ریختہ اور یہ زبان ہندوستانی کہلائی پھر اردو معلیٰ کے نام سے جانی جانے لگی۔ یہ زبان بڑی ہی سخت جان ہے کبھی مذہب اس کے آڑے آیا اور کبھی سیاست درپئے آزار بنی۔ لیکن اس کی ہر دلعزیزی ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتی ہی رہی۔

انگریز اس کی مقبولیت اور افادیت کو سمجھتے ہوئے اسے ۱۸۳۷ میں عدالتی زبان قرار دیدیا اور اس زبان نے فارسی کی جگہ لے لی جو صدیوں سے ہندوستان کی سرکار و دربار کی زبان کے طور پر استعمال ہوتی چلی آرہی تھی مگر اس کا دائرہ اثر امرا اور رؤسا تک ہی محدود رہا فارسی عوام کی زبان کبھی نہ بن سکی اسکے برعکس اردو بڑی سرعت سے عوامی زبان بن گئی اور دلوں پہ راج کرنے لگی۔ بقول رضا علی وحشت ۱۸۳۷ئمیں اردو ہندوستان کی عدالتی زبان بن گئی۔[2]

---

*شعبہ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

یوں تو مسلمان خصوصیت کے ساتھ ہندوستان، پاکستان کے مسلمان دنیا کے جس کسی حصہ میں جہاں بھی آباد ہیں وہاں اردو کسی نہ کسی صورت میں پڑھی لکھی اور بولی جاتی ہے۔ وہ مشرق بعید ہو کہ مشرق وسطی، وسط ایشیا یا افریقہ امریکہ اور یورپ ہر جگہ بے کم و کاست اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مگر عالم اسلام میں خاص طور سے اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً سعودی عرب میں اسے فوقیت حاصل ہے۔ سعودیہ میں اور بھی دوسری زبانیں رائج ہیں۔ مقامی اور بین الاقوامی ضروریات کے پیش نظر دوسری زبانیں سیکھی جاتی ہیں مگر اردو اپنے رسم الخط کی وجہ سے عالم اسلام میں قبول عام کا درجہ رکھتی ہے۔[۳]

بنگلہ دیش میں اردو

بنگلہ دیش میں اردو کا سورج کبھی نصف النہار پہ چمکتا تھا مگر اب یہاں اسے گہن لگ گیا ہے۔ ماضی قریب میں یہاں بڑے عظیم، قادر الکلام، اور قابل قدر شعرا وادبا پیدا ہوئے جن کے کارنامے اہل زبان شعرا وادبا پر بھی سبقت لے گئے۔ بنگال میں اردو کی ترویج اور اشاعت کے ساتھ ہی ساتھ سے اردو صحافت کا آغاز بھی اسی خطۂ بنگال کی سرزمین سے ہوا۔ سب سے پہلا اردو اخبار "جامِ جہاں نما" ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ کو کولہ تلہ، کلکتہ سے شائع ہوا[۴] یہیں سے سب سے پہلا اردو کا منثور ڈراما (نوابی دربار) لکھا اور اسٹیج کیا گیا۔ جس کے مصنف شیر بنگال کے خسر سید محمد آزاد تھے[۵]۔ مگر اب اردو کی حالت زار یہاں بڑی نہ گفتا بہ ہے۔ بنگلہ دیش میں فی الوقت دو یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے ڈھاکہ اور راجشاہی۔ مگر چونکہ بنیاد مستحکم اور مضبوط نہیں یعنی بنگلہ دیش میں ابتدائی سطح پر اردو کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں کی یونیورسٹیوں سے جو طلبا فارغ التحصیل ہوتے ہیں ان میں وہ صلاحیت اور استعداد پیدا نہیں ہوتی جو ہونی چاہئے تھی۔ عملی زندگی میں جب وہ طلبا قدم رکھتے ہیں تو انکی حاصل کی ہوئی وہ پونجی بھی ان سے چھن جاتی ہے۔ وہ سب قطعاً بھول جاتے ہیں جو انھوں نے یونیورسٹی میں پانچ سال رہ کر سیکھا ہوتا ہے۔ یہاں نہ تخلیقی ماحول ہے اور نہ لکھنے پڑھنے کیلئے حالات ہی سازگار ہیں۔ بقول پروفیسر عطر علی بنگلہ دیش میں اردو بولنے والے سر راہ اردو بولنے سے ڈرتے ہیں۔ مگر انفرادی طور پر کچھ کام ہو رہا ہے۔ سعادت حسن منٹو کے چیدہ چیدہ افسانے بنگلہ میں ترجمہ ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ نسیم حجازی کے اکثر ناول بنگلہ میں منتقل ہو چکے ہیں۔ اقبال اور غالب پہ بھی کچھ کام ہوا ہے مگر اس کا معیار زیادہ کچھ بہتر نہیں۔ بنگلہ دیش میں اردو کی تشہیر اور ترویج بس اس حد تک ہے کہ اردو ہندوستانی ذرائع ابلاغ کی مرہون منت ہے۔ یہاں ہندوستانی فلمیں دیکھی اور فلمی نغمے بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے ہیں مگر ان پر بھی ہندی کا لیول چسپاں ہے۔ خصوصاً وہ کلام، اشعار اور مکالمے جو

خالصتاً اردو ہوتے ہیں۔ عام لوگ انھیں بھی اردو کی بجائے ہندی ہی کا نام دیتے ہیں۔ مشہور فلمی شخصیت گلزار نے جو بہت بڑے شاعر، ناول نگار اور فلم پروڈیوسر ہیں ایک سیمینار میں کہا کہ ہندوستانی فلموں میں ستر سے اسی فیصد الفاظ اردو کے استعمال ہوتے ہیں[6]۔ پرانے ڈھاکہ کے کچھ گھروں میں آج بھی اردو مادری زبان کے طور پہ بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ ڈھاکہ کے مقامی باشندے جنھیں ڈھاکیہ کٹی کہا جاتا ہے انکی بھی مادری زبان اردو ہی ہے مگر یہ مسخ شدہ زبان ہے یعنی اردو کی بگڑی ہوئی شکل جو تحریر میں نہیں لا جاتی۔

ہندوستان، پاکستان بنگلہ دیش کی سرحدوں سے باہر اگر ہم دوسرے اسلامی ممالک کی بات کریں تو افغانستان، ایران ازبکستان ترکی میں یہ زبان بولنے کی حد تک مروج ہے۔ سارے مشرق وسطیٰ میں یہ زبان رابطہ کی زبان بن چکی ہے۔ مشرق بعید مثلاً ملیشیا، جاپان کوریا چین جہاں کہیں ہندوستانی بنگلہ دیشی اور پاکستان یکجا ہوتے ہیں اردو ہی انکی گفتگو کا وسیلہ ہوتی ہے۔[7]

ہندوستان میں اردو تھی اور رہے گی کیونکہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں چولی اور دامن کا ساتھ انھیں ایک کو دوسری سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بقول گوپی چند نارنگ اردو کے بغیر ہندی اور ہندی کے بغیر اردو زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہندوستان کے پہلے آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک بار کہا تھا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں دل کی دھڑکنیں بستی ہیں۔ کوئی بھی ملک اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا پاکستان بھی نہیں یہ ایک ہندوستانی زبان ہے اس کی زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔[8] اردو کا واقف کار ہندوستان میں شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جہاں بھی جائے اردو کے سہارے بلا کسی تردد اپنا مافی الضمیر ظاہر کر سکتا ہے۔ ہندوستان میں اردو کو سات صوبوں سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے جس میں کشمیر، پنجاب، یوپی، بہار، تلنگانا اور جھاڑکھنڈ کے صوبے شامل ہیں۔ کشمیر میں اردو مادری زبان کے طور پر گھر گھر استعمال ہوتی ہے۔ یہی حال حیدر آباد، میسور اور کریم نگر کا ہے۔ یوپی تو اردو کا گھر ہی شمار ہوتا ہے۔

ایس پی شرما اپنی کتاب دی پریس سوشیو پولیٹکل اویکننگ میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۵۵ء میں متحدہ صوبہ اور مغربی صوبہ سے ۱۲۴ اردو اخبارات نکلتے تھے جبکہ ہندی کے صرف تین۔ اردو کے حاسدوں نے اسکی مقبولیت سے خوف زدہ ہو کر اسے حملہ آوروں یعنی مسلمانوں کی زبان کا نام دیدیا۔ انگریزوں کی بھی رضا اس نئی دریافت میں شامل تھی بلکہ انگریزوں ہی کے ایما پر ہندی کو ہندوؤں کی مورثی اور مذہبی زبان اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کا نام دیا گیا۔ اردو ہندی کا جو فساد کھڑا ہوا وہ بھی انگریزوں کی منشا پر۔ ان کا مقصد اس زبان کی روز افزوں ترقی کی راہیں مسدود و محدود کرنا تھا۔ فرقہ پرست ہندو ادیبوں اور شاعروں نے اس عوامی زبان سے چن چن کر عربی اور فارسی کے الفاظ کو نکالنا

شروع کر دیا جو اس زبان کی زینت تھے۔ ہندی اور اردو کے مخاصمہ نے اتنا طول پکڑا کہ اس نے فرقہ واریت کا رنگ اختیار کر لیا۔[۹]

ہندو اور مسلمان صدیوں سے ساتھ ساتھ رہتے چلے آرہے تھے محض زبان اور ثقافت کے مسلہ پہ بٹ گئے اور یہی وہ اسباب تھے جو آگے چل کر تقسیم ملک کا سبب بنے۔ اردو کی ترویج اور ترقی میں دونوں ہی فریقوں کا ہاتھ ہے مسلمانوں کی طرح ہندو بھی اردو کی ترویج اور ترقی میں پیش پیش تھے اور دونوں ہی نے ملکر ملک کی آزادی کی جنگ لڑی۔ رام پرشاد بسمل کو کون نہیں جانتا انکی مشہور غزل جس کا مقطع ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب تو ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے کتنا زور بازوئے قاتل میں ہے۔

یہ نظم اتنی مقبول ہوئی کہ آزادی کے متوالوں کیلئے آزادی کا نعرہ بن گئی۔ اردو پریس نیوہ ہنگامہ کھڑا کیا کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہو گئے اسوقت نکلنے والے اردو روزناموں ہفت وار اخباروں نے انگریزوں کا ناطقہ بند کر دیا اور اس طرح کہ انکے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مولانا آزاد، اکرم علی خان، علی برادران جیسے صحافیوں نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ چکبست لکھنوی، سرور جہاں آبادی نے ایسی دلگداز نظمیں لکھیں مثلاً خاک وطن اور مادر وطن جس میں دیش بھگتی کا لاوا بھر دیا جسے پڑھ کر آزادی کے متوالوں کا خون گرم ہو جاتا تھا۔ انکے علاوہ اردو کے دوسرے ہندو ادیبوں نے وہ ادب پارے پیش کئے کہ انکے قلم سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ شاہکار ہے۔

منشی پریم چند نے ایسے افسانے لکھے جو دنیا کی دوسری زبانوں کے لیئے ایک مثال ہیں اسی طرح کنہیا لال کپور، راجندر سنگھ بیدی اور راجندر کرشن نے اپنی نثر و نظم میں ایسے گل کھلائے ہیں کہ اردو ادب کو گلِ گلزار بنا دیا۔ گیان چند اور گوپی چند نارنگ نیا ایسے ایسے نثری جواہر پارے پیش کیئے ہیں جنھیں دنیا کی دوسری زبانوں کے سامنے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ گلزار، آنند بخشی، شیلیندر اور کرشن چند نے ہندوستانی فلموں کے ناظرین و سامعین کو اپنے نغموں اور گیتوں سے وہ سرور بخشا کہ دل جھوم اٹھے اور آنکھیں مخمور ہو گئیں۔

گلزار نے کلکتہ کی ایک ادبی نشست میں فرمایا کہ ہندوستان میں بننے والی فلموں میں ستر سے اسی فیصد الفاظ اردو کے ہوتے ہیں[۱۰]۔ بقول مشہور محقق اور نقاد گوپی چند نارنگ اردو کے بغیر ہندی اور ہندی کے اردو زندہ نہیں رہ سکتی ان دونوں زبانوں کا چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔ راجشاہی یونیورسٹی کے انگریزی کے پروفیسر عطر علی اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان ہے بنگلہ دیش میں اردو خطرہ میں ہے لکھتے ہیں اسلامی لیٹریچر جاننے کیلئے اردو زبان کی بڑی اہمیت ہے۔ اردو کے بغیر عربی زبان کی روح تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ آگے چل کر وہ سید سجاد حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں

سجاد صاحب کو اردو سے واقفیت نہ ہونے کا بڑا ملال تھا۔[11]

بنگالی مسلمانوں کو اردو سے اس لئے محبت تھی کہ وہ اسے مسلمانوں کی لسانی اور ثقافتی زبان سمجھتے تھے۔ خالد بنگالی جنکا تعلق کشور گنج کے ایک دور افتادہ گاؤں بولائی سے تھا، ایک پرچہ "اختر" کے نام سے نکالا تھا جس کا صرف ایک ہی شمارہ منظر عام پہ آسکا یہ قیام پاکستان سے بہت پہلے کی بات ہے۔ عبدل القادر جنکا تعلق میمن سنگھ سے تھا ۱۹۵۲ میں ایک جریدہ "دلربا" کے نام سے نکالتے تھے جس میں انھوں نے شادانی اور بابائے اردو مولوی عبدل الحق کو بھی نہیں بخشا۔ انھوں نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا کہ یہ لوگ جو خود کو اردو والے کہتے ہیں خود اردو کے دشمن ہیں۔ ان لوگو ں نے اسے مسلمانوں کی زبان کہہ کر اس کی اس کی ترقی کی راہیں مسدود کر دیں۔ عبدلالقادر کو اردو سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اپنی جواں سال مرحومہ اہلیہ جنکا نام دلربا تھا انھیں کے نام پہ اس پرچہ کا نام رکھا۔ صرف یہی نہیں اہلیہ کی قبر پہ جو تعویز انھوں نے نصب کرایا وہ بنگلہ کی بجائے اردو میں تھا۔ یہ قبر آج بھی میمن سنگھ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

عبدلالغفور جو غالب کے ہمعصر تھے نثر اور نظم دونوں ہی اصناف میں وحید آفاق تھے مرزا غالب نے بھی انکی بے مثال اردو نوازی سے متاثر ہو کر انھیں ایک توصیفی خط لکھا جو خطوط غالب میں شامل ہے[12]۔ شیر بنگال کی بیٹی حسن آرا بیگم عرف رئیسی بیگم بہترین مقرر اور ناول نگار تھیں اور شیر بنگال کے خسر سید محمد آزاد جنھوں نے اردو کا پہلا منشور ڈراما نوابی دربار لکھا جسے امام گنج ڈھاکہ میں اسیجر بھی کیا گیا۔ ان سب کا تعلق بنگال سے ہی تھا۔ حکیم حبیب الرحمٰن ۱۹۰۶ میں المشرق کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار چوڑی ہٹا، ڈھاکہ سے نکالا جس نے تقسیم بنگال کی حمایت میں اس پرچہ کو ہتھیار بنایا اور صحافتی جنگ لڑی۔ پروفیسر عطر علی کے بقول بنگلہ دیش میں اردو کی مخالفت لسانی نہیں، سیاسی تھی۔ موصوف اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں بنگالی مسلمانوں کو اردو سے حد درجہ عقیدت و محبت تھی مگر وہ مادری زبان کے طور پر اس لئے اردو کو نہ اپنا سکے کہ بیرونی دنیا سے ان کا رابطہ کم تھا اور وہ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔

اردو دنیا کی واحد زبان ہے جسے غیر زبان دانوں نے نہ صرف مادری زبان کی طرح اپنایا بلکہ وہ اس زبان کے بہتر شاعر اور نثار ثابت ہوئے۔ مثال کے طور اقبال جنکے آبا کا تعلق کشمیری برہمنوں کے خانوادہ سے تھا، غالب کے بعد انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ دوسرے بڑے شاعر فیض احمد فیض ہیں جنھیں نوبل انعام کے لئے نا مزد کیا گیا تھا پنجابی تھے۔ حفیظ جالندھری جنھوں نے پاکستان کا قومی ترانا لکھا انکے علاوہ ساحر لدھیانوی مشہور شاعر، راجندر سنگھ بیدی افسانہ نگار، منٹو افسانہ نگار، آنند بخشی گیت کار اور راجندر کرشن شاعر اور افسانہ نگار گلزار

مشہور گیت کار، ناول نگار فلم ساز سب ہی کا تعلق پنجاب سے ہے۔

کشمیریوں کے یہاں تو اردو مادری زبان کے طور پر گھر گھر بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے کشمیر سے روزانہ، ہفتہ وار، ماہوار تقریباً ۱۸۰ اردو اخبارات نکلتے ہیں۔[۱۳] بنابریں اردو کو ہندوستان کے سات صوبوں میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے ا۔ کشمیر، ۲۔ تلنگانا، ۳۔ جھاڑکھنڈ، ۴۔ یوپی، ۵۔ بہار، ۶۔ دہلی، ۷۔ پنجاب۔

جنوبی ہندوستان کے مسلم گھرانوں میں یہ زبان مادری زبان کی طرح بولی جاتی ہے اس کے علاوہ میسور سرنگاپٹنم وغیرہ میں بھی اس زبان کی بڑی قدر واہمیت ہے۔ اردو کشمیر سے کنیا کماری تک بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف مسلم ہی نہیں اہل ہنود بھی اس زبان سے بڑا شغف رکھتے ہیں آج بھی انکے ادبی کارناموں سے اردو کا چمن سرسبز وشاداب ہے۔

یوں تو مسلمان خصوصاً ہندوستان پاکستان کے مسلمان جہاں کہیں آباد ہیں اردو کسی نہ کسی صورت میں وہاں پڑھی لکھی اور بولی جاتی ہے۔ وہ مشرق بعید ہو، مشرق وسطیٰ یا وسط ایشیا افریقہ یورپ اور امریکہ بے کم وکاست ہر جگہ اردو کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ عالم اسلام میں اسے خصوصی فوقیت حاصل ہے۔ خصوصیت کے ساتھ سعودیعرب میں۔ سعودیہ میں ملکی ضروریات کے پیش نظر اور بھی دوسری زبانیں پڑھائی جاتی ہیں مگر اردو کو اس کے رسم الخط کی وجہ سے اسے دوسری زبانوں کے مقابلہ زیادہ فوقیت حاصل ہے۔

سعودی عرب

سعودی عرب میں عربی کے بعد انگریزی کو بین الاقوامی زبان ہونے کی وجہ سے ثانوی درجہ حاصل ہے۔ اردو تیسرے نمبر پہ آتی ہے۔ سعودیہ کے شہروں بازاروں، گلی کوچوں میں اردو کی بازگشت سنائی دیتی ہے ہوٹلوں، ریستورانوں اور دوکانوں پر نام کی تختیوں پر اردو ہی لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں پاکستانی اسکولوں، کالجوں میں جو جدہ ریاض اور طائف میں واقع ہیں یہ درس گاہیں پاکستانی سفارت خانہ کی طرف سے قائم ہیں۔ ان درس گاہوں میں تقریباً آٹھ ہزار طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں اور ان میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ دوسرا بڑا کالج انٹرنیشنل اسکول اور کالج ہے جو ریاض میں واقع ہے اس میں تقریباً پانچ ہزار طلبہ وطالبات علم کی دولت سے مالا مال ہو رہے ہیں یہ درس گاہ ۱۹۶۸ میں قائم ہوئی۔ تیسرے نمبر پہ پاکستان کمونیٹی اسکول وکالج الخبر ہے اس میں تقریباً تین ہزار طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ یہاں ذریعہ تعلیم بھی اردو ہی ہے۔ طائف اسکول وکالج بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے یہاں تقریباً

ڈیڑھ ہزار بچے پڑھتے ہیں۔

خلیج کے سات ممالک کے ماہرین تعلیم کی ایک شاندار کانفرنس ۱۱ نومبر ۱۹۸۶ ریاض میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں جامعات کے ماہرین نے اپنے خیالات و تجربات سے کانفرنس کو مطلع کیا۔ محامد صلاح الدین نے اردو کی اہمیت وسعت پر جو نکات پیش کئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اردو تقریباً دنیا کے ہر ملک میں بولی جاتی ہے۔ اس کے لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد اسی کروڑ سے زیادہ ہے۔

۲۔ اردو، عالم اسلام میں بولی جانے والی زبانوں میں سب سے بڑی اور یونیسکو کے اعداد و شمار کے مطابق چینی اور انگریزی کے بعد تیسری بڑی زبان ہے۔

۳۔ اسلامی لٹریچر کے اعتبار سے اردو زبان عربی کے بعد دوسری بڑی زبان ہے جس میں تفسیر، فقہ، حدیث، سیرت، تاریخ اور جدید علوم میں وسیع کام ہوا ہے عربی کا اہم لیٹریچر اردو زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے اور ایک سو سے زیادہ اصل تفسیریں موجود ہیں۔

۴۔ اردو ہندوستان پاکستان کے علاوہ بنگلہ دیش برما نیپال میں تقریباً تمام دینی مدارس میں ذریعہ تعلیم ہے۔ یونیورسٹی کی سطح پر پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کشمیر (دونوں) اور حیدر آباد جامعہ عثمانیہ میں ذریعہ تعلیم ہے ہندوستان کے دینی مدارس، دارالعلوم دیوبند، ندوہ اور المعاصر اعظم گڑھ کی دینی درس گاہوں میں بھی اردو ہی ذریعہ تعلیم ہے۔

۵۔ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس وقت اردو کے بائس شعبے موجود ہیں جن میں ایران، جاپان، چین۔ کوریا، برطانیہ، جرمنی، امریکہ اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔

۶۔ تمام خلیجی ریاستوں میں عربی کے بعد اردو دوسری بڑی زبان ہے جو ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

۷۔ سائنسی، فنی اور اقتصادی علوم سے اردو لیٹریچر بھرا پڑا ہے اور بہت سے ممالک میں ترجمہ کا کام جاری ہے

۸۔ کویت اور متحدہ عرب امارات میں اردو بولنے والے اتنے باشندے مقیم ہیں کہ وہاں اس زبان میں اخبارات و رسائل شائع کئے جاتے ہیں۔ یہاں بہت سی جامعات میں اردو کے شعبے قائم ہیں۔[۱۴]

سعودی عرب سے ایک روزنامہ "اردو نیوز" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ ایک مکمل اخبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی اشاعت اب ستر ہزار سے تجاوز کر گئی ہے۔ علاوہ ازیں سعودی عرب کیا نگریزی اخبار کے ادبی صفحات پر اردو زبان کے شعرا اور ادبا کی تخلیقات کے تراجم بھی اردو زبان کے فروغ اور آگہی کا باعث ہیں۔ اردو کے حوالے

سے سعودی عرب سے وقتاً فوقتاً کتابیں اور رسالے بھی شائع ہوتے ہیں ابھی حال ہی میں ایک کتاب "مشرقِ وسطیٰ میں اردو" شائع ہوئی ہے۔ اگست ۱۹۸۳ میں جب جدہ سے اردو اخبار "المدینہ" حاجیوں کی معلومات، دلچسپی اور سہولت کے لئے شائع کیا گیا تو اس کی اشاعت چالیس ہزار تھی اب ساٹھ ہزار سے تجاوز کر گئی ہے یہ روزنامہ ہر سال حج کے موقع پر شائع ہوتا ہے۔[۱۵]

اردو کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اب سعودی وزارت حج اور اوقاف نے بڑے شہروں کی مخصوص مساجد میں عشاء کے بعد اردو میں تقریر کرنے کی اجازت دیدی ہے یہاں بعد نماز عشاء علمائیدین کسی نہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں ان موقعوں پر مائک استعمال کرنے کی بھی اجازت ہوتی ہے۔ سعودی تیلیویزن پر اکثر اوقات اردو پروگرام نشر کئے جاتے ہیں جہاں تک اردو بولنے اور سمجھنے کا تعلق ہے اس میں دیگر اقوام کے لوگ بھی شامل ہیں جو کسی حد تک اردو بول اور سمجھ لیتے ہیں مثلاً مصری، کویتی، اور سوڈانی وغیرہ۔ اسکے علاوہ سعودی شہری جو ہندوستان اور پاکستان میں بغرض حصول تعلیم رہ چکے ہوتے ہیں یا جن شہریوں نے ہندوستان اور پاکستان کی لڑکیوں سے شادی کی ہوئی ہے وہ اچھی خاصی اردو جانتے ہیں اور روانی سے اردو بول سکتے ہیں۔[۱۶]

متحدہ عرب امارات میں اردو

ابوظہبی، دوبئ، عمان، شارجہ، ام القوین راس الخیمہ اور الفجرہ کی ریاستوں پہ مبنی جو متحدہ عرب امارات ہیں ان خلیجی ممالک میں اردو بطور زبان سرفہرست ہے۔ جہاں تک دوسری ایشائی زبانوں کے بولے اور سمجھے جانے کا تعلق ہے اردو یہاں رابطہ کی سب سے اہم زبان بن چکی ہے۔ انتظامی امور اور دوسری ضروریات کیلئے یہ زبان پاکستانی افسران اور ماتحتوں کے درمیان اردو بطور رابطہ کی زبان استعمال ہوتی ہے۔ اسکے علاوہ بھارتی، بنگلہ دیشی، ایرانی، صومالی اور عمانی کارکن بھی اردو بولنے اور سمجھنے لگے ہیں سارے متحدہ عرب امارات میں بالعموم شارجہ، عمان اور دوبئ میں بالخصوص مقامی آبادی بھی اردو کو رابطہ کی زبان کے طور پر اپنا لیا ہے۔ یہیں مقیم ۱۴ لاکھ افراد میں سے ۱۰ لاکھ اردو کو رابطہ کی زبان کے طور پر اپنا چکے ہیں عام لوگوں کے علاوہ حکمراں طبقہ میں بھی اردو کو مقبولیت حاصل ہے مثال کے طور پر ابوظہبی کے ولی عہد شارجہ اور عمان کے حاکموں کے علاوہ متعدد شیوخ اور مقتدر شخصیات روانی کے ساتھ اردو بولتے ہیں۔[۱۷]

متحدہ عرب امارات سے ابتک کوئی اردو اخبار شائع نہیں ہوتا اس کی وجہ ملکی قانون ہیں پاکستان اور ہندوستان سے آنے والیاخبارات ورسائل ہر جگہ دسیاب ہیں پاکستان کے بڑے اخبارات کی مجموعی کاپیاں جوروز انہ یہاں فروخت ہوتی ہیں انکی تعداد بیس ہزار ہے اس کے علاوہ سات روز نامیتر ہفت روزے، دس ماہنامے اور متعدد ادبی جرائد باقاعدگی سے فروخت ہوتے ہیں۔

ابوظہبی، دوبئی، قطر اور عمان کی ٹی وی نشریات میں ہفتہ وار اردو فلمیں دکھائی جاتی ہیں شارجہ ٹی وی نے دو گھنٹے کی اردو نشریات کا پروگرام بھی شروع کیا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے تعلیمی اداروں کی تعداد جن کے انتظام اور انصرام میں پاکستانی سفارت خانہ شامل ہے، انکی تعداد سات ہے۔ ان اسکولوں میں تین اردو میڈیم اور چار انگریزی میڈئم ہیں یہاں بھی اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ ان اسکولوں کے طلبہ اور طالبات کی تعداد آٹھ ہزار ہے اس کے علاوہ متعدد نجی ادارے ہیں جہاں اردو پڑھائی جاتی ہے [18]

قطر میں اردو:

قطر میں غیر سرکاری زبان کے طور پر اردو سرفہرست ہے یہاں کی بھی قومی زبان عربی ہے دوسرے درجہ پہ انگریزی اور اردو کا نمبر تیسرا ہے۔ دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اردو سب سے زیادہ استعمال ہونے والی زبان ہے۔ ۱۹۶۵ میں پہلا نجی ادارہ "پاک شمع" اسکول قائم ہوا ابتداً اس ادارہ میں اردو ایک مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ اب اس نے ایک اسکول کی صورت اختیار کر لی ہے جس میں طلبہ کی تعداد ڈھائی ہزار ہے اس کے علاوہ اس ادارہ میں انگریزی سیکشن بھی ہے جس میں ڈیڑھ ہزار طلبہ پڑھتے ہیں مگر وہاں بھی اردو ایک مضمون کے طور پر شامل نصاب ہے۔ قطر میں ایم ای ایس ایک اینڈین اسکول بھی ہے جہاں اردو اختیاری مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ قطر میں اردو بولنے والوں کی تعداد دو لاکھ سے زائد ہے جو کل آبادی کا تقریباً نصف حصہ ہے اپریل ۱۹۷۹ میں "بزم اردو" ادارہ کا قیام عمل میں آیا جس کے تحت اکثر مشاعرہ، مناظرہ اور مباحثوں کا انعقاد ہوتا رہتا ہیاس ادرہ نے ریڈیو قطر سے اردو سروس کے اجرا کا بھی بندوبست کیا ہے یہاں سے دو گھنٹے کا اردو پروگرام نشر ہوتا ہے اس ادرہ کے تحت یہاں سے کئی مجلّے بھی شائع ہو رہے ہیں۔ قطر کے مختلف شہروں میں مختلف ادارے اردو کی توسیع و ترقی کیلئے کام کر رہے ہیں قطر میں مشاعرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں اردو کی توسیع کا یہ بھی ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

بحرین میں اردو:

بحرین خلیجی ریاستوں میں سب سے چھوٹی ریاست ہے۔ یہاں عربی انگریزی کے بعد غیر سرکاری طور پر استعمال ہونے والی تیسری سب سے بڑی زبان اردو ہے[19]۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں پاکستانی، بنگلہ دیشی اور سری لنکائی باشندوں کی تعداد یہاں بہت زیادہ ہے یہ آپس میں اردو ہی بولتے ہیں بحرین میں بزم سخن کے علاوہ ایک اور تنظیم الثقافہ بھی اردو کی ترویج اور ترقی کیلئے کام کر رہی ہے۔

کویت میں اردو

خلیجی ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست کویت ہے یہاں بھی عربی اور انگریزی کے بعد اردو ہی کو تیسری بڑی زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیشی اور سری لنکائی باشندوں کی ایک کثیر آبادی یہاں مقیم ہے جنکے درمیان رابطہ کی زبان صرف اردو ہے۔ افغانی، ایرانی باشندے بھی بخوبی اردو سمجھ اور بول لیتے ہیں جنوب مشرقی ایشیائی تقریباً ایک لاکھ کی آبادی کویت میں مقیم ہے یہاں غالب اکثریت میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ سکھ اور ہندوؤں کی غالب اکثریت بھی اردو سے واقف ہے۔ کویت میں ان دنوں جن اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے ان میں درج ذیل اسکول شامل ہیں۔

۱۔ پاکستان اسکول کالج (بمقام سالمیہ)

۲۔ پاکستان اسکول کالج (فحامیل)

۳۔ ماڈرن پاکستان اسکول کالج (جلیب الشیوخ جساوی)

۴۔ رشدان اسکول کالج (فروانیہ)

۵۔ شعب اسکول کالج (خیطان جدید)

۶۔ پاکستان انٹرنیشنل اسکول و کالج (شارع استقلال)

ان تمام درس گاہوں کا الحاق اسلام آباد کے فیڈرل بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کے ساتھ ہے۔

مشرق وسطیٰ میں مقامی اور غیر مقامی باشندوں کیلئے ذہنی تفریح کا ایک ذریعہ پاکستان اور ہندوستان کی فلمیں ہیں جو بڑے ذوق وشوق سے دیکھی جاتی ہی جاتی ہیں۔ فلموں کے علاوہ وہ ڈرامے اور سیریئل ہیں جو مقامی ٹی وی پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور بے حد پسند کئے جاتے ہیں چونکہ ان فلموں اور سیریلوں کی زبان مخلوط زبان ہوتی ہے اور ان

میں عربی اور فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اسلئے ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، سریلنکا، افغانستان وایران سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی مقامی عوام بھی ان فلموں سے بڑی حد تک محظوظ ہوتے ہیں۔ ہندی اور سنسکرت الفاظ سے مقامی لوگ نا آشنا سہی مگر مکالموں یا نغموں کا مطلب اخذ کرنے میں انھیں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

کویت میں بہت ساری انتظیمیں اور انجمنیں قائم ہیں جنکے تحت اکثر مشاعرے اور مناظرے منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ بزم سخن، بزم یاران ادب۔ کوکن لیٹریری سوسائیٹی وغیرہ۔ کوکن لیٹریری سوسائیٹی کے صدر محمد صالح بروڈ ہیں۔ اس سوسائیٹی کی روح نور پرکار ہیں یہ کوکنی ہیں۔ مراٹھی اور اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی ہیں کویت میں اردو کی ترویج اور ترقی میں کوکن لیٹریری سوسائیٹی نے بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ بزم حق نیمبھی جس کے سربراہ رب نواز بٹ ہیں جو کویت میں نعتیہ مشاعرے اور کانفرنسیں منعقد کراتے رہتے ہیں۔ پاکستان کے مشہور نعت خواں خورشید احمد، عبدالمجید بٹ اور دوسرے کئی نعت خواں حضرات اپنی خوبصورت آواز میں اپنے فن کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔

پاکستان آرٹس کونسل نے بھی اردو زبان کی ترویج واشاعت میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس سلسلہ میں سنٹرل ایڈ کمیٹی بھی اپنا منفرد مقام رکھتی ہے۔ یہ انجمن سماجی کاموں کے ساتھ ساتھ اردو کی خدمت میں بھی پیش پیش ہے۔ کویت میں اردو کی مقبولیت اس درجہ جا پہنچی ہے کہ ایک عرب نژاد عربی زبان کے ادیب سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا عربی ترجمہ کر کے شائع بھی کرا چکے ہیں۔ جن کا شمار عربی ترجمہ شدہ معروف کتابوں میں ہوتا ہے۔[۲۰]

یہاں پاکستان ٹیلیوزن اور اسٹیج ڈرامے جو کیسٹوں میں دستیاب ہوتے ہیں بڑے ذوق شوق سے دیکھے جاتے ہیں۔ پاکستان کے تمام اخبارات اور رسائل یہاں بکثرت ملتے ہیں۔

تاجر طبقہ بھی اردو کی خدمت اس طرح کرتا ہے کہ اردو زبان میں شائع ہونے والے پرچوں میں بڑے بڑے اشتہارات دیتے ہیں اس طرح ان پرچوں کی مالی معاونت بھی ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبال کی نظمیں "شکوہ جواب شکوہ" کا عربی ترجمہ سب سے پہلے دنیائے عرب کی لاثانی مغنیہ ہام کلثوم نے اپنی بے نظیر موسیقی اور خوبصورت آواز میں کویت کی سرزمین سے فضا میں بکھیر چکی ہیں۔

ترکی میں اردو

اس وقت ترکی میں تین یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جارہی ہے۔ انقرہ یونیورسٹی، سلجوق یونیورسٹی قونیہ اور استنبول یو

نیورسٹی۔ استنبول یونیورسٹی میں بقول "اخوت" (ایک پرچہ جو استنبول یونیورسٹی سے نکلتا ہے)[۲۱] ترکی میں اردو ۱۹۱۵ سے پڑھائی جارہی ہے لیکن باقاعدہ طور پر انقرہ یونیورسٹی میں اردو کی تدریس کا آغاز ۱۹۵۶ سے ہوا۔ شروع میں اس شعبہ کا نام، شعبہ 'اردو تھا۔ پھر اسے شعبۂ زبان وتحقیق پاکستان کا نام دیا گیا۔ شعبۂ اردو کی لائبریری میں اردو کتابوں کی تعداد پانچ ہزار ہے انقرہ یونیورسٹی کے بعد سلجوق یونیورسٹی قونیہ کا شعبہ اردو ایک ترقی یافتہ شعبہ ہے۔ یہ آج سے آٹھ سال پیشتر قائم ہوا۔ اس کے قیام و دوام کا سہرا پروفیسر ڈاکٹر ایرکن کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ استنبول یونیورسٹی میں ۱۹۸۵ سے اردو کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے متعارف کرانے کا سہرا ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کے سر ہے۔ آج سے کوئی دو سال پہلے استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کر دیا گیا اور بہت سارے طلبا نے داخلہ بھی لے لیا ہے۔ ترکی میں اردو کی ترقی میں سجاد حیدر یلدرم کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ سجاد حیدر نے ترکی فکشن کو اردو میں متعارف کرایا۔ وہ کافی عرصہ تک ترکی میں قیام پذیر رہے اور ترکی زبان سیکھی بہت سارے ترکی ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا۔

ترکی میں اردو صحافت کا جہاں تک تعلق ہیڈ پٹی نذیر احمد کے بھتیجوں عبدالستار خیری اور عبدالجبار خیری کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان بھائیوں نے "اخوت" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کے ۹۸ شمارے شائع ہو ئیا یک اور رسالہ "پاکستان پوستاسی" پانچویں دہائی سے ترکی میں شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۶ میں ایک کتاب "پاکستان زبان ادبیات" ترکی میں شائع ہوئی۔ اس میں پاکستان کے قومی ترانے کا منظوم ترجمہ سب سے پہلی بار شائع ہوا اس میں اردو کی پیدائش اور ترکی زبان سے اس کے تعلق کے بارے میں بڑی تفصیل سیلکھا گیا ہے اس کتاب کے اہم عنوانات ہیں امیر خسرو دہلوی، بابر شاہ قطب شاہی اور عادل شاہی دور شاہ عبداللطیف بھٹائی، غالب، حالی، اقبال، نذرالاسلام اور ڈاکٹر محمد صابر اور حفیظ جالندھری وغیرہ شامل ہیں۔

ترکی میں اقبال پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ انکی شاعری انکے افکار و خیالات کا ایک بڑا حصہ، انکی کتابوں سے انتخاب وغیرہ ترکی ادب کا حصہ بن چکے ہیں۔ ۱۹۷۴ میں ایک کتاب اقبال پر شائع ہوئی اس میں شامل ترجموں میں اسرار خودی، بانگ درا، بال جبریل، ضرب کلیم، رموز بے خودی، پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ، پس چہ باید کرد، مسافر اور ارمغان حجاز کے بعض اہم حصے شامل ہیں۔[۲۲]

مصر میں اردو

مصر میں اردو بیسویں صدی کے اوائل ہی میں داخل ہوئی ابتداً اردو یہاں ان لوگوں میں بولی جاتی تھی جو تلاش معاش کے سلسلہ میں ہندوستان سے یہاں آئے پھر اردو نے آہستہ آہستہ مصر میں اپنے قدم جمانے شروع کر

دئے۔۱۹۳۰ میں مصر سے اردو اخبار نکلنا شروع ہوا۔ڈاکٹر امجد حسن سید احمد اپنے مقالہ "مصر میں اردو" میں لکھتے ہیں کہ "جہان اسلام" کے کچھ شمارے میرے پاس محفوظ ہیں یہ اخبار جسے ابوسعید عربی نے نکالا تھا وہ گجرات کے رہنے والے تھے۔چونکہ اس اخبار کی ہندوستان میں بڑی کھپت تھی اور انگریز حکومت کے خلاف لکھتا تھا اسلئے اس اخبار کا داخلہ ہندوستان میں ممنوع قرار دے دیا۔مجبوراً اسے بند ہو جانا پڑا۔مگر اس کی جگہ دوسرا اخبار "وحید اخبار" جو ہفتہ وار تھا، شائع ہوا۔اس اخبار کی اشاعت کا مقصد تھا ہندوستانی مسلمانوں کو عالم اسلام سے روشناس کرانا تھا۔ اس کے اخبار کے اڈیٹر محمد احمد عرفی تھے۔اس اخبار کا پہلا شمارہ ۱۱ مئی ۱۹۳۰ کو شائع ہوا۔عرفی اردو سے بے پنا ہ محبت کرتے تھے۔اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "اگر اسلامی دنیا کی کوششیں بار آور ہوئیں تو انشاءاللہ وہ وقت بھی آجا ئے گا کہ جہاں قاہرہ میں فرانسیسی، انگریزی، یونانی، اور اطالوی زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں اردو زبان بھی اپنا اثر پیدا کر سکے گی۔"

اردو زبان ایک اسلامی، ادبی، علمی اور ثقافتی زبان کی حیثیت سے ۷ مارچ ۱۹۳۹ کو اردو زبان ایک شاہی فرمان کے ذریعہ قاہرہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کر لی گئی ۲۳ اور پروفیسر حسن الاعظمی کو اردو کی تدریس کیلئے استاد مقرر کیا گیا۔انکے بعد مولانا ابوالحسنات نے اردو تدریس کی ذمہ داری سنبھالی جنکا تعلق بنگال سے تھا۔قاہرہ یونیورسٹی کے علاوہ ۱۹۶۰ میں قاہرہ کے ایک قدیم معہد الانس لیگوا یج انسٹیٹیوٹ میں اردو کو شامل نصاب کیا گیا۔جامعہ ازہر کی اصول الدین فیکلٹی میں ۱۹۴۸ میں اردو کو نصاب میں شامل کیا گیا۔۱۹۷۹ میں جامعہ ازہر میں اردو کی تدریس کا ایک نیا دور شروع ہوا۔یہ شعبہ نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔طلبا اس شعبہ سے بی اے ایم ایا ور پھر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر سکیں گے۔اس وقت شعبہ میں مختلف ملکوں کے ۵۴ طلبا اردو پڑھ رہے ہیں۔قاہرہ کی نسبتاً کم معروف یونیورسٹی عین شمس میں اردو کی تدریس کا مسلہ کئی مراحل سے گزرا آخر مصر یونیورسٹی کی کونسل نے اردو زبان کو عین شمس یونیورسٹی میں مشرقی زبان کے شعبہ میں شامل نصاب کرنے کی اجازت دے دی۔فی الوقت اس زبان کے سال اول اور دوم میں پندرہ بیس لڑکے زیر تعلیم ہیں۔

۱۹۵۲ کے انقلاب کے بعد مصری حکومت نے اردو کی اہمیت کو سمجھا چنانچہ ۱۹۵۳ میں جمہوریہ مصر کی نشرگاہ سے اردو پروگرام شروع ہوا۔شروع میں اس پروگرام کی مدت ۵۴ منٹ ہوا کرتی تھی اب اسے بڑھا کر سوا گھنٹہ کر دی گئی ہے۔فی الوقت مصر کی چار یونیورسٹیوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی جامعہ ازہر، عین شمس یونیورسٹی کے علاوہ اسکندریہ یونیورسٹی میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔اور اردو کی اعلیٰ ترین ڈگری یعنی ڈاکٹریٹ تک کی تعلیم دی جارہی ہے۔

صومالیہ میں اردو

صومالیہ ایک مدت تک برطانیہ اور اٹلی کی نوآبادی رہ چکا تھا۔ ۲۶ جون ۱۹۶۰ میں اسے آزادی ملی۔ یہاں ۹۹ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ صومالیہ میں چند خاندان جنکا تعلق کراچی اور کاٹھیاوار سے تھا، ہجرت کر کے صومالیہ پہنچے۔ انکی تعداد تقریباً سو سے کچھ اوپر ہے یہ صومالی قومیت رکھتے ہیں اور صومالی زبان بولتے ہیں مگر اپنے گھروں میں اور باہمی روابط میں اب بھی بڑی حد تک اردو ہی بولتے ہیں۔ موغادیشو میں ایک پاکستانی اسکول ہے جہاں زیر تعلیم بچوں کی اکثریت کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔

صومالیہ میں اردو کو اس لئے اہمیت اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کا رسم الخط بظاہر عربی سے ملتا جلتا ہے۔ صومالیہ کے اکثر باشندے غیر ملکی زبانیں سیکھنے میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ سحر صدیقی اپنے ایک مضمون "صومالیہ میں اردو" میں رقم طراز ہیں۔ کہتے ہیں میں نے صومالیہ اپنے قیام کے دوران شاید ہی کوئی صومالی دیکھا ہو جو ایک سے زیادہ زبانیں نہ بولتا ہو۔ انگریزی، اطالوی اس کے بعد اکثریت کو اردو کا مشتاق اور شوقین پایا۔ انھیں انگریزی اور دیگر زبانیں سیکھنے کیلئے جدید سہولتیں وسیع پیمانے پر حاصل ہیں مگر اردو سیکھنے کیلئے انھیں پاکستانی اور ہندوستانی فلموں کے سوا دوسرا کوئی وسیلہ انکے پاس نہیں۔

افغانستان میں اردو

افغانستان میں بظاہر کوئی اردو اسکول یا کالج قائم نہیں۔ یہاں بھی محض پاکستانی اور ہندوستانی فلمیں ہی اردو کی ترویج کا ذریعہ ہیں کیوں کہ سیاسی طور پر افغانستان اور پاکستان کے تعلق اچھے نہیں رہے۔ افغانستان میں اردو نظر نہیں آتی۔ ہندوستانی باشندے جن میں مسلم، ہندو اور سکھ سبھی شامل ہیں اردو یا ہندی بولتے سنے جاتے ہیں افغانستان میں روسی جارحیت کے زمانہ میں جو افغانی بحیثیت مہاجر پاکستان رہے انکی تعداد لاکھوں میں تھی۔ وہ تذکیر وتانیث، واحد جمع کی تخصیص کے بغیر اردو میں اپنا کام چلاتے ہیں جو واپس جا چکے ہیں وہ اردو کا تحفہ اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔

ایران میں اردو

ایران میں اردو کی تدریس پہلوی دور سے چلی آرہی ہے۔ حکومت پاکستان نے ۱۹۵۶ میں دانشگاہ تہران میں شعبہ اردو قائم کیا جو "کرسی زبان اردو پاکستان شناسی" کہلاتا ہے ۱۹۹۱ سے غیر ملکی زبانوں کے کالج "دانشگاہ زبان

ہائے خارجی" میں اردو بی اے تک پڑھائی جاتی رہی ہے۔ اردو کیلئے چالیس نشستیں مختص ہیں۔ اس کے علاوہ دانشگاہ فردوسی مشہد اور دانشگاہ اصفہان میں اردو بطور اختیاری مضمون پڑھائی جاتی ہیدانشگاہ شیراز میں بھی اردو اسی طرح پڑھائی جاتی ہے۔

تہران میں اردو کی تدریس کا الگ سے بندوبست ہے۔ یہ مدرسہ پاکستان ۱۹۶۴ میں قائم ہوا تھا۔ چونکہ ایرانی طلبا اس مدرسہ میں قانوناً داخلہ نہیں پاتے اسلئے صرف پاکستانی بچے ہی اس مدرسہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ خصوصاً وہ بچے جنکی مائیں ایرانی نژاد ہیں۔ ایران سے دو فارسی اردو لغات بھی شائع ہوئے ہیں۔

انقلاب ایران کے بعد ایران سے حسب ذیل اردو رسائل شائع ہو رہے ہیں

۱۔ ارشاد: ہفت روزہ، زاہدان سے چھپتا ہے

۲۔ الجہاد: قم میں قائم، وفاق علمائے شیعہ پاکستان کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

۳۔ الحسینی: سہ ماہی ۱۴۱۳ ہجری کے آغاز سے قم میں شائع ہو رہا ہے۔ اس میں صرف حضرت حسین کے بارے میں مقالات شائع ہوتے ہیں۔

۴۔ توحید: سہ ماہی رسالہ، قم سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ایک سنجیدہ اور اعلیٰ پرچہ ہے۔

۵۔ ثقلین: سہ ماہی، یہ اہل بیت قم کی طرف سے ۱۴۱۳ ہجری سے شائع ہو رہا ہے۔

۶۔ "ندائے اسلام" (ماہنامہ حوزہ، اندیشہائے اسلامی تہران کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔

تہران سے متعدد علمی اردو کتابوں کے فارسی تراجم شائع ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں شبلی نعمانی کی تصنیف شعرا لعجم، سوانح مولانا روم، تاریخ علم الکلام کتب خانہ اسکندریہ اور مقالات شبلی کے تراجم از سید تقی گیلانی ملقب بہ فخر داعی کا ذکر خصوصیت کا حامل ہے۔ سرسید کی تفسیر القرآن ھوالہدیٰ الفرقان اور حافظ محمود شیرانی کے فردوسی پر چار مقالات چھپ چکے ہیں[۲۴]

ریڈیو ایران (صدائے جمہوری اسلامی ایران) کے اسٹیشنوں سے مختصر دورانیہ کی اردو نشریات پہلوی دور سے جاری ہیں۔ انقلاب سے پہلے ریڈیو زاہدان سے دو گھنٹہ اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ریڈیو تہران سے اردو نشریات ۲۶ مئی ۱۹۷۹ سے شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت شام کو ایک گھنٹہ دورانیہ کے پروگرام نشر کئے جاتے ہیں۔

ایرانی ٹیلیوژن سیمائی جمہوری اسلامی ایران پر کبھی کبھی ہندوستانی اور پاکستانی دستاویزی فلمیں فارسی میں ڈبنگ کر

کے دکھائی جاتی ہیں۔انقلاب سے پہلے پہلوی دور میں ایران و ہندوستان کی اردو فیچر فلموں کی بہت بڑی منڈی تھا۔ یہ تمام فلمیں اگر چہ فارسی میں ڈبینگ کر کے دکھائی جاتی تھیں تاہم گانے اردو ہی میں بجائے جاتے تھے اب ہندوستانی فلمیں ٹیلیوژن پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ایرانی بلوچستان اور صوبہ خراسان کے وہ علاقے جو افغانستان کی سرحد سے ملتے ہیں وہاں اکثر لوگ اردو جانتے ہیں۔زاید ان میں جو فارسی بولی جاتی ہے اس میں اردو کی ترکیبیں ملتی ہیں۔

محرم الحرم کے دنوں میں تہران، قم اور مشہد سے جو مجالس عزاداری منعقد ہوتی ہیں اور اہل برصغیر کیلئے مخصوص ہوتی ہیں ان میں ہندوستانی اور پاکستانی ذاکرین اردو ہی میں مصائب پڑھتے ہیں۔

شام میں اردو

دمشق میں اردو سکھانے کا باقاعدہ انتظام ۱۹۸۸ میں شام کے پاکستانی سفارت خانہ میں ہوا۔پہلے ہی کلاس میں ۲۳ طلبا نے داخلہ لیا۔پاکستان میں شامیوں کو اردو سکھانے کے لئے سفیر محترم قاضی جہانگیر نے "آؤ اردو سیکھیں" کتاب بطور نصاب تجویز کی اور اس کتاب کو انھوں نے خود اپنی نگرانی میں مرتب کرایا۔مرکز اقبال الثقافی کے زیر اہتمام عربی میں دو مجلّے الثقافہ اور الباکستانیہ جاری کئے گئے جس میں جدید اردو شاعری کے ترجمے اور اردو ادب پہ بالخصوص علامہ اقبال سے متعلق مضامین باقاعدگی سے شائع ہو رہے ہیں۔

اسی مرکز کے تحت بے شمار سیمینار اور لیکچر منعقد ہو چکے ہیں مرکز کی کاوش سے عربی زبان میں پاکستانی کتب کے ترجمے بھی شائع ہوئے جن میں فتح نامہ سندھ، حج نامہ اور اقبال کا دیوان بال جبریل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔[۲۵]

ملیشیا

ملیشیا اگر چہ ایک اسلامی ملک ہے مگر یہاں کی تہذیب وثقافت پہ ہندوستان کا اثر زیادہ ہے یہاں ہندو آبادی تیسرے نمبر پہ ہے یہ وجہ ہے کہ اردو کا پودا یہاں جڑ نہ پکڑ سکا۔کچھ قانونی بندشیں بھی ہیں جنکی وجہ سے اردو کو یہاں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکی۔کئی بار پاکستان نے یہاں کی یونیورسٹیوں اور نجی اداروں میں اردو کو بطور ایک زبان قائم کرنے اور پیر جمائے دینے کی کوشش کی مگر کوششیں بار آور نہ ہوسکیں۔یہاں ہندی کا اثر اتنا زیادہ کہ خالص اردو کو بھی ہندی کا نام دیا جاتا ہے۔کیوں کہ یہ دونوں زبانیں صرف ونحو اور صوتی اعتبار سے ایک دوسری کے بہت قریب ہیں۔

مالدیپ میں اردو

مشرق قریب کے اسلامی ملکوں میں اردو کی ترویج کا جہاں تک تعلق ہے مالدیپ بھی ایک اہم ملک ہے۔ مالدیپ میں اردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۲۵ فیصد ہوگی لیکن سمجھنے والوں کی تعداد ۷۵ فیصد ہے۔ مالدیپ کے طلبا پاکستان کے مختلف دینی مدارس مثلاً جامعہ تجوید ان لاہور چھاؤنی، جامعہ اشرفیہ جامعہ سلفیہ فیصل آباد میں دینی علوم حاصل کر رہے ہیں۔ اور اردو زبان سیکھ کر روانی سے بولتے ہیں کچھ لوگ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد، میڈیکل کالجوں اور وزارت خارجہ کی ٹریننگ پر آتے ہیں وہ بھی اردو زبان سے بخوبی واقف ہو جاتے ہیں۔

اردو اور مالدیپی زبان جو "دویہی" کہلاتی ہے، اردو سے کافی حد تک مماثل ہے یہ بھی اردو کی طرح دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ پہلے دویہی کا رسم الخط سنگھالی سے مماثلت رکھتا تھا لیکن سترھویں صدی میں عربی فارسی کی طرح تانا کے نام سے نیا رسم الخط متداول ہوا۔ یہی زبان میں تقریباً گیارہ فیصد الفاظ عربی فارسی کے شامل ہیں۔ اسکے علاوہ یہاں کی زبان پر اسلامی نظریات مسلمان صوفیوں، سیاحوں اور عالموں کے اثر ونفوذ کی وجہ سے کافی الفاظ عربی اور فاسی کے مالدیپی زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہی اور اردو میں بہت سارے الفاظ مشترک ہیں جیسے دویہی زبان میں کہتے ہیں "حال کی کیا ہے" اردو زبان میں کہیں گے " کیا حال ہے "یعنی "حال" کا لفظ دونوں زبانوں میں مشترک ہے۔ یہاں اردو کی تدریس کا باقاعدہ بندوبست تو نہیں مگر یہاں جو اساتذہ ہیں وہ اردو روانی بول لیتے ہیں اور بچوں کو بھی اردو سے متعارف کراتے ہیں یہاں ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

اردو دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلہ میں ابھی نوزائیدہ ہے مگر اپنی ہمہ گیری وسیع النظری اور اوسیع القلبی کی بدولت بہت جلد لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے۔ وہ حضرات جو اس زبان سے زیادہ واقف نہیں ہوتے وہ بھی اسکے حسن وزیبائش سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ اردو نے بڑی مختصر مدت میں وہ کارہائے نمایاں کر دکھائے ہیں جو دوسری زبانوں کیلئے باعث رشک ہیں۔ اردو کی بازگشت سارے برصغیر میں تو سنائی دیتی ہے ساتھ ہی مشرق وسطی، یورپ، اور امریکہ تک اس کی خوشبو کی لپٹیں ذہنوں کو معطر اور مسرور کر چکی ہیں۔

حواشی

۱۔ ڈاکٹر شرف الدین صلاحی، بیرونی ممالک میں اردو (تحقیقی مقالوں کا مجموعہ)، اسلام آباد، ص ۱۱۱

۲۔مضامین وحشت ۱۵۸
۳۔محمد حنیف شاہد، بیرونی ممالک میں اردو، ص ۱۷۷
۴۔شانتی رنجن بھٹا چاریہ، اردو صحافت کی تاریخ، ص ۷۰
۵۔وقار عظیم، مشرقی بنگال میں اردو، ص ۸۵
۶۔انشا کلکتہ ۱۰۲ جنوری فروری
۷۔ بیرونی ممالک میں اردو اسلام آباد صفحہ ۱۷۵
۸۔ماہ نامہ فنکار، گوالیار سرورق ستمبر اکتوبر ۲۰۰۷
۹۔ایس پی شرمادی پریس سوشل پولیٹیکل اوکیننگ صفحہ ۲۱
۱۰۔پروفیسر عطر علی، شعبہ انگریزی راجشاہی یونیورسٹی اردو یزینڈ بجرڈ لینگوئج ان بنگلہ دیش، ص ۱۴
۱۱۔خطوط غالب (مرتبہ خلیق انجم) ص ۱۷
۱۲۔ڈیلی سٹار بنگلہ دیش
۱۳۔بیرونی ممالک میں اردو، ص ۱۷۵
۱۴۔ایضاً، ص ۱۷۶
۱۵۔ایضاً، ص ۱۲۶
۱۶۔ایضاً، ص ۱۹۰
۱۷۔ایضاً، ص ۱۹۵
۱۸۔ایضاً، ص ۱۹۵
۱۹۔ایضاً، ص ۲۰۷
۲۰۔ ایضاً، ص ۲۰۶
۲۱۔ایضاً، ص ۲۱
۲۲۔ایضاً، ص ۶۵
۲۳۔ایضاً، ص ۴۲۰
۲۴۔ایضاً، ص ۴۲۵
۲۵۔ایضاً، ص ۲۱۴

ڈھاکا اردو کا ایک مرکز

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام*

محمد بن قاسم کے حملہ سے سینکڑوں برس پہلے سے عرب تجار اور مبلغین اسلام کے ذریعے عربی اور فارسی زبانیں سواحل بنگال تک پہونچ چکی تھیں اور ان دونوں زبانوں کے بے شمار الفاظ یہاں کی مقامی زبان میں داخل ہو کر اس کے خمیر میں شامل ہو چکے تھے۔ حتی کہ انگریزی دور حکومت آپہونچا جسے اس صوبہ میں اردو کی تجدید حیات کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ اس زمانہ میں مرشد آباد میں نظامت کا صدر مقام بن چکا تھا۔ اردو زبان وادب کا بھی مرکز تھا، جہاں سے ملحقہ صوبوں میں اردو کی بہم رسانی جاری تھی۔ چنانچہ اس زمانہ میں مشرق کی خاک سے عبدالغفور نساخ اور سید انشاء جیسی جلیل القدر ہستیاں اٹھیں جنہیں بلا خوف اردو کے ائمہ میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں بنگال میں مرزا قتیل کے تلامذہ کی بہت بڑی تعداد موجود تھی جن کے ہاتھوں فارسی اور اردو ادب میں بیش قیمت اضافے ہوئے اور یہی زمانہ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد کا بھی تھا جس کی لسانی اور ادبی خدمات کا ذکر نہ کرنا ناسپاسی ہوگی۔ لیکن اس سلسلہ میں ۱۸۵۶ کے اس دن کی یاد دہانی ضروری ہے جب واجد علی شاہ کا قافلہ شعرا اور ادبا کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ سے چل کر کلکتہ میں اترا اور یہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ اس جلاوطنی سے سلطان اودھ کے دل پر جو کچھ بھی گزر گئی ہو کم ہے، لیکن اس تاریخی حادثہ کی بدولت کچھ مدت کے لیے شام اودھ کی رنگینیاں بنگال کے حصہ میں آ گئیں اور بنگال سے اردو شعر و ادب کے روابط اور زیادہ مستحکم ہو گئے۔[1]

اس خوشگوار ماحول اور سازگار حالات میں ڈھاکا کے لئے ناممکن تھا کہ اپنے سینے کی آگ کو بدستور دبائے بیٹھا رہتا۔ جیسے جیسے کلکتہ، مرشد آباد میں اردو کے نامور اہل قلم اور ادیب جمع ہوتے گئے ڈھاکا کے تعلقات

*شعبۂ اُردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش

ان دونوں مقامات سے استوار ہوتے گئے۔ نواب سید محمد آزاد، عبدالغفور نساخ اور آقا احمد علی اصفہانی جیسے ارباب ذوق اور خواجگان ڈھاکہ جیسے مربیان شعروادب تو یہاں پہلے سے موجود ہی تھے۔ مرزا جان طپش دہلوی اور حافظ اکرام احمد ضیغم، جیسے اساتذہ نے یہاں پہونچ کر ڈھاکا کی ادبی محفلوں کی رونق بڑھادی۔ گھر گھر شعروادب کا ذوق عام ہوگیا۔ ڈھاکا کو اردو کا ایک مرکز سمجھا جانے لگا اور یہ سب کچھ اس زمانہ میں ہوا جب مغل حکومت کے زوال کے بعد بنگال میں مسلمانوں کا سیاسی اور تہذیبی اثر یکلخت ختم ہو چکا تھا اور ان کا ماضی ایک بھولی ہوئی کہانی بن چکا تھا۔ اگر انگریز حکمرانوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے تحت مسلمانوں کو من حیث القوم فنا کرنے کا پختہ ارادہ نہ کرتا اور انگریزوں کی کمک سے اس صوبہ پر ہندو تہذیب وثقافت نہ آگئی ہوتی تو یہاں کے اردو شعروادب کی تاریخ آج کچھ اور ہوتی۔

برطانوی دور حکومت کے آغاز میں مذہبی درسگاہوں میں جنہیں مدرسہ کہا جاتا ہے اردو ہی کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی کیونکہ مذہب اسلام سے متعلق درسی کتابیں اردو زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ مذہب کے علاوہ کاروبار، تجارت اور پیشے نے بھی اردو زبان کے پھیلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اٹھارہویں صدی میں ڈھاکا چاول کی تجارت کا مرکز تھا۔ چاول کے مارواڑی تاجر ڈھاکا کے بازاروں میں کاروباریوں کے ساتھ ہندی یا ہندوستانی میں بات چیت کیا کرتے تھے۔

بنگلا زبان کو اردو کے ساتھ پاکستان کی قومی زبان بنانے کا مطالبہ قیام پاکستان کے بعد ہی مشرقی پاکستان میں شروع ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں ۱۹۴۸ میں تمدن مجلس نامی ایک ثقافتی تنظیم نے ڈھاکا میں لسانی تحریک کا آغاز بھی کردیا۔ لیکن پاکستان کی اعلیٰ سیاسی قیادت جس میں قائداعظم محمد علی جناح، لیاقت علی خاں اور خواجہ نظام الدین شامل تھے۔ اس بات پر مصر رہی کہ پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان صرف اردو ہوگی۔ بنگالیوں نے حکومت کی اس لسانی پالیسی کو ماننے سے انکار کردیا۔ کیونکہ پاکستان ایک جمہوری ملک تھا اور ۱۹۵۱ کی مردم شماری کے مطابق اس ملک کی اکثریت یعنی ۵۶ فیصد باشندوں کی مادری زبان بنگلہ تھی جب کہ اردو پورے پاکستان میں صرف تیرہ عشارہ تین سات فیصد افراد کی مادری زبان تھی۔ بنگالیوں کی لسانی تحریک اس وقت اپنے عروج پر جا پہونچی جب ۲۱ فروری ۱۹۵۲ میں بنگلہ کو قومی زبان بنانے کا مطالبہ کرنے والے طلباء کے ایک جلوس پر پولیس نے گولی چلادی جس کے نتیجے میں کئی طلبہ شہید ہوگئے۔

۱۹۵۲ کی لسانی تحریک کا اردو کے ادیب وشاعر پر کوئی مثبت اثر نہیں ہوا کیونکہ ان کے خیال میں یہ تحریک ان کے اپنے ادبی، ثقافتی اور اقتصادی مفاد کے خلاف تھی۔ بہرحال ان کے درمیان کچھ ادیب اور شاعر ایسے بھی تھے جنہوں نے ۱۹۵۲

کی لسانی تحریک کی حمایت کی تھی جس کا مقصد اردو کے ساتھ بنگلہ زبان کو بھی قومی زبان کا درجہ دینا تھا۔ان میں یوسف حسن خان کا نام سرفہرست ہے۔اردو شاعروں میں لسانی تحریک کی حمایت کرنے والوں میں احسن احمد اشک، سلیم اللہ فہمی، صلاح الدین محمد، عارف ہوشیار پوری، سرور بارہ بنکوری، اختر لکھنوی، اظہر قادری، مسعود کلیم، ڈاکٹر حنیف فوق، ادیب سہیل، احمد سعدی اور نوشاد نوری کے نام قابل ذکر ہیں۔[۲]

اٹھارویں صدی کے اواخر میں میں ڈھاکا میں اردو غزل گوئی کی داغ بیل مرزا جان طپش کے ہاتھوں پڑی۔مرزا طپش ۱۷۸۶ میں نواب شمس الضحیٰ کی دعوت پر اپنے کئی شاگردوں کے ساتھ ڈھاکا آئے تھے اور بارہ سال تک یہاں قیام کیا تھا۔ڈھاکا میں اپنے قیام کے دوران مرزا طپش نے اپنی کلیات مرتب کی جسے فورٹ ولیم کالج نے ۱۸۱۲ میں شائع کیا۔ان کا انتقال ۱۸۱۴ میں ہوا۔

منشی رحمان علی طپش ۱۸۲۳ میں ڈھاکا کے ایک رئیس خاندان میں پیدا ہوئے۔وہ اردو زبان میں شعر کہتے تھے۔ان کے کلام کا مجموعہ دیوان طپش اب نایاب ہے۔ان کی پہلی کتاب فارسی اور اردو نعتوں کا مجموعہ ہے جس کا نام گلزار نعت ہے جو ۱۸۸۰ میں کانپور کے نظامی پریس سے شائع ہوا تھا۔

سید محمود آزاد اردو میں غزلیں کہتے تھے۔ان کا تخلص شیدا تھا۔ان کا دیوان ۱۸۸۹ میں مرشد آباد سے شائع ہوا تھا۔یہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔سید محمود آزاد کا انتقال ۱۹۱۶ میں ہوا۔

بنگلا دیش میں اردو شعر و شاعری کے فروغ میں خواجگان ڈھاکا کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔انیسویں اور بیسویں صدی میں ڈھاکا کے نواب خاندان سے تعلق رکھنے والوں میں خواجہ حیدر جان شائق، خواجہ اسد اللہ کوکب، خواجہ عبدالرحیم صبا، خواجہ احسن اللہ شاہین، خواجہ ابوالفضل، خواجہ عتیق اللہ شیدا، خواجہ ابوالحسین، خواجہ محمد اسماعیل ذبیح، اور خواجہ محمد عادل اردو اور فارسی میں غزلیں کہتے تھے۔[۳]

خواجگان ڈھاکا کے علاوہ دیگر شعرا اردو جو ڈھاکا میں مقیم ہوئے ان میں قابل ذکر شعرا کے نام مرزا فقیر محمد، میر وزیر علی نامی، شیخ احمد جان عطش اور آغا جان کوثر ہیں۔ان کے علاوہ ڈھاکا کے بنگالی نژاد اردو شعرا حکیم حیدر علی، شیخ بنگالی عاصی، غلام کبریا کامل، حکیم واحد علی، منشی وارث علی، ابوعلی برق اور مولوی واحد علی مخمور وغیرہ کے دم سے یہاں شعر و سخن کی محفلیں آباد رہتی تھیں۔

ڈاکٹر وجاہت حسین عندلیب شادانی ہندو کالج دہلی میں دو سال تک درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں ڈھاکا آئے اور ۱۹۲۸ میں ڈھاکا یونیورسٹی میں اردو اور فارسی پڑھانے پر مقرر ہوئے۔شادانی اردو اور فارسی کے صرف استاد ہی نہیں تھے بلکہ ان دونوں زبانوں کے ادیب اور شاعر بھی تھے۔وہ جب ڈھاکہ آئے

تھے تو اس زمانہ میں یہاں اردو اور فارسی کے کچھ ایسے شعرا موجود تھے جن کی وجہ سے ڈھاکا میں اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے شادانی کہتے ہیں کہ "

> ڈھاکہ پہونچنے کے بعد میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ شہر میں لوگ عام طور پر اردو سمجھتے اور بولتے ہیں ڈھاکہ پہونچنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دلی کے آس پاس کا علاقہ یا یوپی کا کوئی ٹکڑا وہاں سے اٹھا کر ہزار میل کے فاصلہ پر یہاں مشرقی بنگال میں لاکر رکھ دیا گیا ہے" [۴]۔

ڈھاکا میں اس وقت جو شعرا تھے ان میں کچھ ان سے عمر میں بڑے تھے جیسے سید شرف الحسینی شرف، مرزا فقیر محمد، حکیم حبیب الرحمٰن، خواجہ محمد اسماعیل ذبیح اور خواجہ محمد سلیم۔ یہ تمام کے تمام شعراء کلاسیکی غزل گوئی کے دلدادہ اور شیدائی تھے اور فن برائے فن کے نظریے میں غزلیں کہتے اور مشاعروں میں داد وصول کرتے تھے۔ شادانی کی شعری تخلیقات کا مجموعہ نشاط رفتہ ۱۹۵۰ میں شائع ہوا تھا۔ شادانی کا انتقال ڈھاکا میں ۲۹ اگست ۱۹۶۹ میں ہوا تھا۔ شادانی کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ایک جدید اور رومان پسند شاعر تھے۔

تقسیم سے پہلے سلیم اللہ فہمی کی تقرری بنگال سول سروس کے تحت ہوئی تھی۔ لیکن ۱۹۴۷ کے بعد ان کا تبادلہ مستقل طور پر ڈھاکا میں کر دیا گیا۔ وہ علامہ رضا علی وحشت کے شاگرد تھے۔ انہوں نے بڑے ولولے اور حوصلے سے زندگی بسر کی۔ ان کی کتاب ذوق سلیم کراچی سے ۱۹۹۰ میں شائع ہوئی۔ ان کا انتقال ڈھاکا میں ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ میں ہوا۔

۱۹۴۷ کی تقسیم کے بعد ہندوستان سے ترک وطن کر کے آنے والے شعرا سے پہلے جو اپنی زبان بنگلا کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی قدرت رکھتے تھے ان میں سید شرف الحسین کا نام سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ تقسیم کے پہلے یا تقسیم کے وقت جو بنگالی نژاد اردو شعرا باحیات تھے ان میں انجب علی شوق، ہرمز اللہ شیدا، اسماعیل ہلالی خنجر، محمود بولائی، پروفیسر عبدالحکیم بلال، رشید احمد شاہ عثمانی، سید عاشق حسین، سید اظہر حسین، سید خورشید حسین، سید مفضل حسین اور زاہد بنگالی شامل تھے۔ [۵]

پاکستان کے ۲۴ سالہ دور میں مغربی پاکستان سے بھی چند ممتاز ادیب و شاعر اپنی سرکاری ملازمت کے سلسلے میں مشرقی پاکستان میں قیام پذیر ہوئے۔ حلقہ ارباب ذوق، انجمن ترقی پسند مصنفین، انجمن ادب، ینگ رائیٹرس ایسوسی ایشن اور دوسری تنظیموں کی ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے یہاں ساٹھ کی دہائی میں ترقی پسند، روایت پسند، اسلام پسند، جدیدیت اور جدت پسند نوجوان شاعروں کی ایک نئی نسل ابھر کر سامنے آئی تھی۔

احسن احمد اشک راجشاہی یونیورسٹی میں اور بعد میں ڈھاکہ کالج میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انہوں نے بنگلا

دیش کے قومی شاعر قاضی نذرالاسلام کی بہت ساری انقلابی نظموں کا بنگلا سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کے اپنے شعری مجموعے میرق وباراں ۱۹۵۰ اور جاگتے جزیرے ۱۹۶۲ میں شائع ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں کہا گیا کہ "اشک اگر دنیائے ادب میں یاد کیے جائیں گے تو اپنی طنزیہ شاعری کے لیے کیونکہ انکی طنزیہ نظمیں اردو شاعری میں اضافے کا درجہ رکھتی ہیں"[۶]۔ احسن احمد اشک کا انتقال ڈھاکہ میں ۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ میں ہوا۔

نوشاد نوری اپنی فکر اور نظریے کے اعتبار سے ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ جب ہندوستان سے ۱۹۵۰ میں ڈھاکا آئے تھے تو ان کے تخلیقی اثاثے میں "بھکاری" جیسی نظم شامل تھی جو ہندوستان میں ان کی جلاوطنی اور پاکستان میں مقبولیت کا سبب بنی۔ نوشاد نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۱ تک ملک کے سیاسی پس منظر میں کئی تاریخی نظمیں کہی ہیں جن میں ۵۲ کی لسانی تحریک کے موضوع پر "موہن جداڑو" جیسی نظم بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ ۲۶ مارچ ۷۱ کے موضوع پر کہی جانے والی نظم "لہو میں شرابور دن" شاید ۲۴ سالہ پاکستانی دور کی آخری اردو نظم ہے۔ جس کے کہنے کا اعزاز نوشاد نوری کو حاصل ہے۔ نوشاد کے دو شعری مجموعے "رہ ورسم آشنائی" اور "روزن دیوار" قیام بنگلا دیش کے بعد کلکتہ اور ڈھاکا سے شائع ہوئے۔ نوشاد کی تخلیقات میں زیادہ تر ایسی نظمیں شامل ہیں جن کا پس منظر قومی اور عالمی سطح پر کی جانے والی عوامی جدوجہد ہے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۲۰۰۰ میں ڈھاکا میں انتقال کیا۔

فی الحال ڈھاکا میں جو اردو شعرا غزلیں اور نظمیں کہہ رہے ہیں ان سب کی تخلیقات ہی آئندہ ڈھاکا میں اردو کا شعری سرمایہ سمجھی جائیں گی۔ ان میں احمد الیاس، شمیم زمانوی، جلال عظیم آبادی، سید محمد تقی، صابر علی صابر، بکل ہاشمی، عنایت اللہ صدیقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ڈھاکہ میں اردو افسانہ نگاروں میں صرف ارمان شمسی باحیات ہیں۔

ڈھاکا یونیورسٹی:

یہ ایک سرکاری تعلیمی ادارہ ہے جس کی بنیاد جب ہی ۱۹۲۱ میں پڑی تھی اسی وقت سے شعبہ اردو بھی اپنی تدریس وتحقیق کا کام انجام دے رہا ہے۔ ابتدائی مرحلہ میں خان بہادر فدا علی خان شعبے کے صدر تھے۔ عالمی شہرت یافتہ پروفیسر ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر عبدلیب شادانی اسی شعبے سے منسلک تھے۔ اس شعبے میں چار سطح پر اردو کی تعلیم دی جاتی ہے۔

کورس معینہ کی تدریس کے اوقات:

1۔ بی اے آنرز: 4 سال

2۔ ایم اے: 1 سال

3۔ ایم فیل: 2 سال

4۔ پی ایچ ڈی: 3 سال

ہر سال شعبہ اردو کے بی اے آنرز میں 120 طلبہ وطالبات داخلہ لیتے ہیں۔ فی الحال شعبے میں کل طلبہ وطالبات 400 سے زائد ہیں۔

شعبہ اردو کے نصاب میں اردو غزل، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، ناول، ڈراما، افسانہ، تنقید، تحقیق، تاریخ، تمثیل، طنز ومزاح، سوانح عمری، صحافت وغیرہ شامل ہیں۔ بعض خاص خاص پرچوں نے جیسے لسانیات، علم عروض، اردو پر فارسی و انگریزی کے اثرات، زبانوں کا تقابلی مطالعہ بھی شعبے کی زینت بخشی۔ اردو کے مشہور شعرا وادبا میں امیر خسرو، ولی دکنی، اردو شاعری کے عہد زرین، غالب، مومن، اردو کے عناصر خمسہ، مولوی عبدالحق، اقبال، جوش، پریم چند، کرشن چندر، منٹو، عصمت، فیض، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کو بڑی اہمیت کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ ۷

تین مایہ ناز اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ، پروفیسر ڈاکٹر ام سلمی، پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول اسی شعبے سے وابستہ تھے۔ ان کی علمی وادبی شہرت عالمی سطح پر مقبول ہے۔ اب وہ تینوں مرحوم ہوگئے ہیں۔ شعبے میں فی الحال نو اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر جعفر احمد بھوئیاں، پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود الاسلام، پروفیسر ڈاکٹر محمد غلام ربانی، پروفیسر ڈاکٹر محمد اسرافیل، ڈاکٹر رشید احمد، ڈاکٹر محمد رضا الکریم، جناب غلام مولا، جناب حسین البنا اور محترمہ حفصہ اختر ہیں جو تنقیدی وتحقیقی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ راقم الحروف کی دو اردو تحقیقی کتابیں منظر عام پر آئیں (1) اردو پر مغرب کے اثرات (2) مختلف زبانوں کا باہم تعلق۔

اس شعبے کی جانب سے ۲۰۱۷ میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا گیا اور ۲۰۱۹ میں ایک قومی مشاعرہ کا انتظام بھی ہوا تھا۔

حوالہ جات:

۱۔ سید اقبال عظیم، مشرقی بنال میں اردو، آغا صادق روڈ ڈھاکا، ۱۹۵۴ صفحہ ۲۱

۲۔ احمد الیاس، بنگلا دیش میں اردو، انیما پریس ڈھاکہ، ۲۰۱۴، صفحہ ۱۶۔۱۷

۳۔ احمد الیاس، اے بریف پروفائل آف اردو پوائنٹس آف بنگلا دیش۔ ۲۰۱۰

۴۔ شاہزاد منظر، پاکستان میں اردو افسانے کے پچاس سال، کراچی ص ۱۹۹

۵۔ احمد الیاس، بنگلہ دیش میں اردو، ص ۳۰

۶۔ پروفیسر ہارون الرشید، انتخاب، خاص نمبر، شمارہ ۳، ص ۳۱

۷۔ شعبہ اردو کے نصاب سے ماخوذ

بنگلہ دیش میں اردو ادب کے ایک شیدائی: لطیف احمد

پروفیسر ڈاکٹر محمد نصیر الدین*

موجودہ بنگلہ دیش میں اردو ادب کے فروغ میں جن حضرات وخواتین نے اہم کردار ادا کیا ہے ان میں راجشاہی یونیورسٹی کے سبکدوش پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی بنگلہ دیش میں اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کردی۔ وہ عمر رسیدہ ہو چکے ہیں اس کے باوجود ان کا قلم اب بھی فعال ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سارے مضامین اور کتابیں تصنیف وتالیف کی ہیں۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ شام ڈھلے کے عنوان سے حال ہی میں منظر عام پر آچکا ہے۔ ان کے مضامین صرف اندرون ملک ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک مثلاً ہندوستان، پاکستان اور انگلستان کے مؤقر رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مقالے میں لطیف احمد کی مختصر سوانح حیات اور ان کے ادبی وتحقیقی کاموں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد کی پیدائش مارچ ۱۹۵۲ء میں ہندوستان میں اتر پردیش کے ضلع سیتاپور کے ایک دور افتادہ قصبے لہرپور میں ہوئی جو لکھنو کے نواحی قصبے خیرآباد سے چند میل دور شمال مشرق میں واقع ہے۔ موصوف کا تعلق سید فضل حق خیرآبادی کے خانوادے سے ہے جس کا ذکر پروفیسر ڈاکٹر محمد شمیم خان نے لطیف احمد کی کتاب "آئینہ ادب اردو" کے تعارف میں کیا ہے۔ سید فضل حق خیرآبادی اپنے وقت کے بزرگ کامل اور مشہور شاعر تھے۔ مضطر ان کا تخلص تھا۔ بہادر شاہ ظفر کے معاصر اور مصاحبوں میں شامل تھے۔[۱]

جب لطیف احمد کی عمر ابھی بارہ ہی سال تھی کہ انھوں نے حفظ قرآن مکمل کر لیا۔ لیکن ان کا رجحان دینی تعلیمات کے حصول کے بجائے جدید تعلیم کی طرف تھا۔ مگر یہ بات ان کے خاندان کی روایات کے عین منافی تھی۔ دیوبند جانے کی بات ابھی ہو رہی تھی کہ ان کے والد کے ایک شناسا جن کا تعلق جلپائی گوڑی سے تھا،

---

* صدر، شعبۂ اردو، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

بغرض سیر وتفریح ان کے گھر لہر پور پہنچے اور ان ہی کے ہمراہ لطیف صاحب کو رنگپور، سابق مشرقی پاکستان بھیج دیا گیا۔ یہ ۱۹۶۰ کی بات ہے۔ رنگپور میں وہ قائد ملت موریل ہائی اسکول میں درجہ ششم میں داخل ہوئے۔ لیکن بات یہاں نہیں بنی اور رنگپور میں محض دو سال کے مختصر سے قیام کے بعد انھیں راجشاہی منتقل ہونا پڑا۔ راجشاہی مسلم ہائی اسکول سے انھوں نے ۱۹۶۶ میں سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا اور پھر راجشاہی گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے اور یہیں سے ۱۹۶۸ میں ہائر سکنڈری اسکول سرٹیفکیٹ کا امتحان دے کر نتیجہ آنے سے پہلے ہی جون ۱۹۶۸ میں ڈھاکہ روانہ ہوگئے۔ وہ جب ڈھاکے پہنچے تو انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اسٹیشن پہ اتر کر کہاں اور کس طرف جانا ہے۔ بہر حال ان کے اسکول کے ایک ساتھی سید قیصر امام نے انھیں سہارا دیا اور اس وقت تک اپنے سا تھ رکھا جب تک ان کے ذریعہ معاش کا معقول اہتمام نہ ہوگیا۔

ڈھاکے میں انھوں نے ٹیوشن کر کے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ ابھی وہ خود ہی انٹرمیڈیٹ پاس نہ تھے اور انٹر کی دو طالبات کو جو انگلش میڈیم ہولی کراس کالج کی طالبات تھیں، پڑھانے پہنچے۔ چوں کہ استاد اور طالبات کی عمر تقریباً ایک ہی تھی، اس لیے فطری طور پر طالبات مخمصے میں تھیں جس کا انھوں نے اظہار کر بھی دیا۔ ان میں سے ایک نے، جو زیادہ شوخ اور تیز وطرار تھیں، کہا آپ ہمیں پڑھائیں گے یا خود پڑھنے آئے ہیں۔ سوال ہی کچھ عجیب سا تھا اس لیے وہ سٹپٹا سے گئے مگر بڑے تحمل سے جواب دیا۔ آج کم از کم مجھے موقع دیجئے کل کی بات کل پہ چھوڑئے کہ کسے پڑھنا ہے اور کسے پڑھانا ہے۔۲

بہر حال لطیف صاحب نے جس طرح اپنے کام کی شروعات کی اس سے دونوں ہی مرعوب تو ہوئیں ساتھ ہی مطمئن بھی۔ اس ٹیوشن کی وساطت سے لطیف صاحب کو اور بھی کئی ٹیوشن ملے۔ وہ خود بھی ڈھاکہ کالج میں داخل ہو گئے مگر قسمت نے یاوری نہ کی اور انھیں بصد مجبوری ڈھاکہ چھوڑ کر چاٹگاں جانا پڑا۔

کچھ دنوں چاٹگاں کالج میں بھی زیر تعلیم رہے اور آخر کار راجشاہی آ کر یہیں مستقلاً رہائش اختیار کر لی۔ یہیں ایک مقامی باعزت مگر قدامت پسند گھرانے میں ان کی شادی ہوگئی۔ کچھ دنوں تک وہ سابق مشرقی پاکستان ریڈیو راجشاہی سے بھی بحیثیت اردو نیوز ریڈر منسلک رہے۔ یہیں راجشاہی یونیورسٹی کے شعبہ السنہ کے پروفیسر کلیم سہسرامی سے انکی ملاقات ہوئی۔ پروفیسر سہسرامی اور ان کے دوستوں کے ایما پر وہ راجشاہی یونیورسٹی میں داخل ہو ئے۔ انہوں نے ۱۹۸۹ء میں ایم اے کی ڈگری اول درجے میں اور "بنگال میں اردو صحافت: ۱۹۰۱-۱۹۷۰" کے موضوع پر انگریزی میں تحقیقی مقالہ لکھ کر ۲۰۰۶ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ جو تعلیمی سفر انہوں نے رنگپور سے شروع کیا تھا وہ تھوڑے التوا کے بعد راجشاہی میں مکمل ہوا۔

راجشاہی یونیورسٹی سے لطیف احمد کا انسلاک ۴/ جولائی ۱۹۹۴ کو ہوا۔ ۱۹۹۷ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کے منصب پر ان کی ترقی ہوئی۔ ۲۰۰۶ء میں اسوسی ایٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۲۰۱۲ میں پروفیسر کے عہدے پر ان کی ترقی ہوئی۔ یکم اکتوبر ۲۰۰۰ سے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۳ء تک انہوں نے شعبۂ السنہ راجشاہی یونیورسٹی کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی ادا کیے۔ ۲۳ سال تک وہ اس شعبے سے وابستہ رہے۔ ۲۰۱۷ میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سے وہ زندگی کے بقیہ دن اپنے گھر واقع کاٹا کھالی، راجشاہی میں گزار رہے ہیں۔ ان کی زندگی بڑی ہی کشاکش اور اتھل پتھل سے عبارت ہے۔ انھوں نے تنازعات سے ہمیشہ بہت دور رہنے کی کوشش کی لیکن قدم قدم پہ نئے نئے آلام ومصائب ان کی راہ کا پتھر بنتے گئے۔ اگر انھیں پرسکون زندگی میسر ہوتی تو ہوسکتا ہے ان کے قلم سے کوئی موثر اور قابل قدر کارنامہ انجام پاجاتا۔

ڈاکٹر لطیف احمد نے تصنیف وتالیف کے کام میں ہمیشہ خود کو منہمک ومنسلک رکھا۔ لکھنے لکھانے کا شوق انھیں بچپن ہی سے رہا ہے۔ اب تک مجموعی طور سے ان کی نگارشات کی تعداد ۷۰ کے قریب ہے جس میں اردو مضامین کی تعداد ۴۰ ہے۔ پہلا مجموعہ مضامین جسے انھوں نے "مضامین لطیف" کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں ۲۵ اردو مضامین شامل ہیں۔ انگریزی مضامین جسے انہوں نے "آرکیڈیا" کا نام دیا ہے ان کی تعداد ۱۷ ہے۔ ان کے چند مضامین انگریزی روز نامہ انڈی پنڈینٹ، ڈیلی اسٹار اور بنگلہ دیش ابزرور میں بھی شائع ہوئے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "شام ڈھلے" کے عنوان سے ابھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے جس کی بڑی پذیرائی ہوئی ہے۔ اس میں ۱۱۲ افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ مزید مضامین، خاکے، انشائیے، افسانے اور تقریظیں ہیں۔ جن میں کچھ غیر مطبوعہ ہیں اور کچھ مطبوعہ ہیں انہیں کتابی صورت ابھی دی جانی باقی ہے۔ ترجمے کی صورت میں انکی دو نگارشات ہیں۔ انہوں نے سعادت حسن منٹو کے مشہور افسانے موذیل کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو کافی طویل ہے۔ ان نگارشات کے علاوہ ان سے چار کتابیں یادگار رہیں۔ "آئینۂ ادبِ اردو" جو درسی کتاب ہے اور شعبۂ اردو راجشاہی یونیورسٹی میں شاملِ نصاب بھی ہے۔ یہ ان کی پہلی تصنیف ہے۔ "شیخ مجیب الرحمن اور بنگلہ دیش کا قیام" انکی تالیف ہے جو بیرسٹر احمد کمال کی انگریزی کتاب کی تخلیص وترجمہ ہے۔ تیسری کتاب ان کی اپنی خود نوشت سوانح ہے یہ انگریزی میں ہے۔ چوتھی کتاب انگریزی میں ہے اور تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ یہ کتاب بنگالی نژاد اردو کے شیدائیوں اور اردو کے شعرا وادبا سے متعلق ہے جن کا خمیر اس مٹی سے اٹھا۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ ایک ناولٹ "غبارِ کارواں" کے نام سے بھی مکمل ہو چکا ہے جو زیر طبع ہے۔ ان

شام ڈھلے

"شام ڈھلے" لطیف احمد کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔اس میں ۱۲ افسانے شامل ہیں۔جو افسانے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔اگرچہ پروفیسر لطیف احمد کا اصل میدان افسانہ نویسی نہیں ہے۔بلکہ تحقیق اور تنقید ان کا اصلی میدان ہے۔چوں کہ بچپن ہی سے ان کو ناول اور افسانہ پڑھنے کا شوق تھا۔اسی وجہ سے ان میں افسانہ لکھنے کی دلچسپی پیدا ہوئی۔ان کا پہلا افسانہ یا انشائیہ "مہوے کے پھول" ہے جو انہوں نے خود انہی کے بقول اس وقت لکھا جب وہ نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے۔ان کا دوسرا افسانہ "کالی تتلی" ہے جو بھائی اور بہن کے مقدس رشتے کا آئینہ دار ہے۔یہ افسانہ عجیب سی تاثیر لیے ہوئے ہے۔بھائی اور بہن کے رشتے کی تقدیس اور محبت کو انہوں نے بڑے پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔یہ افسانہ بہت متاثر کرتا ہے۔افسانہ " کل چمن تھا آج صحرا ہوا" نشے کی لعنت، اس کہانی کا موضوع ہے۔یہ افسانہ بڑی کاٹ رکھتا ہے ۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جو مواد اخذ کیا ہے وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنی زندگی کے تجربوں سے حاصل کیا ہے۔

ڈاکٹر لطیف احمد کے افسانوں کی زبان کافی نرم، ملائم اور شریں ہے جو ایک خوبصورت اور اچھے افسانے کی خصوصیت ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں واقعہ نگاری، فطرت نگاری اور جذبات کی عکاسی بڑے موثر انداز میں کی ہے۔وہ الفاظ کا انتخاب بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ان کی تشبیہات اور استعارات میں بڑا حسن ہے اور محاوروں کا استعمال بھی برمحل ہوا ہے لیکن انہوں نے اپنے افسانوں میں کہیں بھی عریاں اور فحش الفاظ استعمال نہیں کیے۔ان کے افسانوں میں بڑی جاذبیت اور کشش ہے اور قارئین ایک عجیب سی فرحت اور تازگی محسوس کرتے ہیں۔یہ لطیف احمد کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔منظر کشی ہو کہ واقعہ نگاری یا جذبات کی عکاسی وہ بڑے قرینے سے کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر انہوں نے اپنے افسانے " کل چمن تھا آج صحرا ہوا" میں ایک جگہ فطرت کی عکاسی یوں کی ہے:

> "ہرے بھرے درختوں اور سرسبز میدانوں کے دامن میں یہ شہر، شہر اور دیہات کا بہترین امتزاج ہے اور قدرت کا ایک حسین شاہکار۔سورج افق کی چلمن کے عقب میں روپوش ہوتے ہوئے اب اپنی سنہری چادر سمیٹ رہا تھا اور شام کا بسیط سرمئی آنچل شہر کو اپنی وسعتوں میں چھپا لینے کو بیتاب ہو رہا تھا۔دن بھر کے تھکے ماندے پرندے اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے ان کی سریلی آواز جادو جگا

رہی تھی۔ پرندوں کی نغمہ سرائی سن کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی نغمہ گر اپنے دلگیر نغموں سے کا
نوں میں رس گھول رہا ہو"۷

"بنگلہ زبان میں نکلنے والے ایک جریدے "گلپوکار" نے برصغیر کے اردو افسانوں کا ایک انتخاب شائع کیا ہے اس انتخاب میں ان کا افسانہ "کل چمن تھا آج صحرا ہوا" شامل ہے۔۸

ڈاکٹر لطیف احمد کے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ادیب، شاعر اور صحافی احمد الیاس لکھتے ہیں:

"بنگلہ دیش میں اردو افسانوی ادب سے متعلق شہزاد منظر کی کتاب "اردو افسانوں کے پچاس سال" جو اگست ۱۹۹۷ میں شائع ہو چکی ہے اس کتاب کے بعد آئندہ جو کتاب لکھی جائے گی اس میں یقیناً ڈاکٹر لطیف احمد کا نام شامل ہوگا۔ ہر چند کہ لطیف احمد افسانوی ادب کی دنیا میں نو وارد ہیں یہ ان کا میدان نہیں وہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین اب تک لکھتے رہے ہیں یہ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو "شام ڈھلے" کے عنوان سے شائع ہونے جا رہا ہے ان کی زبان صاف و شفاف اور رواں ہے وہ با محاورہ اردو لکھتے ہیں وہ زبان کی باریکیوں کو سمجھنے اور برتنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ مجھے ان کے چند افسانوں کو پڑھنے کا موقع ملا ہے جن میں "مہوے کے پھول، کالی تتلی، کل چمن تھا آج صحرا ہوا اور سرحد وغیرہ شامل ہیں، جو خوب ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے قلم کی روانی یوں ہی برقرار رکھے۔۹

راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی پروفیسر شہناز یاسمین کہتی ہیں:

"افسانوں کی زبان نرم اور شیریں ہوتی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ وہ افسانہ نگار کامیاب ہوتے ہیں جو کہانی کے بنیادی تقاضوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان اور مکالموں کی تراش خراش کا خیال رکھتے ہیں۔ لطیف صاحب اس ضمن میں میرا خیال ہے کچھ زیادہ ہی محتاط اور حساس واقع ہوئے ہیں۔ فطرت نگاری ہو کہ واقعہ نگاری یا پھر جذبات کی عکاسی اور الفاظ کا انتخاب، لطیف صاحب بہت ہی سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ بقول ان کے انھوں نے جو بھی افسانے لکھے ہیں وہ سب کے سب شوقیہ لکھے ہیں۔ جو خوب ہیں۔ ان کا اولین افسانہ "مہوے کے پھول" ہے، لطیف صاحب کو اس پر ناز ہونا چاہئے کیوں کہ زبان و بیان کے ساتھ ساتھ انہوں نے تشبیہات و استعارات کو جس طرح برتا ہے اور جس طرح فطرت کشی کی ہے اسے پڑھ کر دل عش عش کر اٹھتا ہے اور بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔"۱۰

لطیف صاحب کے افسانے کالی تتلی کے متعلق الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی ریڈر شہناز صبیح لکھتی ہیں:

"لطیف احمد کا افسانہ کالی تتلی پسند آیا۔"[11]

شیخ مجیب الرحمان اور بنگلہ دیش کا قیام

"شیخ مجیب الرحمان اور بنگلہ دیش کا قیام" کے نام سے ان کی یہ کتاب دراصل بنگو بندھو شیخ مجیب الرحمان کی سیاسی زندگی کا ایک سوانحی خاکہ ہے جسے انہوں نے بیرسٹر قاضی احمد کمال کی تصنیف "شیخ مجیب الرحمان اینڈ برتھ آف بنگلہ دیش" کو انگریزی سے اردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔

خودنوشت سوانح (Trails and turmoil)

یہ ان کی خودنوشت سوانح ہے جسے انہوں نے انگریزی میں تحریر کیا ہے جو ان کی کشاکش بھری زندگی کا آئینہ ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اپنی زندگی کے اُن تمام حادثات و واقعات کو یکجا کیا ہے جو ان کے بچپن سے لے کر اب تک پیش آئے۔ انہیں جاننے کیلئے یہ کتاب بہت اہم ہے۔

The Bengali origin stalwarts of Urdu

بنگالی نژاد اردو کے شعرا و ادبا سے متعلق یہ کتاب ۲۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ضخیم تاریخی نوعیت کی نادر کتاب ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے کچھ ایسی ہستیوں کو قارئین سے متعارف کرانے کی سعی کی ہے جن کی شخصیت اور کار ناموں کے ذکر سے اب تک تاریخ ادب اردو کے صفحات خالی تھے۔

Urdu Journalism in Bengal(1901-1970):A Historical Study

مندرجہ بالا ڈاکٹر لطیف احمد کی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے کا عنوان ہے۔ انہوں نے راجشاہی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر معیز الاسلام اور شعبۂ انگریزی کی پروفیسر شہناز یاسمین کی رہنمائی میں اپنا مقالہ مکمل کر کے ۲۰۰۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ تحقیقی کارنامہ ۹ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کی ضخامت ۲۵۱ صفحات ہے۔ انہوں نے اس مقالے میں بنگال میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔

مضامینِ لطیف

لطیف احمد کا پہلا مجموعہ مضامین جسے انہوں نے "مضامینِ لطیف" کے نام سے مرتب کیا ہے جس میں ۲۵ اردو

مضامین شامل ہیں۔ ان کے مضامین میں مہوئے کے پھول، بنگلہ دیش میں اردو، فیض اپنی رومانی شاعری کے آئینہ میں، کلیم سہسرامی ایک دریا جو سمندر میں اتر گیا وغیرہ نہایت قابل ذکر ہیں۔

مقصود الٰہی شیخ مدیر مخزن لندن سے اپنے ایک دستی خط میں لطیف صاحب کو لکھتے ہیں:

۴ مئی ۲۰۱۰

محترمی ڈاکٹر لطیف احمد

کلکتہ کے ماہنامہ انشاء میں آپ کا وقیع مضمون "بنگلہ دیش میں اردو" پڑھا۔ آپ نے کوزے میں دریا کو بند کر دیا ہے یہ ایک وسیع و بسیط میدان تھا مگر آپ نے اختصار میں جامعیت پیدا کر دی۔ میں دل سے داد دوں گا۔

آپ کی صحت اور سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ وسلام۔

مقصود الٰہی شیخ، لندن [۱۲]

جناب لطیف احمد کا انشائیہ "مہوئے کے پھول" نے انشاء کو رنگ برنگ کا گلدستہ بنا دیا ہے خدا کرے اس کی مہک اور تازگی ہمیشہ برقرار رہے۔ [۱۳]

آکسفرڈ برطانیہ سے خالد یوسف کہتے ہیں، ''لطیف احمد کا مضمون "فیض اپنی رومانی شاعری کے آئینہ میں" فیض کے فن کا عمدہ تجزیہ ہے۔'' [۱۴]

مضامین میں دوسرے مضامین کے علاوہ لطیف احمد کا فیض پر مضمون بے مثال ہے۔ [۱۵]

پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد نے اپنے مقالے بعنوان بنگلہ دیش میں موجودہ اردو کا تخلیقی ماحول؛ اب چراغوں میں روشنی نہ رہی پڑھا اور اس المیے کا ذکر کیا کہ بنگلہ دیش میں نئی نسل اردو تہذیب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ ان کی تحریر سے یہ عندیہ بھی ملا کہ بنگلہ زبان کے شاعر جناب نذر الاسلام کی نظمیں وہاں اردو زبان میں ترجمہ ہوئیں اور راجشاہی یونیورسٹی میں اردو کی نشستیں مخصوص ہیں۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ (ماہ نامہ انشاء کلکتہ کے زیر اہتمام ہونے والے سمینار سہ روزہ سلور جبلی منعقدہ کلکتہ ۲۰۱۰، پانچواں اجلاس جس کی صدارت مشہور فلم ساز اور اور نغمہ نگار جناب گلزار نے کی) [۱۶]

ایک نجی ملاقات میں محترمہ مرحومہ پروفیسر ام سلمہ نے "مہوئے کے پھول" سے متعلق فرمایا لطیف صاحب نے نثر میں شاعری کی ہے۔ان کا اندازِ بیان دل موہ لینے والا ہے۔وہ اپنے اندازِ بیان سے ایسا جادو جگاتے ہیں جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے بیان نہیں۔[۱۷]

مشہور شاعر اور اعلیٰ ریلوے افیسر جناب رقیب اکبر کاظمی نے "مہوے کے پھول" انشائیہ سے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے کہا: لطیف صاحب نے اپنے انشائیہ میں جس طرح گلفشانی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے اس کی نظیر بہتر سے بہتر ادیبوں کے یہاں ملنا مشکل ہے۔[۱۸]

بحیثیت شاعر

لطیف صاحب کو نثر نگاری کے شانہ بہ شانہ شاعری سے بھی شغف رہا ہے مگر یہ شوق واجبی اور ضمنی سا ہے۔اگر وہ اس معاملے میں شروع ہی سے سنجیدہ اور مستقل مزاج ہوتے تو ہوسکتا ہے کہ اچھے شعرا میں آج ان کا شمار ہوتا۔ میری معلومات کا جہاں تک تعلق ہے انہوں نے اب تک کم از کم کچھ نہیں تو بیس نظمیں اور غزلیں کہی ہیں جو سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔شاعری کا تعلق تو جذبات کی فراوانی اور احساس میں شدت سے ہوتا ہے۔اب وہ عمر کے جس پڑاؤ پر ہیں جذبات واحساسات کا سرد پڑ جانا ہی فطری بات ہے۔نمونے کے طور پر ان کی ایک غزل کے چند اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

ترک الفت کا عزم کیا ہی تھا ابھی — کہ سمجھانے ہم کو دیر و حرم آگئے
تم بن نہ جینے کو کہتے تھے جانِ جاں — رونقِ بزمِ دنیا کی باتوں میں ہم آگئے
مانع تھی تمہاری رسوائی، دنیا کا خیال — تمہاری بزم سے بہت دور ہم آگئے
وہ لمحے گزریجو قربت میں تمہاری — ہم نے جانا تھا کہ جنت میں ہم آگئے
ضبطِ غم فراق کی مجبوریاں نہ پوچھ ہمدم — وہاں تک تو پہنچے یہاں تک تو ہم آگئے
بے چین ہوا وَافسردہ نظارو نہ ہو مضطر — چاند تاروں سے بھی کہدو ہم آگئے
غم اور خوشی کا احساس ہو نہ جہاں — یہی تو وہ مقام ہیجہاں پہ ہم آگئے

ڈھاکہ یونیورسٹی کی پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول جو لطیف صاحب کی مداحوں میں سے تھیں، انہوں نے ایک تقریب کے دوران ان کے طرز تحریر کے متعلق فرمایا:

"لطیف صاحب ہم سب پر سبقت لے گئے۔ ان کی تحریر میں پختگی کے ساتھ ہی ساتھ دریاؤں جیسی روانی اور سبزہ زاروں جیسی کشش ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ ان کے جیسی رنگین نثر لکھنے والا بنگلہ دیش میں اس وقت کوئی نہیں۔ بس ایک بات کھٹکتی ہے ان کی تحریر میں وہ یہ کہ ان کی تحریر میں افسانوی رنگ زیادہ شوخ اور غالب ہو جاتا ہے جس سے تصنع کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بہر حال ایک نقص ہے۔"۱۹

پروفیسر ڈاکٹر محمد شمیم خان، لطیف احمد کے انداز بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مصنف کے انداز بیان کا جہاں تک تعلق ہے، اس میں سادگی میں بھی پرکاری ہے۔ ان کا انداز بیان سادہ مگر متانت اور سنجیدگی سے بھرپور ہے۔ وہ لکھتے وقت جملوں کی تراش خراش اور الفاظ کا انتخاب کافی سوچ بچار کے بعد ہی کرتے ہیں۔ یہ ان کی بڑی خصوصیت ہے۔ وہ اپنی تحریر میں ایسی گرمی ایجاد و اعجاز پیدا کر دیتے ہیں کہ قاری اس تپش کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"۲۰

پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد ایک اچھے محقق اور ادیب ہیں۔ راقم ان کا شاگرد اور شریک کار تھا۔ اس لئے انہیں بہت قریب سے دیکھا اور پہچانا۔ میرا خیال ہے کہ لطیف احمد نہایت سنجیدہ اور متین انسان ہیں۔ ان کا مزاج بہت نرم ہے۔ وہ علمی اور تحقیقی کاموں میں اپنے شاگردوں کی ہمیشہ رہنمائی اور مدد کرتے ہیں۔ مختصر لفظوں میں ایک شریف انسان کے لئے جتنی خصوصیات ہونی چاہئے وہ سب لطیف صاحب میں پائی جاتی ہیں۔ بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے انہوں نے جو خدمات انجام دی ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا اور اسی کی بدولت ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ برقرار رہے گا۔ آخر میں میں اپنے استاد کے لئے دعا گو ہوں کہ وہ ہمیشہ صحت مند اور تندرست و توانا رہیں اور آئندہ بھی بنگلہ دیش میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔

حوالے:

۱۔ پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد آئینہ ادب اردو، راجشاہی: تہذیب سینٹر، ۲۰۱۶ء، ص۔ iv

۲۔ پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد، خودنوشت سوانح، راجشاہی: اسٹر پریس، ۲۰۲۰ء، ص۔ ۳۹

۳۔ آئینہ ادب اردو، ص۔ viii-vii

۴۔ مشہور شاعر حسنین راز سید پور سے لطیف احمد کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں۔

۵۔ معین ماسٹر، معلم اور مضمون نگار، سید پور سے لطیف احمد کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں۔

۶۔ آئینہ ادب اردو، ص۔ ۹۸

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر لطیف احمد، شام ڈھلے، راجشاہیو نیورسٹی، ۲۰۱۹ء، ص۔ ۱۶

۸۔ اوپو مہادیشیر اردو چھوٹو گلپو، مترجم ہیکل ہاشمی، ڈھاکہ: بنگلہ موٹر، ۲۰۲۰ء، ص۔۱۱۵

۹۔ شام ڈھلے، ص۔ iv- iii

۱۰۔ شام ڈھلے، ص۔ vi-v

۱۱۔ شہناز صبیح، ریڈر، الہ آباد یونیورسٹی، انشاء، جلد:۲۱، مارچ-اپریل ۲۰۰۶، ص۔۶۲

۱۲۔ مقصود الٰہی شیخ مدیر مخزن لندن سے لطیف احمد کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں۔

۱۳۔ اے۔امیر النساء، میل وشارم، تامل ناڈو۔انشاء، جلد:۲۰، جنوری-فروری ۲۰۰۵، ص۔۶۴

۱۴۔ خالد یوسف، انشاء، جلد:۲۱، نومبر-دسمبر ۲۰۰۶، ص۔۶۳

۱۵۔ درد چاپدانوی، انشاء، جلد:۲۱، نومبر-دسمبر ۲۰۰۶، ص۔۶۳

۱۶۔ مشہور فلم ساز اور اور نغمہ نگار جناب گلزار، انشاء، جلد:۲۶، جنوری-فروری ۲۰۱۱، ص۔۵

۱۷۔ پروفیسر ڈاکٹر ام سلمیٰ، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسٹی، نجی ملاقات۔

۱۸۔ رقیب اکبر کاظمی، مشہور شاعر، سید پور سے لطیف احمد کے نام ایک نجی خط میں لکھتے ہیں۔

۱۹۔ پروفیسر ڈاکٹر کنیز بتول، شعبہ اردو، ڈھاکہ یونیورسیٹی، نجی ملاقات۔

۲۰۔ آئینہ ادب اردو، ص۔v

مقالہ نگاروں کے لیے ہدایات

*''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو''، تحقیقی وتنقیدی مجلّہ ہے جس میں اردو زبان وادب کے غیر مطبوعہ مقالات طے کردہ ضوابط کے مطابق شائع کیے جاتے ہیں۔

*تمام مقالات اشاعت سے قبل Peer Review کے لیے مختلف ماہرین کو بھیجے جاتے ہیں جن کی منظوری کے بعد مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

☆ مقالہ ارسال کرتے ہوئے درج ذیل اصولوں کو ملحوظ کیا جائے جو کہ آج کی ترقی یافتہ علمی دنیا میں رائج ہیں۔Inpage 2000 میں کمپوز کر کے سفٹ کاپی ای میل کے ذریعہ ضرور بھیجے۔

*مقالے کے ساتھ انگریزی زبان میں اسکا خلاصہ (Abstract) (تقریباً ۱۰۰ الفاظ) اور عنوان شامل کیا جائے۔

*مقالے کے عنوان کا انگریزی ترجمہ، مقالہ نگار کے نام کے انگریزی ہجے اور موجودہ عہدہ نیز مکمل پتہ بھی درج کیا جائے۔

*''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' میں بالخصوص اردو زبان کے درج ذیل موضوعات پر مقالات شائع کیے جاتے ہیں۔ تحقیق: لسانیات، تدوین متن وتحقیق متن کے موضوعات، علمی وادبی مباحث، مطالعہ ادب، تخلیقی ادب کے تنقیدی وتجزیاتی مباحث اور مطالعہ کتب۔

*مقالہ میں استعمال ہونے والے تمام حوالہ جات وحواشی کی نمبری ترتیب ایک ہی ہوگی اور مقالہ کے آخر میں حوالہ جات وحواشی MLA طریقے سے دیئے جائیں گے۔

☆ مقالے کے آخر میں کتابیات شامل نہ کی جائیں۔

☆ مندرجات کی تمام تر ذمہ داری محققین پر ہوگی۔

☆ مقالات ''ڈھاکہ یونیورسٹی جرنل آف اردو'' کی ای میل du.urdujournal@gmail.com پر بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔

লেখা পাঠানোর নিয়মাবলী

'ঢাকা ইউনিভার্সিটি জার্নাল অফ উর্দু' ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়ের সিন্ডিকেট অনুমোদিত একটি গবেষণা পত্রিকা। এতে দেশ বিদেশের অধ্যাপক ও গবেষকবৃন্দের বিভিন্ন বিষয়ে উর্দু ভাষায় রচিত মৌলিক গবেষণা-প্রবন্ধ প্রকাশিত হয়।

পত্রিকায় লেখা পাঠানো বা জমা দেয়ার কিছু নিয়ম:

১.পাণ্ডুলিপি উর্দু Inpage সফ্টওয়্যারে কম্পিউটার কম্পোজ করে পেন ড্রাইভে বা ইমেলে সফ্ট কপি জমা দিতে হবে।

২. প্রবন্ধে লেখকের নাম, পেশাগত পরিচয় ও ঠিকানা আলাদা কাগজে থাকবে। লেখক কোন কলেজ/ মাদরাসা/ বিশ্ববিদ্যালয়ের শিক্ষক অথবা কোন গবেষণা প্রতিষ্ঠানের অধীনে গবেষণায় নিয়োজিত গবেষক হবেন। বিভাগীয় ছাত্র-ছাত্রীদের ক্ষেত্রে এ শর্ত শিথিলযোগ্য।

৩. প্রত্যেক প্রবন্ধের সাথে লেখককে এ মর্মে একটি প্রত্যয়নপত্র জমা দিতে হবে যে- জমাকৃত প্রবন্ধের লেখক তিনি নিজেই। এটি একটি মৌলিক গবেষণা প্রবন্ধ। প্রবন্ধটি ইতোপূর্বে অন্য কোন পত্রিকায় মুদ্রিত হয়নি কিংবা প্রকাশের জন্য অন্য কোন জার্নালে জমা দেয়া হয়নি। এ প্রবন্ধ বিষয়ক সকল দায়িত্ব লেখক বহন করবেন।

৪. প্রকাশের জন্য মনোনীত কিংবা অমনোনীত কোন পাণ্ডুলিপি ফেরত দেয়া হবে না। প্রবন্ধ প্রকাশিত হলে লেখক জার্নালের ৩ কপি সৌজন্য হিসেবে পাবেন।

৫. উদ্ধৃতির ক্ষেত্রে মূল বানানের পরিবর্তন হবে না। লেখক কোন বিশেষ বানান-বৈশিষ্ট্য রক্ষায় আগ্রহী হলে তা অক্ষুন্ন রাখা হবে।

৬. গবেষণা প্রবন্ধ লেখার সকল নিয়ম মেনে লেখা তৈরী করতে হবে।

৭. প্রবন্ধ শেষে টীকা ও তথ্যসূত্র ব্যবহার করতে হবে।

৮. প্রবন্ধের বিষয়বস্তুতে দ্বৈত লেখকের প্রয়োজন না হলে একই প্রবন্ধে দ্বৈত লেখক গ্রহণযোগ্য নয়।

লেখা পাঠানোর ঠিকানা:

সম্পাদক

ঢাকা ইউনির্ভাসিটি জার্নাল অফ উর্দু

উর্দু বিভাগ, ঢাকা বিশ্ববিদ্যালয়

du.urdujournal@gmail.com

অথবা বিশেষ প্রয়োজনে নীচের ইমেলেও পাঠানো যেতে পারে।

grabbanidu@gmail.com

17. A Brief Overview of the Llife and Urdu Literary Works of Dr. Muhammad Abdullah
Professor Dr. Muhammad Shahidul Islam **248**
Department of Urdu, Rajshahi University, Bangladesh

18. Topics and Issues of New Urdu Criticism
Safdar Imam Qadri **260**
HoD, Urdu, College of Commerce, Arts and Science, Patna, India

19. West Bengal's Urdu Fiction and Contemporary Issues in 21st Century
Dr. Sufia Shireen **271**
Assistant Professor (SACT), Surendra Nath Evening College, Kolkata, India

20. Urdu in Bangladesh (In the Mirror of Past and Present)
Dr. Shaikh Aquil Ahmad **282**
Director, National Council for Promotion of Urdu Language, Ministry of Education, New Delhi, India

21. Arman Shamsi and his Urdu Short Stories
Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani **290**
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

22. Contribution of Javed Hussain on Translating Bangla from Urdu and Persian
Md Golam Mawla **314**
Assistant Professor,Department of Urdu, Dhaka University, Bangladesh

23. Resounding of Urdu in the Islamic World
Prof. Dr. Latif Ahmad **325**
Department of Urdu, Rajshahi University, Bangladesh

24. Dhaka: A Center of Urdu
Professor Dr. Md. Mahmudul Islam **343**
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

25. Latif Ahmed: A Dotty of Urdu Literature in Bangladesh
Professor Dr. Md. Nasir Uddin **349**
Chairman,Department of Urdu, Rajshahi University, Bangladesh

9. Jalal Azimabadi: A Contributor to Urdu Literature in Bangladesh
Hafsa Akter 118
Assistant Professor, Dept of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

10. Shah Hakim Muhammad Akhtar and his Reformative Poetry
Dr. Rashid Ahmad 133
Associate Professor and Chairman, Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

11. Contribution of Dr. Kulsoom Abul Bashar on Urdu
Dr. Md Razaul Karim 146
Associate Professor, Dept of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

12. Selected Autobiographies of Urdu Literature in 21st Century: An Analytical Study
Sarah Batol 155
PhD Research Scholar, Department of Urdu, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, India

13. Urdu in Germany
Sarwar Gazali 170
Lecturer, Department of Asian and African Studies, Humboldt University, Berlin, Germany

14. Urdu Literary Activities in Saidpur and Some Eminent Writers
Dr. Md. Shamiul Islam 179
Associate Professor, Dept. of Urdu, University of Rajshahi, Bangladesh

15. The Role of Bollywood in the Promotion of Urdu Language and Literature (Special Quotes from Lyricist)
Professor Shamim Banoo 203
Institute of Modern Languages, Dhaka University, Bangladesh

16. Indian Urdu Novels in 21st Century : A Critical Study
Dr. Shahab Zafar Azmi 225
Associate Professor & Chairman, Department of Urdu, Patna University, Bihar, India

Contants

1. Critical Analysis of the Novels of 21st Century's Women Novelists
Asiya Yasmin 07
Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, India

2. Urdu Writers of Bangladesh in 21st century
Professor Dr. Md Israfil 25
Department of Urdu, Dhaka University, Bangladesh

3. Urdu Short Stories in Modern World
Professor Dr Aslam Jamshedpuri 35
Head of the Department of Urdu, Chaudhary Charan Singh University, Meerut, India

4. Some Urdu Poet of Bangladesh in 21st Century
Husynul Banna 59
Assistant Professor, Dept. of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

5. Thematic Diversity of Urdu Novels in 21st Century : A Study
Tabasum Hassan 71
PhD Research Scholar, Department of Urdu, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, India

6. New Dimension of Urdu Criticism in 21st Century
Dr. Taslim Arif 81
Assistant Professor, Department of Urdu, GLA College, Medini Nagar, Palamu, Jharkhand, India

7. Current Situation of Urdu Literature in the State of Jammu and Kashmir (Concentration on Urdu Poetry)
Towseef Ahmad Dar 89
Research Scholar, Department of Urdu, University of Kashmir, India

8. Professor Dr. Kaniz e Batool : Life and Works
Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuiyan 108
Department of Urdu, University of Dhaka, Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Year : 2014 **Volume : 7**

Date of Publication : September 2020

Editor
Professor Dr. Md. Mahmudul Islam

Associate Editor
Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani

Editorial Board
Dean, Faculty of Arts, University of Dhaka
Professor Dr. Zafar Ahmed Bhuiyan
Professor Dr. Md Israfil
Professor Dr. Mohammad Abdur Rashid
Professor Shamim Banoo

Department of Urdu
University of Dhaka
Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Year : 2014 **Volume : 7**

Published by : The Registrar
University of Dhaka
Dhaka-1000

Printed by : Boishakhi Creation
86, Purana Paltan, Dhaka

Price : Tk - 100/= (One Dollar)

Year of Publication : September 2020

Correspondence Address : **Editor**
Dhaka University Journal of Urdu
Department of Urdu
University of Dhaka
Dhaka- 1000

E-mail : du.urdujournal@gmail.com

Dhaka University Journal of Urdu

Year : 2014 Volume : 7

Year of Publication : September 2020

Editor
Professor Dr. Md. Mahmudul Islam

Associate Editor
Professor Dr. Mohammad Golam Rabbani

Department of Urdu
University of Dhaka
Bangladesh

Dhaka University Journal of Urdu

Year: 2014 Volume: 7

Special Issue

Urdu Literature in 21st Century

Department of Urdu
University of Dhaka ■ Bangladesh